اُردو شیرازہ

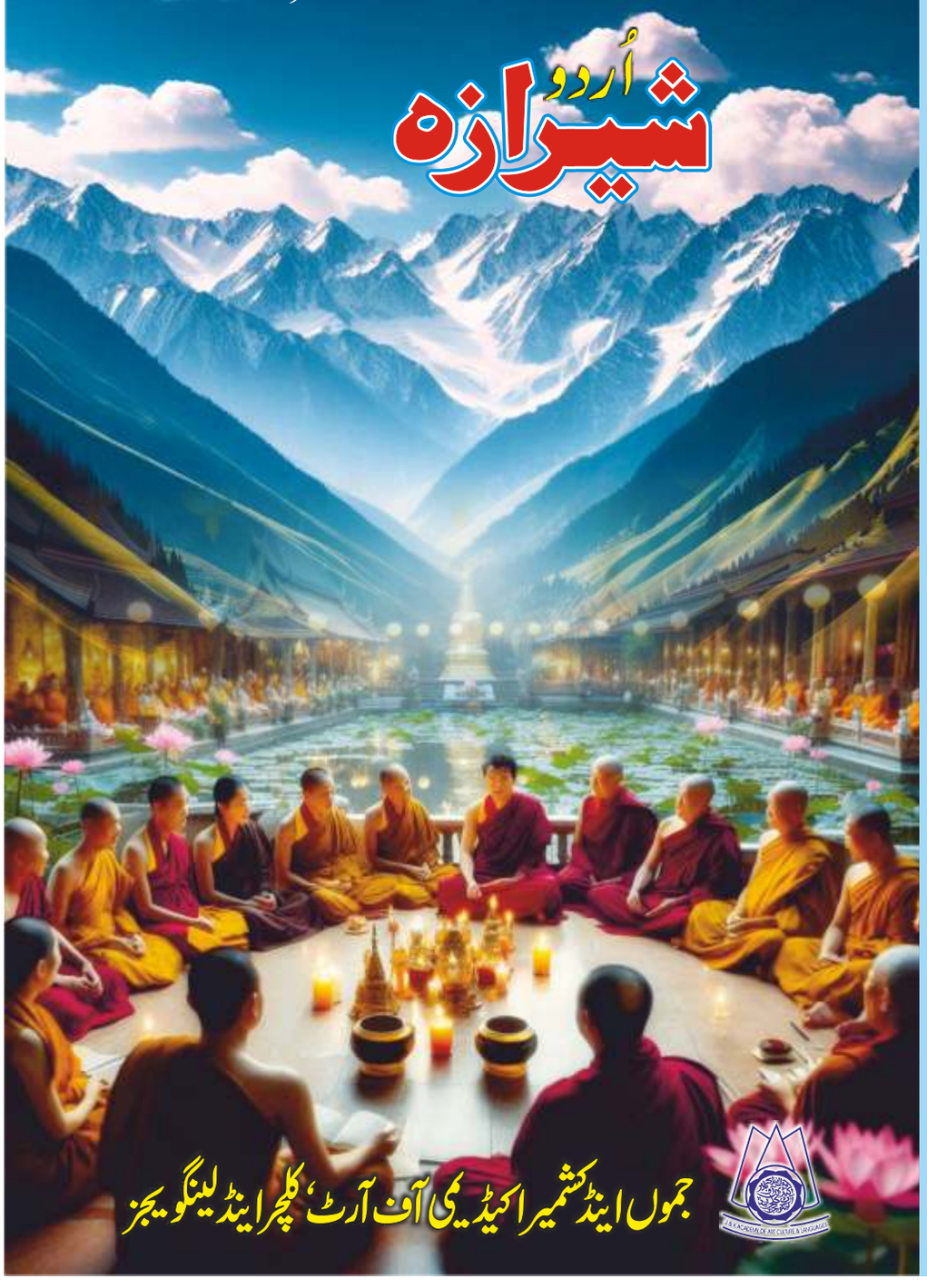

خصوصی مطالعہ کشمیر میں چوتھی عالمی بودھ کونسل

Volume: 62
Number: 11- 12 (November-December 2024)

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نگراں : ہروندر کور (جے کے اے ایس)

مدیر : محمد سلیم سالکؔ

معاون مدیر : سلیم ساغرؔ

معاون : ڈاکٹر محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق:.....امتیاز احمد شرقی
سال اشاعت: جلد؛62، شمارہ:12-11 (نومبر / دسمبر 2024)
ISSN نمبر:2277-9833
قیمت: 100 روپئے

'شیرازہ' میں جو مواد شامل کیا جاتا ہے اُس میں ظاہر کی گئی آرا سے
اکیڈمی کا کُلّاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

● ..... خط و کتابت کا پتہ:
مدیر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر / جموں
ای میل: sherazaurdu@gmail.com

فہرست

❁ گفتگو بند نہ ہو!	محمد سلیم سالکؔ	05
● تاریخ و تمدن		
❁ بدھ مت کے عظیم الشان اجلاس	پروفیسر جینا نندا مترجم: ارشد حسین	09
❁ کشمیر میں چوتھی عالمی بودھ کونسل	پروفیسر ٹوکن۔ڈی۔سمی مترجم: گلزار جعفر	40
❁ کنڈل وَن کہاں ہے؟	محمد یوسف ٹینگ	48
❁ شاردا: بدھ ازم کی یادگار ہ آماجگاہ	پروفیسر جہانگیر دانش	55
● سفرنامہ		
❁ سفرنامۂ چین	مرزا عارفؔ بیگ مترجم: سید مبشر رفاعی (بازیافت)	66
● ادبی مذاکرہ		
اردو افسانہ: کل، آج اور کل شرکائے بحث: ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وزیر آغا، جوگندر پال، سہیل عظیم آبادی، رتن سنگھ، شکیلہ اختر، کلام حیدری، رشید امجد، بلراج کومل، کوثر چاند پوری، ظفر اوگانوی، ہرچرن چاولہ، خموش سرحدی، مظفر حنفی، مسیح الحسن رضوی، اکرام جاوید، عطیہ نشاط، ہربنس لال ساہنی، امیر اللہ شاہین		73

● **منتخب افسانے**

❁ انجام کار — سلام بن رزاق — 123

❁ لکڑ بھگا چپ ہو گیا — سید محمد اشرف — 145

❁ آواز کی کہانی — نور شاہ — 155

❁ 19 مارچ 2350 — نور الحسنین — 158

❁ آدھے ادھورے — نعیمہ جعفر پاشا — 167

❁ تحفوں کی تھیلی — صادقہ نواب سحر — 172

● **تجزیات و تعبیرات** (منتخب افسانے) — ڈاکٹر ریاض توحیدی — 183

● **ناولٹ**

پوش وَن کی کہانی — راجہ یوسف — 192

●●●

گفتگو بند نہ ہو!

دنیا میں بدھ مت کی علمی وفلسفیانہ بنیادوں کو مستحکم کرنے میں ''چوتھی بودھ کونسل''بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ یہ کونسل کشمیر میں، کشان سلطنت کے ایک عظیم حکمران کنشک (جن کی قلمرو گاندھارا، سندھ، شمالی جنوبی ہندوستان، سنٹرل ایشیا اور کشمیر کے حدود اربعہ تک پھیلی ہوئی تھی) کے دور میں پہلی صدی عیسوی کی ساتویں دہائی میں منعقد ہوئی ۔ کنشک کے بارے میں یہ بھی باور کیا جاتا ہے کہ ان کے آباو اجداد ایرانی مذہب کے پروکار تھے لیکن جب کنشک نے بودھ مت اختیار کیا تو وہ مہاتما بدھ کی شخصیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے بودھ مت کی ترویج میں ایک کلیدی رول ادا کرتے ہوئے باقاعدہ ''چوتھی بودھ کونسل'' کا اہتمام کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا، جسے تاریخ نے سنہرے حروف میں رقم کیا ہے۔اس کونسل کا مقصد بدھ مت کے اصول ومعتقدات کی تجدید، مذہبی متون کی تدوین اور اس کے پیغام کو مزید مؤثر انداز میں پھیلانے کے لئے حکمتِ عملی وضع کرنا تھا۔

بدھ مت کی تاریخ کے مطابق، ابتدائی تین کونسلوں کا مقصد مہاتما بدھ کی اصل تعلیمات کو محفوظ رکھنا اور ان تعلیمات کو کسی بھی ممکنہ تحریف سے بچانا تھا، تاہم چوتھی بدھ کونسل نے نہ صرف ان تعلیمات کی مزید توضیح وتشریح کی بلکہ فلسفیانہ ونظریاتی ترقی کو بھی ممکن بنایا۔ اس دوران کئی نئے نکات اور تشریحات کو شامل کیا گیا، جنہوں نے بدھ مت کے فلسفے کو مزید گہرائی اور وسعت دی۔

چوتھی بدھ کونسل کا سب سے بڑا کارنامہ "تری پٹکا" یعنی بدھ مت کے

بنیادی مذہبی صحیفوں کی تدوین وترتیب تھا۔ یہ سوال بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ کونسل کی کارروائی کس زبان میں محفوظ کی گئی ہے۔عمومی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ''تری پٹکا'' کی تدوین سنسکرت زبان میں کی گئی ہے تو ممکن ہے کہ کونسل کی کاروائی بھی سنسکرت زبان میں ہی کی گئی ہو۔

اگر ہم تاریخی تناظر میں چوتھی بدھ کونسل کا جائزہ لیں تو یہ ایک ایسا اجتماع تھا جس نے بدھ مت کی فکری بنیادوں کو مستحکم کیا اور اس کی تعلیمات کو زیادہ منظّم اور مربوط انداز میں مرتب کرنے کی راہ ہموار کی۔ یہ کونسل نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا میں بدھ مت کی ترویج و اشاعت کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔اس تاریخی موقع پر سینکڑوں بدھ راہب اور عالم شریک ہوئے، جنہوں نے بدھ مت کی تعلیمات کو مرتب و مدون کرنے کا بیڑا اٹھایا۔اسی کونسل کے نتیجے میں مہایان بدھ مت کے نظریات کو زیادہ وضاحت اور جامعیت ملی، جس کی روشنی میں بدھ مت نے بعد میں چین، تبت، جاپان اور کوریا جیسے ممالک میں نمایاں طور پر فروغ پایا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان کونسل کشمیر میں کہاں منعقد ہوئی ہے؟ اس بارے میں وثوق کے ساتھ کسی نے تحریر نہیں کیا ہے لیکن کچھ تاریخی حوالوں کے مطابق مذکورہ اجلاس جالندھر پنجاب میں منعقد ہوا ہے جبکہ بعض حقائق کے توسط سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ''چوتھی بودھ کونسل'' کشمیر میں منعقد ہوئی ہے لیکن ابھی تک جگہ کا صحیح تعین نہیں ہوسکا ہے۔

نامور تبّتی مورخ تاراناتھ (پ:1575ء،م:1634) نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''The History of Buddhism in India'' میں ''چوتھی بودھ کونسل'' کے بارے میں جگہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ یہ کونسل کشمیر میں ''کنڈل وَن'' میں منعقد ہوئی ہے لیکن انہوں نے بھی ''کنڈل وَن'' کی

جائے وقوع کی نشان دہی کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے ۔اس طرح ''کنڈل وَن'' آج تک ایک پُراسرار جگہ کی مانند ہماری آنکھوں سے اوجھل ہی رہا ہے۔

معروف چینی سیاح ہیون سانگ نے مہاراجہ کنشک کے قریباً پانچ صدی کے بعد کشمیر کا سفر 631ء کے آس پاس کیا ہے۔انہوں نے برسبیل تذکرہ ''چوتھی بدھ کونسل'' کے بارے میں اشارہ کیا ہے:

> ''راجہ کنشک کے حکم کے تحت کونسل کی پوری عالمانہ کارروائی تامر پتروں پر کُندہ کرائی گئی۔پھر ایک پتھر کے ساتھ مہر بند کرا کے اُنہیں ایک ستوپا کے وسط میں محفوظ کر کے اُس ستوپا کو کھڑا کیا گیا۔پھر اُس کے تحفظ اور نگرانی کا بہترین بندوبست کیا گیا تا کہ یہ تاریخی تحفہ دشمن کی نگاہ اور رسائی سے محفوظ رہے۔''

مہاتما بدھ کا 2500واں سالِ وفات پوری دنیا میں بڑی شان سے منایا گیا اور اس موقع پر پروفیسر پی ۔وائی۔باپت کی مرتب کردہ ضخیم کتاب '' 2500 Years of Buddhism'' منظر عام پر آئی ۔اس کتاب میں بدھ مت کی 2500 سالہ تاریخ، اس کے نظریات، تعلیمات اور ارتقا کا جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ساتھ ہی کتاب میں بدھ مت کے آغاز، ابتدائی کونسلوں، مختلف مکاتبِ فکر اور اس کی ہندوستان اور دیگر ایشیائی ممالک میں ترویج کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مزید برآں کتاب میں شامل پروفیسر جینا نندا کا مضمون ''بدھ مت کے عظیم الشان چار کونسل'' بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔موضوع کی مناسبت سے ہم نے اس کا اردو ترجمہ کروایا تا کہ عالمی اہمیت کے تناظر میں منعقد کئے گئے نہایت اہم کونسل کا سیاق وسباق ہماری نظروں کے سامنے رہے۔تلاش بسیار کے بعد پروفیسر ٹوکن ۔ڈی۔سمی کا مضمون ''کشمیر میں چوتھی عالمی بودھ کونسل'' ہاتھ لگا۔پروفیسر ٹوکن ۔ڈی۔سمی، چاپان

کی آچیکیو یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں ۔موصوف جاپان میں کشمیرولوجی کے واحد اسکالر ہیں جنہیں کشمیر کی قدیم تاریخ وتمدن پر گہری دسترس ہے۔ پروفیسر موصوف نے کلہن کی راج ترنگی کا جاپانی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

قریباً ایک دہائی قبل جب اکادمی نے محمد یوسف ٹینگ نمبر ترتیب دیا تو اس نمبر میں خاص سوغات کے طور پر ٹینگ صاحب نے ایک مضمون ''کنڈل وَن'' کے بارے میں تحریر کیا تھا، موقع کی مناسبت سے ہم نے وہ مضمون قندِ مکرر کے طور شاملِ اشاعت کرلیا تا کہ ''چوتھی بدھ کونسل'' کے بارے میں ایک سنجیدہ مکالمہ قائم کیا جاسکے۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا لازمی ہے کہ جب تک کسی مخصوص جگہ پر باقاعدہ Excavation نہیں ہوگی اور تانبے کے پلیٹس برآمد نہیں ہوں گے تب تک یہ معاملہ پُراسرار بنا رہے گا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرینِ آثار قدیمہ اور مورخین کے باہمی اشتراک سے اس سنجیدہ موضوع کو زیر بحث لایا جائے تا کہ چوتھی بدھ کونسل کی عظیم باقیات کو بازیافت کر کے محفوظ کیا جاسکے۔

مزید برآں شیرازہ کے باقی مشمولات میں حسبِ سابق سفرنامہ، مذاکرہ، افسانے اور ناولٹ وغیرہ شامل ہیں ۔امید کرتے ہیں کہ قارئین ہماری کوششوں کو سراہیں گے اور اپنے تاثرات سے بھی نوازیں گے۔

مدیر شیرازہ
محمد سلیم سالکؔ

پروفیسر جینا نندا
مترجم: ارشد حسین

بُدھ مت کے عظیم الشان اجلاس

پہلا اجلاس:

بُدھ مت کے مذہبی و غیر مذہبی ادب میں درج روایات کے مطابق بودھ عقیدے اور صحیفوں کو اپنے اصلی و غیر مخلوط شکل میں مدّون کرنے کے لئے چار اجلاس منعقد کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا اجلاس گوتم بُدھ کے پری نروانا کے فوراً بعد راجا گرہا نامی جگہ پر منعقد ہوا ہے۔ محققین اور اہل علم و فضل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بُدھ مت کے اس پہلے اجلاس میں دہما اور ونایا سے متعلق معاملات طے پائے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پایا جاتا ہے کہ آیا ابھیدما کو اس اجلاس کے دوران بُدھ مت کے مذہبی قانون وضابطے میں شامل کیا گیا ہے یا نہیں، البتہ کہا یہ جاتا ہے کہ اپنی نوعیت کے اس پہلے اجلاس کا انعقاد مہا کاسسپا کی صدارت میں ہوا ہے جس میں اُوپالی اور آنندا نے اہم کردار نبھایا ہے۔ اجلاس میں شریک بُدھ مت کے اہل علم و فضل کے درمیان بودھ عقیدے کے حوالے سے کوئی اختلاف اور ناچاکی نہیں رہی ہے۔ البتہ اجلاس کے دوران جس چیز کی طرف زیادہ زور اور توجہ کی گئی ہے وہ خالص بودھ تعلیمات کی تئیں بدیارتھیوں کا تعلق، وفاداری، عمل اور عزم کا جائزہ اور اسے مستحکم کرنے اور تقویت بخشنے کی طرف رہا تاکہ یہی بے لوث کردار اور سعی بُدھ مت کے تحفظ کا ذریعہ بن جائے۔ اس پر مستزاد اس کی وساطت سے مہاتما کی

تعلیمات کو صحیح سلامت آگے بڑھانے کے لئے طریقہ کار اور منصوبوں کی طرف خصوصی توجہ کی گئی۔

بُدھ مت کے پہلے اور دوسری اجلاس سے متعلق مذہبی دستاویز کلاواگا کے گیارہویں خاندہا کا میں محفوظ روایات کو بودھ مذہب کے علمی وادبی پاروں جیسے دیپاوامسا اور مہاوامسا میں مستند ومعتبر قرار دیا گیا ہے۔کلاواگا کے اندر اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ گوتم بُدھ کے ایک مقتدر بدیارتھی مہا کاسا پا مہاتما کے مہاپری نروانا کے موقع پر کوسنا گارا کے مقام پر حاضر نہیں ہو سکے تھے۔جوں ہی وہ ایک جاہ وحشم وفد کے ہمراہ پاوا سے کوسنا گارا کی طرف رخت سفر باندھ رہے تھے، اسی اثناء میں اس کے پاس اجی وکا پنتھ سے تعلق رکھنے والے ایک ننگ جوگی نے اپنے مُرشد گوتم بُدھ کے موت کی خبر پہنچائی۔ یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ سوبہادا نے اپنے مُرشد کے ماتم میں گریہ زاری اور نوحہ کرنے والے جوگیوں کو اصرار کیا کہ وہ سوگ وواویلا کرنے سے گریز کریں اور اس کے بجائے موقعہ کو نیک شگوں اور خلاصی و بریت تصور کریں۔ چونکہ مہاتما کی حیات کے دوران ان کے ساتھ نازیبا اور اسکولی بچوں جیسے سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور معمولی خطاوں پر سرزنش کی جاتی تھی۔اب انہیں اس سب سے خلاصی ملے گی اور وہ اب آزادانہ طور جو جی میں آئے بے دھڑک انجام دے سکتے ہیں۔اس غیر مناسب رائے زنی نے آدرجوگ مہا کاسا پا کے اندر گوتم بُدھ کی تعلیمات کے مستقبل میں تحفظ اور نرملتا کے حوالہ سے تشویش کی لہر دوڑائی۔ مہاوامسا کے مطابق مہا کاسا پا کی تشویش کے دوسرے بھی کئی وجوہات رہے ہیں۔ اس نے اپنے مرشد کا پہناوا بطور علامت اختیار بحق برابر تسلیم کیا اور عزم صمیم کے ساتھ حق وصداقت قائم کرنے کے لئے مہاتما کے احکامات، سکھائی گئی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی ٹھان لی۔سوبہادا کی رائی زنی عیاں راچہ بیان کے مصداق اجلاس کے

انعقاد کی ضرورت واہمیت کا آئینہ دار تھی تا کہ اس عظیم مقاصد کی تکمیل کی جائے۔

اس حوالہ سے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ سو بہادا ہی صرف وہ اکیلا شخص نہیں تھا جو ایسے خیالات کا حامل تھا وہاں دوسرے کئی ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جن کا ماننا تھا کہ مہاتما کے انتقال سے اُس کی پیش کی گئی تعلیمات، احکامات اور دھرما کو خطرہ لاحق ہے۔ تبّتی دیلوا اور یوآن چوانگ میں بھی ایسی تفصیل درج ہے جس کے مطابق خواص کے ساتھ ساتھ عوام کے اندر تشکیک واضطراب کے تاثرات پائے جانا ہی پہلے بودھ اجلاس کے انعقاد کا محرک رہا ہے۔

باہمی صلاح مشورہ کے بعد راجا گرہ نامی قصبہ کو اجلاس کے انعقاد کے لئے منتخب کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کونسل کا اجلاس سپتا پرنی گپھا کے قرب وجوار میں منعقد کیا گیا۔ اگر چہ تبّتی دیلوا کے مطابق کونسل کا اجلاس نیا گرودہانامی گپھا پر طے ہوا تھا۔ اس حوالہ سے کولا واگا میں درج تفصیل کی اعتباریت پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا۔ چونکہ اسی تفصیل کی کم وبیش باقی ماندہ تمام تاریخی ماخذوں نے اتباع کی ہے۔ لوکوتاراوادا کی تفصیل کے مطابق کونسل کا اجلاس وبہارانامی پہاڑی کے شمال میں منعقد کیا گیا ہے جب کہ اسواگوسا کی تفصیل میں گردھرا کوٹا پہاڑ کے اندر پائی جانے والی اسالا گپھا کا تذکرہ آیا ہے۔ پالی بودھ مذہبی تاریخ کے مطابق سپتا پرنی گپھا وبہارانامی پہاڑ کے قرب و جوار میں واقع ہے اور راجا اجاتا شترو کے حکم پر اس گپھا کے باہر کونسل کے اجلاس کے انعقاد کے لئے ایک پنڈال کھڑا کیا گیا تھا۔ مذکورہ گپھا کے اصل جائے وقوع کی تاہم ابھی تک ثقہ نشاندہی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بُدھ مت کا پہلا اجلاس راجا گرہا کے مقام پر منعقد ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ کا انتخاب اس لئے ہوا تھا چونکہ وسیع وعریض ہونے کے ساتھ وہاں طلب ورسد کی سپلائی آسانی سے ممکن تھی۔ تبّتی دیلوا کے مطابق راجا گرہا کے مقام پر اجلاس کے انعقاد

کا فیصلہ اس لئے ہوا تھا کیونکہ راجا اجاتاشترو بُدھ مت کا عقیدت مند ہونے کے ساتھ ساتھ سخت پیروکار بھی تھا اور اجلاس کے انتظامات اور اس میں شامل بودھ پیروکاروں کے قیام وطعام کی سہولیات بہم پہنچانا اپنے لئے اعزاز سمجھتا تھا۔ مہاوامسا اور سامنتا پاسادیکا کی تفاصیل بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔

بُدھ مت کے کونسل کا پہلا اجلاس برساتی موسم کے دوسرے مہینے میں منعقد ہوا ہے۔ سامنتا پاسادیکا نامی بودھ مذہب سے متعلق تاریخی دستاویز میں اجلاس کی اصل تاریخ سے چھ ہفتے پہلے منعقد کی گئی تقریبات سے متعلق ایک مفصل تذکرہ ملتا ہے۔ فطری مبالغہ آرائی اپنی جگہ، لیکن یہ بات قابل تذکرہ ہے کہ بُدھ مت کے پہلے اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ مہا کاسا پا کے سر جاتا ہے اور اس ضمن میں کونسل کو تشکیل دینے کے لئے موصوف نے ہی چار سو ننانوے بودھ جوگیوں کا انتخاب عمل میں لایا ہے۔ بودھ مذہب کی تاریخ سے متعلق کولاواگا نامی دستاویز میں اس بات کا تذکرہ آیا ہے جس کی تصدیق دپاوامسا نامی دستاویز میں بھی آئی ہے کہ بودھ جوگیوں کی تعداد کا انتخاب جوگیوں کے اجتماع عام کے موقعہ پر، جو اس غرض کے لئے جمع ہوئے تھے، ملے منڈیٹ کی تعمیل میں اور مہاتما کے پری نبانا کی جگہ پر کیا گیا ہے۔ اس بات پر عام اتفاق پایا جاتا ہے کہ منتخب کئے گئے جوگیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ البتہ مورخ یوان چوانگ نے منتخب جوگیوں کی تعداد ایک ہزار بتایا ہے۔ اس میں کچھ حد تک واجب الرعایت مبالغہ آرائی کی آمیزش لگتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اجلاس کی تاریخ اور مورخ یوان چوانگ کے زمانے میں ایک طویل زمانہ گزرا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے منتخب بودھ جوگیوں میں انندا شامل نہیں تھے اور بتایا جاتا ہے کہ انندا کو اجلاس کے لئے منتخب ارکان میں شامل نہ کرنے پر ناراضگی اور احتجاج کی آواز بلند کی گئی۔ کولاواگا میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بودھ جوگیوں نے

انندا کو منتخب ارکان میں شامل کرنے کی زوردار وکالت کی چہ جائیکہ انندا کو نروانا ابھی حاصل نہیں ہوا تھا لیکن جس اعلیٰ اخلاقی معیار پر وہ پہنچا تھا اور اس پر مستزاد انندا نے دھرما اور ونایا کی تعلیم وتربیت ازخود براہ راست مہاتما بدھ سے حاصل کی تھی۔ نتیجتاً جوگیوں کی پُرزور وکالت اور ذاتی اہلیت وصلاحیت کی بنیاد پر انندا کی رکنیت کو مہا کاسپا نے تسلیم کرلی۔ البتہ جس طریقہ کار اور طرز عمل کے ذریعہ انندا کو کونسل کے ارکان میں شامل کیا گیا اس نے ایک تنازعہ کی شکل اختیار کی۔ بعد میں یہ دیکھا گیا کہ انندا کو بودھ قانون کے مطابق عدالتی کاروائی کا سامنا کرنا پڑا۔ مورخ تبتی دیلوا کے مطابق انندا کے خلاف عدالتی کاروائی کونسل کے اجلاس سے پہلے عمل میں لائی گئی۔ اس حوالہ سے بُدھ مت کے پہلے اور دوسرے اجلاس سے متعلق تاریخی دستاویز کولاواگا کی تفصیل کے مطابق انندا کے خلاف قانونی کاروائی ماہیسا ساکا اور مہاسانگھی کاس کے ونایاس کے بعد عمل میں لائی گئی اور اسے دھرما اور ونایا کے اُچارن کے بعد کئی الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس ضمن میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انندا دپاوامسا، مہاوامسا، سامانتاپاسادیکا اور مہاواستو میں ناکامیاب رہے ہیں۔

اجلاس کی کاروائی کی تفصیل :

اجلاس کی کاروائی سنگھا کی اجازت سے عام فہم اور سیدھے سادھے انداز میں انجام دی گئی۔ آدرجوگ مہاکاسپا نے آدرجوگ اوپالی کے ونایا کے بارے میں استفسارات کئے۔ تمام استفسارات چار پاراجکاس سے متعلق تھے۔ معاملہ، واقعہ، ذاتی تعلق اور بنیادی اصول، ترمیم شدہ اصول اور اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال کہ ان پاراجکاس کا مجرم اور معصوم کون ہوگا۔ اس طریقے سے اجلاس میں ونایا کے نفس مضمون اور متن پر اتفاق رائے کیا گیا تھا۔

اس کے بعد انندا کی باری آئی۔ بُدھ صحیفوں کے پانچوں جلدوں (نکایاس)

سے مسائل حاضرہ کے متعلق مضمون سے انندا کے لئے استفسارات مرتب کئے گئے جس کے مناسب وموزون جوابات انندا نے پیش کئے۔ یہ استفسارات بودھ عقیدے ونایا کی روشنی میں بنائے گئے جیسا کہ یہ اپدیش کس موقعہ پر اور کس شخص یا گروہ سے متعلق دئے گئے ہیں۔انندا کی طرف سے دئے گئے تسلی بخش جوابات نے بودھ صحیفوں (سوتا پٹا کا) کے مجموعہ تحریر کی تکمیل کے مسئلہ کو خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔ پانچویں صدی عیسوی کے بھارتی بودھ فلسفی واسکالر بودھا گھوسا نے سامانتا پاسادیکا نامی اپنے بودھ تاریخی دستاویز میں ونایا کے کلہم اجزاء اور بودھ صحیفوں (سوتا پٹا کا) جن کا اُچارن کونسل کے دوران ہوا ہے سے متعلق طویل تفصیل درج کی ہے۔

کولاواگا سے لے کر سامنتا پاسادیکا تک تمام مختلف تاریخی بودھ دستاویز کے مطابق اجلاس کی مکمل کاروائی مہا کاسپا، اُپالی اور انندا نے سرانجام دی۔اجلاس کا تحریری مسودہ ویانا کی اُپالی کی رہنمائی میں اور دھرما کی انندا کی رہنمائی میں بہک سیس نامی ایک جوگی نے مرتب کی۔اجلاس کے تمام امورات کا انتظام وانصرام اور انجام دہی کو پورے کونسل کے اجتماعی تصنیف کے ساتھ منسوب کیا گیا۔مہاواستو میں درج تفصیل فی نفس الامر بودھ پالی روایات سے مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کاتیایانا نامی قدیم وید پادری کلیدی نمائندہ اور داسا بھیومس موضوع بحث رہا ہے۔البتہ اس بات کا کہی تذکرہ نہیں ملتا ہے کہ پہلے بودھ اجلاس کی کاروائی کے دوران ابھیدما کا موضوع زیر بحث رہا ہے۔تاہم بعد کی تاریخی دستاویزوں میں ابھیدما کے بودھ مذہبی ادب کا ناقابل تنسیخ حصہ ہونے کی اعتباریت کے بارے میں سوالات اُٹھائے گئے ہیں جو خالی از معانی تصور نہیں کیا جاتا ہے۔

آنندا کے خلاف الزامات:

جیسا کہ اس بات کا تذکرہ آیا ہے کہ آنندا کو کونسل میں شامل کرنے کے

معاملہ پر کئی طرف سے ناراضگی اور احتجاج کی آوازیں بلند کی گئی تھیں۔ چونکہ آنندا کو بُدھ مت کے پہلے اجلاس میں جوگیوں کی فہرست میں شامل کرنے کے خلاف اور حق دونوں آرائیں پائی جاتی تھیں جس کے ہوتے ہوئے بہرکیف اجلاس کے انعقاد سے پہلے اسے شامل کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مہا کاسا پانے آنندا کے حصول نروانا اور ارہتھ کی ناکامی کی بنیاد پر اسے کونسل میں شامل کرنے کے طریقہ کار میں نقص اور خامیوں کو تسلیم کیا۔ ایسا ہونے کے باوجود اور بودھ عقیدے کے اس عہد و پیمان اور ایمان ویقین کے نروانا اور ارہتھ کا حصول ایک شخص کو تمام گناہ وخطاوں اور تعزیر سے بری کر دیتا ہے اس کے باوجود آنندا کو پھر بھی بودھ جوگیوں نے کئی جرائم کے ارتکاب کا موردالزام ٹھہرایا جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے؛

۱۔ اپنے مُرشدوگرو (گوتم بُدھ) کی موت سے چونکہ وہ گہرے غم والم اور سوگ میں پڑا ہوا تھا اور نتیجتاً وہ کئی چھوٹے وکم تر ہی سہی مگر اہم مذہبی فرمان اور ضابط عمل وضع کرنے میں ناکام رہا۔

۲۔ جیسا کہ وہاں اس کا کوئی مددگار نہیں تھا اسے اپنے مُرشدوگرو (گوتم بُدھ) کے پہناوے کو تیار کر کے زیب تن کرنا تھا۔

۳۔ اس نے سب سے پہلے مُرشدوگرو (گوتم بُدھ) کے جسد کو خواتین کو دیکھنے اور سلام بجالانے کی اجازت دی، کیونکہ وہ انہیں اسے روکنے کے لئے قید کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہ سب اُن کی روحانی تربیت کرنے کے لئے انجام دیا۔

۴۔ وہ کسی آسیب اور بدخواہ کے زیر اثر آیا تھا جب وہ مہاتما (گوتم بُدھ) کو یہ درخواست کرنا بھول گیا کہ وہ اسے اس قابل بنائیں کہ وہ کالپا کی تعلیم جاری رکھ سکے۔

۵۔ مُرشدوگرو (گوتم بُدھ) کی بچپن کی دائی مہاپراجاپتی گوتمی کو کسی مذہبی عہدے پر مقرر کرنے کے لئے خلاف روایت عورتوں کو شامل کرنے کے لئے

استدلال کرنا پڑا۔

بدھ مت کے مذہبی ادب میں آنندا کے خلاف الزامات مختلف انداز میں لکھے پائے جاتے ہیں۔تبّتی دیلوا کی اس حوالہ سے تفصیل میں آنندا کے خلاف دو مختلف نوعیت کے الزامات ملتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آنندا اپنے گرو گوتم بُدھ کو تین بار پینے کا پانی مانگنے کے باوجود پانی فراہم کرنے میں ناکام رہا۔اور دوسرا یہ کہ اُس نے گوتم بُدھ کے اعضائے مخصوص (تناسل) کی نمائش بودھ مذہب کا پالن کرنے والے متوسط طبقہ کے مرد وخواتین کے سامنے کردی۔ان دو الزامات کے جوابات آنندا نے اس طرح پیش کئے تھے، چونکہ دریا کا پانی ناصاف اور گدلا ہونے کی صورت میں پینے کے قابل نہیں تھا اس لئے وہ اسے اپنے گرو کے سامنے پیش نہیں کرسکا اور گوتم بُدھ کے اعضائے مخصوص (تناسل) کی نمائش اس متعلقہ طبقہ کے مرد وزن کو اس لئے کرائی تاکہ انہیں شہوت پرستی سے نجات مل جائے۔عین ممکن ہے کہ آنندا کے مذکورہ جوابات سے اُس وقت کے بُدھ مت کے حل وعقد کا اختیار رکھنے والی سبھا نے مطمئن ہوکر اُسے کونسل میں شامل کرنے کا فیصلہ لیا ہو۔

دوسرا اہم مسئلہ جو پہلے اجلاس کے دوران زیر بحث آیا ہے وہ رتھ بان چھنا نامی بودھ جوگی کے حق میں سخت سزا فیصلہ سنانے سے متعلق ہے۔واضح رہے کہ چھنا جوگی گوتم بدھ کے سنگھا (نکہاما) حاصل ہونے کے عظیم دن رتھ بانی کی ذمہ داری پر تعینات تھا۔مذکورہ جوگی بودھ نظم ونسق اور انتظامیہ سے منسلک ہر چھوٹے بڑے ممبر پر کیچڑ اُچھالتا تھا اور انتہائی مغرور قسم کا شخص تھا۔اس پر حد جاری کرکے اس کے ساتھ مکمل سوشل بائیکاٹ کرنے کا حکم نامہ اجرا کیا گیا تھا۔جب چھنا کے حق میں یہ سزا سُنائی گئی اسے زبردست خجالت اور پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔اسی غم والم کے عالم میں سخت نادم ہوکر وہ تائب ہوگئے اور بعدازاں اُسے خامیوں اور کمزوریوں سمیت

تمام الزامات سے بری کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مختصر عرصہ کے بعد اسے نَروان حاصل ہوکر وہ بُدھ بھگشو کے مقام پر فائز ہوگیا اور اس کے خلاف سُنائی گئی سوشل بائیکاٹ کی سزا خود بخود معطل ہوکر غیر موثر ہوکر رہ گئی۔

المختصر بُدھ مت کے پہلے اجلاس کی کاروائی کے انعقاد سے چار نتائج حاصل کئے گئے۔

☆..... پہلا یہ کہ اُپالی کی قیادت میں بودھ تعلیمات (وِنایا) کا تصفیہ ہوگیا۔

☆.....دوسرا یہ کہ آنندا کی قیادت میں بودھ مذہب سے متعلق صحیفوں کے نفس مضامین ومتون کا تصفیہ ہوگیا۔

☆.....تیسرا یہ کہ آنندا کے خلاف ضابط اور قانونی چارہ جوئی عمل میں لائی گئی۔

☆.....اور چوتھی یہ کہ رتھ بان چھنا نامی بودھ جوگی کے حق میں سزا جاری کی گئی۔

تاہم آنندا کے خلاف ضابطہ کی کاروائی اور قانونی چارہ جوئی کرنے کے فیصلہ کے حوالہ سے کولاواگا اور تبّتی دیلوا کے دئے گئے تفاصیل کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے۔ کلاواگا کے مطابق آنندا کے خلاف قانونی وضابطے کی کاروائی عملی طور اجلاس کے اصلی کاروائی کے اختتام ہونے کے بعد انجام دی گئی جب کی تبّتی دیلوا کے مطابق یہ آنندا کے کونسل میں شامل ہونے کے فوراً بعد انجام دی گئی۔

پروفیسر اولڈن برگ بُدھ مت کے پہلے اجلاس کی تاریخی اعتباریت کے حوالہ سے متشکک رہے ہیں۔ اس ضمن میں بودھ صحیفہ مہاپری نبانا میں بھی سبھا دا کا غیر متعلق تبصرہ پایا جاتا ہے البتہ کونسل کے اجلاس کا انعقاد کسی شک وشائبہ سے بالاتر ہے۔ یہ تشکیک کسی سہو اور غفلت کے نتیجے میں بمعنی خاموشی نیم رضا کے مصداق ہے۔ تاہم بُدھ مت کے تمام فرقوں کے اندر پائی جانے والی اس متفقہ علیہ روایت کو محض ایک شگوفہ تصور کر کے طاق نسیاں نہیں بنایا جاسکتا۔ باوجود ہلکے اختلاف رائے کے بُدھ

مت کے پہلے اجلاس کے انعقاد پر بودھ تاریخی ادب اور دیگر تاریخی دستاویزات کے اندر بنا کسی لگی لپٹی کے مستحکم و مضبوط اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ یہ ایک عام فہم اور فطری بات ہے کہ گوتم بُدھ کی وفات کے بعد بُدھ دھرم کے معتقدات کا تعین و تنقیح منظّم و منضبط اصول وضوابط کے مطابق ہونا چاہئے تھا۔ خوش قسمتی سے پروفیسر اولڈن برگ پہلے اجلاس کے انعقاد سے متعلق اپنی رائے میں اکیلے اور یکتا ہے۔ جب کہ باقی تمام شرق و غرب کے مورخین و محققین نے اس کی رائے کو سرے سے ہی مسترد کر دیا ہے اور بُدھ مت کے پہلے اجلاس کے انعقاد پر مجموعی طور اتفاق کا اظہار کیا ہے۔

بُدھ مت کا دوسرا اجلاس:

بُدھ مت کا دوسرا اجلاس گوتم بدھ کی وفات کے کم و بیش تقریباً ایک صدی عرصہ کے بعد وائیسالی نامی جگہ پر منعقد کیا گیا ہے۔ کولا واگا کے اندر اس حوالہ سے تفصیل پائی جاتی ہے کہ وجی نامی مملکت کے بودھ جوگی دس نکات (دساواتھیونی) کے سختی سے پیروکار تھے جن کو بودھ راجا کا کندکا کے بیٹے یاسا نے غیر روایتی عقائد قرار دیا ہے۔ یاسا نے ان غیر روایتی دس نکات کی پیروی اور ان پر عمل کو سنگین غیر اخلاقی اور غیر قانونی کہلایا ہے۔ جب کہ مملکت وجی کے بودھ جوگیوں نے یاسا کی اس بے باکانہ اظہار رائے پر ناراضگی کا اظہار کیا اور اسے سزا دینے اور معافی طلب کرنے کی مانگ کی ہے۔ جس کی وجہ سے ان دس نکات کی توہین اور ان پر عمل نہ کرنے والے لوگوں کو جن کو ویاسا نے ایسا کرنے کے لئے اُکسایا تھا اور بودھ جوگیوں اور عوام الناس سے معافی مانگنی پڑی۔ اس کے ساتھ ساتھ بودھ جوگیوں کی ان دس نکات سے متعلق عقیدے کو جائز مان کر ان کی من وعن پیروی کرنے کے لئے کہا گیا۔ یاسا نے ان نکات سے متعلق اپنی رائے کا فصیح و بلیغ انداز میں وکالت کر کے از خود دفاع کر کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے ان پر فتح حاصل کی۔ جس کے نتیجے میں ناراض بودھ

جوگیوں کا اس کے خلاف غصہ بھڑک اُٹھا اور انہوں نے سزا کے طور اس کے ساتھ سوشل بائیکاٹ کرنے کا اعلان کیا اور اسے اپنی بھائی چارے اور برادری سے نکال باہر کردیا۔ کولا واگا میں ان دس نکات کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے:

۱۔سنگیلو نا کاپا (نمک کو سینگ میں لے کے چلنے کا عمل) یہ عمل بُدھ مت کے پاسیتیا ۳۸ کے خلاف ہے جس کی رُو سے غذائی اجناس کو جمع اور ذخیرہ کرنا منع ہے۔

۲۔دوانگولا کاپا (سایہ دو انگشت ہونے کے وقت پر کھانا کھانے کا عمل)، یہ عمل بُدھ مت کے پاسیتیا ۳۷ کے خلاف ہے جس کی رُو سے دو پہر کے بعد کوئی غذا کھانا منع ہے۔

۳۔گامانتارا کاپا (ایک ہی دن میں کسی دوسری بستی میں جا کر وہاں دوسری بار غذا کھانے کا عمل)، یہ عمل بُدھ مت کے پاسیتیا ۳۵ کے خلاف ہے جس کی رُو سے مقرر مقدار سے زیادہ کھانا منع ہے۔

۴۔آواسا کاپا (ایک ہی علاقہ میں بودھ دیوس کی تقریبات مختلف مقامات پر منانا)، یہ عمل مہاواگا نامی بودھ صحیفہ میں درج ایک ہی علاقہ میں اقامت اختیار کرنے سے متعلق احکام کی خلاف ورزی ہے۔

۵۔انوماٹیکا پا (کسی عمل کو انجام دینے کے بعد اس کی منظوری یا اجازت حاصل کرنا)، ایسا کرنا بُدھ مت کے دھرمی قواعد وضوابط کے برخلاف ہے۔

۶۔اسینا کاپا (ریت اور رسم ورواج کی پیروی کو معمول بنانا)، یہ بھی بُدھ مت کے دھرمی قواعد وضوابط کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

۷۔اماتھیتا کاپا (کھانا کھانے کے بعد چھاچھ، لسی پینا)، ایسا کرنا بُدھ مت کے پاسیتیا ۳۵ کے خلاف ہے جس کی رُو سے مقرر مقدار سے زیادہ کھانا منع ہے۔

۸۔جالوگم پتم (نشہ آور مشروبات پینا)، ایسا کرنا ھ مت کے پاسیتیا ۵۱ کے

خلاف ورزی ہے جس کی رُو سے نشہ آور اشیاء کا استعمال کرنا منع ہے۔

۹۔آداسا کم نیسید انام (ملائم اور بنا جھالی والی چٹائی کو استعمال میں لانا)، ایسا کرنا بُدھ مت کے پاسیٹیا ۸۹ کے خلاف ورزی ہے جس کی رُو سے نرم وملائم اور بنا جھالی کی چٹائیوں کا استعمال ممنوع ہے۔

۱۰۔جاتاروپاراجاتم،(سونا اور چاندی کو تحفتاً قبول کرنا)، ایسا کرنا بُدھ مت کے نیساجیا پاسیتیا کے اٹھارویں اصول کے مطابق ممنوع ہے۔

آدرجوگ یاسا نے درج بالا دس نکات کی پیروی کو علی اعلان غیر قانونی قرار دیا۔بعد اُس کے جب اُسے بودھ مذہب سے اخراج کرنے کا فیصلہ سُنایا گیا وہ واتسا سلطنت کے مرکزی شہر کا سامی چلے گئے جہاں سے انہوں نے مغربی وجنوبی ممالک کے بودھ جوگیوں کو قاصدوں کے ذریعے پیغام روانہ کر کے جمع ہونے کی دعوت دی۔ تا کہ لوگوں کے اندر بودھ مذہب کے اصول وقواعد کی برسرعام خلاف ورزی کے بڑھتے رجحان کا قلع قمع کیا جاسکے اور بودھ مذہب کے اصلی و خالص احکامات اور تعلیمات کو ملاوٹ وخطرے اور ونایا کو صحیح سالم رکھ کر محفوظ بنائیں۔اس کے بعد وہ آہوگا نگا نامی پہاڑی کی طرف روانہ ہوا جہاں سامبھوتا ساناواسی نامی آدرجوگ رہتا تھا۔ساناواسی سے آداب وسلام کے بعد اس کے سامنے واجبین جوگیوں کی جانب سے کی جانے والے دس نکات کے پرچار کی تفصیل اس کے سامنے بیان کی۔یاسا نے ساناواسی جوگی کے سامنے معاملہ کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنے کی درخواست رکھی اور آدرجوگ ساناواسی نے اس کے ساتھ اتفاق کر کے اس کی حامی بھرلی۔اسی اثناء میں کم وبیش سٹھ بُدھ بھگشو مغربی ممالک سے تشریف آور ہو کر آہوگا نگا نامی پہاڑی پر جمع ہوگئے۔اس کی ساتھ ہی مزید تقریباً اٹھاسی بدھ بھگشو آونتی اور جنوبی ممالک سے آ کر اُن سے ملے۔ان تمام بودھ جوگیوں نے معاملہ کو گھمبیر، حساس اور فوری توجہ

طلب قرار دیا۔انہوں نے بودھ عقیدے سے متعلق لوگوں کے اندر بڑھتے انحراف کا معاملہ پارسائی اور علم وفضل کے لئے معروف اور جانے مانے آدرجوگ رواتا کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا جو سوریا نامی جگہ پر رہتا تھا۔ اُس کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کرنے کی تجویز پر تمام بودھ جوگیوں کے مابین اتفاق رائے ہوگیا تاکہ معاملہ کی تئیں اس کی حمایت حاصل کی جائے۔دشوار ترین راستوں سے اور طویل مسافت طے کرکے وہ آدرجوگ رِواتا ساہاجاتی کے پاس پہنچ گئے اور اس کے سامنے پورا معاملہ پیش کیا ۔آدرجوگ رِواتا نے اس کے سامنے پیش کئے گئے دس کے دس نکات کا باریک بینی سے جانچ پڑتال اور جائزہ لے کر وفد میں شامل تمام ارکان سے ان کے حوالہ سے رائے طلب کی۔معاملہ کی نزاکت اور بودھ عقیدے کے ساتھ کھلواڑ اور چھیڑخوانی سے تحفظ بخشنے کے لئے آدرجوگ رِواتا نے تمام دس نکات کو غیر اخلاقی ، ناجائز اور ناقابل قبول قرار دیا۔

دوسری طرف سے واجپین جوگی تمام صورت حال پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ساہاجاتی جاکر آدرجوگ رواتا کے سامنے حاضر ہونے کا فیصلہ کرلیا تاکہ اپنے موقف کے حق میں حمایت حاصل کرسکے۔وہ اپنے ساتھ قیمتی تحائف لے کر گئے جن کو شکریہ کے ساتھ اُس نے قبول کرنے سے انکار کیا۔تاہم انہوں نے اپنے معاملہ کی شنوائی کے لئے اُس کے بدیارتھی (مرید) اوتارا کو پھانس کر مائل کردیا لیکن پھر بھی بات نہیں بن پائی۔اس کے بعد آدرجوگ رواتا کی تجویز پر تمام بودھ جوگی وائیسالی کی طرف روانہ ہوگئے تاکہ تنازعہ کا اس کی جنم بھومی کے مقام پر حل نکالا جائے۔وائیسالی کے مقام پر سات سو بودھ جوگیوں نے اجلاس میں شرکت کی۔ پورا اجلاس شور شرابہ، بدنظمی اور لایعنی و بے سود بحث ومباحثہ کی نظر ہوگیا۔وقت کے مزید ضیاع اور فضول و غیر متعلق بحث وتمحیص سے بچنے کے لئے معاملہ کمیٹی کے سپرد کیا

گیا جس کے چار ممبر مشرقی بودھ علاقہ اور چار مغربی بودھ علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آجیتا جوگی کو کمیٹی کا ناظم اور آدر جوگ سابا کامی کمیٹی کے صدر منتخب کئے گئے۔ایک ایک کر کے دس نکات کو کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا اور کمیٹی نے باتفاق رائے تمام کے تمام دس نکات غیر قانونی وغیر اخلاقی قرار دئے۔اس کے بعد پھر ایک بار معاملہ اُٹھایا گیا اور بعینہ یہی فیصلہ بھری کونسل کے اجلاس سے برآمد ہوا۔کونسل کے یک زبان اور باتفاق رائے فیصلہ سے واجیین جوگیوں کے طرز عمل اور طریقہ کار کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔

درج بالا تفصیل بودھ تاریخی دستاویز کولاواگا سے لیا گیا ہے۔مہاواگا اور دیپاوامسا میں درج تفاصیل کے اندر مزید اضافی نکات شامل ہیں جس کے مطابق اجلاس میں غیر معمولی تعداد میں بودھ جوگی شامل تھے۔دیپاوامسا اور سامنتا پاسادیکا کی دی ہوئی تفاصیل کے مطابق کونسل کا اجلاس اجاتاشترو خانوادے کے راجا کالاسوکا کے دور حکومت میں منعقد کیا گیا ہے جو پہلے واجیین کے بودھ جوگیوں کا حامی رہا ہے۔ راجا کالاسوکا نے واجیین جوگیوں کے زیر اثر آکر تھیرا کونسل کو حمایت دے دی۔ دیپاوامسا نے لکھا ہے کہ وائیسالی کے جوگیوں نے ایک اور کونسل کا انعقاد کیا جس میں دس ہزاروں بودھ جوگیوں نے شرکت کی جسے مہاسنگتی کا نام دیا گیا۔مہاوامسا کے مطابق سات سو تھیرا پر مشتمل کونسل نے بودھ مذہبی صحیفہ دھرما کو مرتب کیا۔سامانتا پاسادیکا نامی تاریخی بودھ دستاویز میں بودھاگوسا نے درج کیا ہے کہ آخری اور حتمی فیصلہ کے بعد سات سو بودھ جوگی بودھ دھرما اور ونایا کے اُچارن میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے نئے نسخے پٹاکا، نکایا، انگا اور دھرما سخاندہا س کی صورت میں منظر عام پر لائے۔

اس حوالہ سے چینی اور تبّتی مورخین کی تفاصیل کے اندر ہلکا اختلاف پایا جاتا ہے۔شمالی خطے سے تعلق رکھنے والے مورخین عمومی طور کونسل کے انعقاد کی تاریخ گوتم بُدھ کے نروانا کے ایک سو دس سال بعد بتاتے ہیں۔ان ہلکے اختلافات کے باوجود

کونسل کے اجلاس کے انعقاد اور اس میں زیر بحث آئے مسائل و معاملات اور ان کے فیصلے و حل پر مورخین و محققین کے اندر اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم پروفیسر اولڈن برگ نے کونسل کی صحت اور استناد پر کچھ شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے اس بنیاد پر کہ چونکہ وِنایا کے مذہبی صحیفہ کے اندر وائیسالی کے مقام پر منعقد ہوئے کونسل کے اجلاس میں زیر بحث آئے مسائل و معاملات کی کوئی تفصیل نہیں پائی جاتی ہے۔ لیکن پروفیسر موصوف کی رائے اور پیش کئے گئے وجوہات اس قدر مستحکم نہیں ہے کہ بُدھ مت کے مختلف جتھوں اور فرقوں کے اجلاس کے انعقاد پر اتفاق رائے پر کوئی حرف آئے۔ دوسرے بُدھ مت کے اجلاس کے انعقاد سے متعلق تاریخی شواہد مضبوط و مستحکم اور کافی وشافی ہیں۔ اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ اس کے انعقاد اور اعتباریت کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے۔ یہ اجلاس بُدھ مت کے اندر فرقہ بندی و انتشار اور ماہاسانگھی کاس کے علٰحیدگی کا باعث ثابت ہوگیا جس کی تصدیق بعد میں رونما ہوئے واقعات سے ہوجاتی ہے۔

بُدھ مت کا تیسرا اجلاس:

بُدھ مت کا تیسرا اجلاس معروف بودھ راجا پریادرسی اشوکا کی سرپرستی میں پاٹلی پُترا نامی مقام پر منعقد ہوا ہے۔ تخت سلطنت پر براجمان ہونے کے چند ہی سالوں کے اندر راجا اشوکا بُدھ مت کے پُرستار بن کر رہ گئے۔ تیسرے کونسل کے اجلاس کے انعقاد کے فوری محرکات اور عوامل بودھ مذہب کے صحیفوں کو ملاوٹ سے پاک اور خالص کرنے اور شفاف بنانے کی ضرورت تھی جو مختلف بودھ مذہبی فرقوں و پنتھوں اور ان کے متحارب گروہوں کے نمودار ہونے اور اُن کی آپسی سرپھٹول کی سبب متاثر ہوچکی تھی۔ کیرن نامی مورخ کے مطابق بُدھ مت کا تیسرا اجلاس گزشتہ دو بودھ اجلاسوں کے مانند کوئی عام اجلاس نہیں تھا بلکہ یہ ستھاویرا وادنوں یا ویبھا جیا

وادنوں کا تنظیمی اجلاس تھا۔ راجا تیسا موگالیپوتا جو اپنی پوری سلطنت کو بُدھ مت ماننے والوں میں تبدیل کرنے کے لئے معروف ہیں، نے بودھ مذہب کے اندر در آئے ناشائستہ، غیر اخلاقی عملیات اور عقیدے کے نام پر بدعات وخرافات اور بودھ بھائی چارہ اور برادری کا شیرازہ بکھرا دیکھ کر رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہوئے جن کا پرچار کرنے میں مختلف بودھ فرقے اور پنتھ پیش پیش تھے تو اس نے بودھ مذہب کی اس حالت زار کی نوٹس لے کر سخت فیصلے کر ڈالے۔ بدعات وخرافات پر قابو پانے کے لئے اس نے فرقہ پرست گروہوں اور پنتھوں کو بودھ برادری سے نکال باہر کر دیا۔ اس اجلاس کا سب سے اہم نتیجہ نکلا کہ اسے بُدھ مت کے حقیقی واصلی عقائد از سر نو قائم کر کے ان کا رواج عام کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ راجہ نے معاہدہ ابھیدھاما کی تجویز کونسل کے سامنے پیش کر دی۔

مہاوامسا نامی تاریخی دستاویز میں موگالی پوتا تیسا کے معجزانہ ولادت اور اُس کے بُدھ دھرم کے قبول کرنے کی تفصیل ملتی ہے۔ موگالی پوتا تیسا کی زندگی غیر معمولی امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور اپنی عمر کے سولویں سال سے پہلے ہی ہندو مت کے تینوں مقدس ویدوں کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ لیکن بعد ازاں تھیرا اسگاوا کی وساطت سے اس نے تبدیلی مذہب کر کے بُدھ مت کا پیروکار ہو گیا۔ وہاں اسے کم وقلیل عرصہ میں اپنے تمام ساتھیوں سمیت نروانا کا مقام حاصل ہوا۔ اسی سے متاثر ہو کر شہنشاہ نے اپنے بیٹے ماہندہ اور بیٹی سانگھا میتا سمیت بُدھ مت اختیار کیا۔ پھر یہی دونوں بھائی بہن سری لنکا (سیلون) منتقل ہو کر سارے جزیرے کے باشندوں کو بودھ مذہب کے پیروکاروں میں تبدیل کر گئے۔

اشوکا کے تبدیلی مذہب اور بُدھ مت اختیار کرنے سے بودھ دھرم شالوں کی مالی ومادی حالت میں بے پناہ ترقی ہوئی اور جوگیوں کی حالت زندگی بہتر ہو کر آرام دہ

بن گئی۔ بودھ مذہبی مراکز کی ناگفتہ حالات سے ہوئے مذہب بیزار لوگ جو اپنے روز مرہ زندگی، زرائع آمدن کو لے کر پشیمان اور بے عزت ہو چکے تھے ان مراکز کی شان رفتہ کی بحالی سے پھر سے بُدھ مت کی طرف راغب ہو گئے۔ البتہ وہ اپنے قدیم عقائد اور مذہبی عملیات پر عمل پیرا رہے اور اپنے عقائد کو گوتم بُدھ کے عقائد کہلا کر ان کی تعلیم و ترویج میں لگے رہے۔ ان کے اس طرز عمل سے تھیرا موگالی پوتا کو زبردست کوفت اور رنج پہنچا اور آہوگا نگا نامی پہاڑی پر سات سال کے عرصہ خلوت نشین رہے۔

مذہب شکن لوگوں اور جعلی جوگیوں کی تعداد میں حقیقی بودھوں کی نسبت بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سات سالوں تک اپوساتھا یا پاوارانا کی کوئی مذہبی تقریب کسی بھی بودھ دھرم شالہ میں منعقد نہیں ہو سکی۔ حقیقی اور وفادار جوگیوں نے ان مذہبی تقریبات کا بدعتی جوگیوں کے ساتھ مل کر منعقد کرنے سے انکار کیا۔ آپسی بھائی چارہ اور یگانگت کی ناکامی اور عدم موجودگی سے شہنشاہ کو زبردست داذیت اور دھچکا لگا اور اس نے اپوساتھا کی تقریب کے انعقاد کے احکامات جاری کئے۔ جس پر دھان کو اپوساتھا کی تقریب منعقد کرنے کی ذمہ داری بخشی گئی تھی اُس کے ہاتھوں سے ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ وہ شہنشاہ کے حکم کو سمجھنے میں چوک گئے اور اُس نے بادشاہ کے حکم کی عدم تعمیل میں کئی ایک بودھ جوگیوں کے سر قلم کر دئے۔ جب یہ غم ناک خبر شہنشاہ اشوکا کے پاس پہنچی اُسے بہت تکلیف اور اذیت ہوئی اور اس فحش غلطی اور خطا پر عوام سے معافی طلب کی۔ اس نے بودھ جوگیوں کے پرجا سے پوچھا کہ آیا وہ مجھے اس غلطی کا ذمہ دار مانتے ہیں یا نہیں؟ پرجا میں سے ملا جلا ردعمل ملا، کچھ جوگی اسے مجرم مانتے تھے اور کچھ جوگیوں کی رائے اس کے برعکس تھی۔ شہنشاہ اشوکا الجھن اور تردد میں پڑ گئے اور اُس بابت تمام جوگیوں سے پوچھا۔ کیا آپ میں سے کوئی میری اس الجھن اور تردد کو دور کر سکتا ہے؟ انہوں نے یک زبان کہا کہ اس الجھن اور تردد کو

صرف موگالی کے فرزند تھیرا تیسا دور کرسکتا ہے اور اس کا جواب صرف وہ ہی دے سکتا ہے۔ جوگیوں کے پرجھا سے یہ جواب سُن کر اشوکا نے تھیر تیسا کے پاس قاصد روانہ کر کے اُسے پاٹالی پُتر وارد ہونے کا پیغام بھیجا۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد بالآخر آدرجوگ تھیرا تیسا آبی راستے سے کشتی کے ذریعے پاٹالی پُتر کا سفر کرنے کے لئے رضامند ہوگئے۔ عالی المرتبہ تھیرا تیسا کی آمد پر شہنشاہ اشوکا بذات خود اُس کا استقبال کرنے کے لئے چلے گئے۔ شہنشاہ گھٹنوں کی گہرائی تک پانی میں اُتر گئے اور تعظیم و تکریم کے طور اپنا سیدھا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

عالی المرتبہ تھیرا تیسا کے قیام کا بندوبست عظیم الشان گلستان میں کیا گیا اور فقید المثال مہمان نوازی اور احترام سے نوازا گیا۔ اس کے بعد اُسے معجزہ دکھانے کی درخواست کی گئی جو اُس نے قبول کر کے موقعہ پر ہی انجام دیا۔ معجزہ کی انجام دہی سے اشوکا کو اس کی عظمت اور آدرجوگی پر یقین ہوگیا۔ اشوکا نے پورا معاملہ تھیرا تیسا کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ آیا وہ پردھان کے ذریعے سے قتل کئے گئے جوگیوں کا مجرم ہے؟ کیا اُسکے سر ان کے قتل کا ذمہ ہے؟۔ تھیرا تیسا نے جواب میں کہا کہ گناہ کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ بُرائی کے ارادے کے بغیر جُرم نہیں ہوتا ہے۔ یہ جواب سُن کر شہنشاہ اشوکا مطمئن ہوگئے اور اُس کے سر سے گناہ کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ تھیرا تیسا نے ایک ہفتہ شہنشاہ اشوکا کو گوتم بُدھ کی تعلیمات سکھائیں۔ اس کے بعد اشوکا نے تمام جوگیوں کی پرجا کا کونسل بُلایا۔ اُس نے کئی مختلف الخیال جوگی گروہوں کو تھیرا تیسا کے سامنے بُلایا اور انہیں اپنے عقائد اور عملیات اُس کے سامنے پیش کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے اپنے گمراہ عقائد مثلاً سناتن آتما وغیرہ اُس کے سامنے رکھے۔ ساٹھ ہزار کی تعداد میں بدعات وخرافات میں مبتلا جوگیوں کو شہنشاہ کے بھائی چارے سے نکال باہر کیا گیا۔ اُسکے بعد اُس نے یتھارتھ جوگیوں سے بودھ عقائد اور عملیات سے متعلق

جواب طلبی کی ۔ جب تھیرا تیسا نے ان کے جوابات کی تصدیق و تائید کی تو شہنشاہ نے درخواست کی کہ اسکی برادری اوپوسا تھا تقریب کا انعقاد کرے گی تا کہ پورے بودھ سماج کے عقائد و عملیات کو بدعات و خرافات اور بدطینت عناصر سے پاک کیا جاسکے۔تھیرا تیسا کو بودھ برادری کے دستور وقوادضوابط کا سرپرست بنایا گیا۔

اس کے بعد تھیرا تیسا نے ایک ہزار بودھ جوگیوں پر مشتمل ایک برادری منتخب کی جو بودھ صحیفوں کے تینوں پِٹا کا علم جانتے تھے تا کہ حقیقی و خالص بودھ عقائد کو مرتب کیا جائے۔نومہینوں تک اُس نے بودھ جوگیوں کے ساتھ مسلسل کام کر کے حقیقی و خالص ''تری پٹکا'' کو مرتب کرنے کا کام مکمل کیا۔ یہ کونسل اسی طرح اور اُسی ذوق و شوق سے منعقد کیا گیا جیسے مہا کاسا پا اور تھیرا یاسا کے کونسل منعقد ہوئے تھے۔کونسل کی کاروائی کے درمیان میں تھیرا تیسا نے کاتھاواتھیو پا کارانا پیش کیا جس میں بودھ عقائد سے متعلق بدعات وخرافات کا باریک بینی سے جائزہ لے کر ان کی نفی کردی گئی۔اس طرح سے تیسرا بودھ کونسل اپنے اختتام کو پہنچا جس میں ایک ہزار بودھ مندوبین نے شریک ہوئے تھے۔

اس کونسل سے ایک مہتمم بالشان نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ دنیا کے مختلف مما لک کی طرف پادریوں کو سادھاما کی تبلیغ و پرچار کے لئے روانہ کیا گیا۔اشوکا کا بیٹا ماہندا اور بیٹی سانگھامیتا کو سیلون (سری لنکا) میں بودھ دھرم کی تبلیغ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ شہنشاہ اشوکا کی طرف سے عمل میں لائی گئی ان ہی کاوشوں کے نتیجے میں ایشاء، افریقہ اور یورپ کے دور دراز مما لک تک بُدھ مت کا پھیلاو ہو گیا اور بودھ دھرم دنیا کے مما لک میں سرکاری دھرم بن گیا۔

بُدھ مت کا چوتھا اجلاس:

بُدھ مت کے چوتھے اجلاس کا انعقاد سا کا یا تو روسکانسل سے تعلق رکھنے

والے شکتی شالی راجا کنشک کی سرپرستی میں ہوا ہے۔اس کی سلطنت وسیع وعریض علاقے بشمول کابل، گاندہارا، سندھ، شمال مغربی ہندوستان، کشمیر اور مدہیا دیسا کے کئی حصوں پر پھیلی ہوئی تھی۔مہاراجہ اشوکا کی طرح بودھ لوگوں کے اندر اس کی زبردست تعظیم وتکریم پائی جاتی تھی۔عددی شواہد سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ راجا کنشک فی الاصل کسی ایرانی مذہب کا پیروکار رہا ہے اور بعد میں بودھ مذہب اختیار کیا تھا۔اگر چہ ہمارے پاس اُس کے تبدیلی مذہب کے ثقہ تاریخ کے شواہد موجود نہیں ہیں لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ بُدھ مت کا چوتھا اجلاس اس کی تحریک اور سرپرستی میں ایک سو سال قبل مسیح میں منعقد ہوا ہے۔ایک تاریخی حوالہ کے مطابق مذکورہ اجلاس جالندھر پنجاب کے مقام پر جب کہ دوسرے تاریخی حوالہ کے مطابق یہ وادی کشمیر میں منعقد ہوا ہے۔جنوبی علاقوں کے بُدھ مت سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کونسل کے انعقاد کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور اس کا تذکرہ سیلون (سرلنکا) کی تاریخی نادر کُتب میں نہیں ملتا ہے۔یہ گمان کرنا غلط نہیں ہوگا کہ تھیراوادا فرقہ سے منسلک بودھوں نے چوتھے کونسل کے اجلاس میں شرکت نہیں کی ہوگی۔تبّتی تاریخی دستاویزوں کے مطابق چوتھے کونسل سے ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ بودھ باہمی بھائی چارہ میں پڑی دراڑ دور ہوگئی اور باہمی ان بن اور شکر رنجی کے وجوہات اور عوامل کو ایڈریس کر کے آپسی بھائی چارہ ازسرنو قائم ہوگیا۔تمام اٹھارہ بودھ فرقوں کو تسلیم کر کے انہیں اصلی اور حقیقی بودھ عقیدے کا امین اور علمبردار قبول کیا گیا۔چینی مورخ ہیون سانگ کے مطابق راجہ کنشک بودھ مذہبی صحیفوں سے متاثر ہوکر ان کا دلدادہ بن گیا اور ہر روز اس کے پاس ایک بودھ جوگی آکر اسے بودھ تعلیمات اور احکامات سکھاتا تھا۔بودھ تعلیمات اور احکامات میں جب اُس نے اختلافات پائے اور ایک دوسرے سے متضاد اور متصادم لگے تو اس کے اندر اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگئی۔اس صورت حال سے دوچار ہوکر

راجہ نے آدرجوگ پارسوا سے حقیقی واصلی بُدھ مت اور بودھ عقیدے کے بارے میں رابطہ کیا۔ اسی آدرجوگ پارسوا کے صلاح ومشورہ سے راجہ نے کونسل کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ لیا جس میں تمام بودھ فرقوں کی نمائندگی ہو۔ وہ اس چیز کا متمنی تھا کہ بودھ عقیدے سے متعلق پائے جانے والے اختلاف اور تضاد کو ختم کیا جائے۔ راجہ کنشک نے پانچ سو جوگیوں کے قیام کے لئے ایک دھرم شالہ کی تعمیر کرڈالی جنہیں پِٹکا (بودھ متبرک صحیفوں) پر شرح وتفسیر لکھنے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ سوتا پِٹکا کی شرح ایک لاکھ شلوک میں رقم کی گئی۔ وِنایا وِبھاسا، وِنایا کی شرح بھی ایک لاکھ شلوک پر مشتمل ہے اور ابھیدھرما وِبھاسا جس کو کونسل کے اجلاس کے دوران رقم کیا گیا، کی شرح بھی ایک لاکھ شلوک پر مشتمل ہے۔

اس طرح سے بُدھ مت کے چوتھے اجلاس کی کاروائی بودھ صحیفوں کی شرح رقم کرنے تک محدود رہی ہے۔ جیسا کی لگ رہا ہے کہ وہ بودھ صحیفوں کے اُن مندرجات، جن کے اندر بڑی حدتک تمام فرقوں کے مابین یکسانیت پر اتفاق پایا گیا ہے، انہیں خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ سرواستیوادا فرقہ سے تعلق رکھنے والے بودھ جوگی کونسل پر چھائے اور غالب رہے۔ یہ بھی بڑی حدتک ممکن ہے کہ سرواستیوادا فرقہ کے اہم ذیلی طبقے بشمول بودھ مذہب کے اعتدال پسند طبقوں سے تعلق رکھنے والے جوگیوں کی خاصی تعداد کونسل میں شامل رہی ہے۔ اس بات کی کوئی گواہی نہیں مل رہی ہے کہ آیا مہایان بودھ فرقہ کی اجلاس کی کاروائی میں شرکت رہی ہے کہ نہیں۔ جیسا کی مانا جاتا ہے کہ یہ فرقہ منصۂ شہود پر ناگ ارجن کی ولادت پر آیا ہے اور واضح رہے کہ ناگ ارجن کی ولادت کونسل کے اجلاس کے بعد ہوئی ہے۔ راج ترنگی میں درج تذکرہ کے مطابق ناگ ارجن کی سلطنت کا دبدبا تُریسکا راجاوں کی حکومت کے بعد رہا ہے۔

ہیونگ سانگ کے مطابق معاہدوں کے طے ہونے کے بعد انہیں تانبے کی تختیوں پر لکھ کر پتھر کے بنے ہوئے صندوقوں میں رکھا گیا اور پھر ان صندوقوں کو گنبد نما یادگار خانقاہوں میں جمع رکھا گیا جو اسی غرض کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ کیرن نامی مورخ کا کہنا ہے:

''بدھ مت کے تیسرے کونسل کی امتیازی شان یہ رہی ہے کہ اسے بودھ مذہب کے مختلف فرقوں کے مابین طویل عرصہ سے چلی آ رہی آپسی رسہ کشی اور جنگ و جدل کا خاتمہ کر دیا لیکن نئی امنگوں اور آرزوں کے نمودار ہونے سے بُدھ مت کو محفوظ نہیں کر سکا۔ اگر چہ پوری تفصیل مبالغہ آرائی پر مبنی لگ رہی ہے لیکن شمالی خطے کے بودھوں کے اندر پائی جانے والی چوتھے کونسل سے متعلق تاریخی استناد و اعتباریت کی روایات کو متلعقاً نا قابل قبول گردانا کوئی تُک نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے بیلجم مورخ و محقق لا والی پوسن کی اس رائے کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ چوتھے بودھ اجلاس کا انعقاد بظاہر ایک معذرت خواہانہ خود ساختہ ایجاد ہے''۔

ہیونگ سانگ نے چوتھے بودھ اجلاس کے انعقاد کے وقوع کو پانچ صدیاں گزرنے کے بعد لکھا ہے اور تبّتی تاریخی دستاویزات کے اندر بُدھ مت کے چوتھے اجلاس کے انعقاد کے شواہد اسے بھی بعد کی بتائی گئی ہے۔ یہ تاریخی شواہد و حقائق سرے سے ہی مسترد کرنا فہم و شعور سے پرے کی بات ہوگی۔

یہ بات قابل تعجب ہے کہ ہیونگ سانگ اور تبّتی تاریخی دستاویزات یہ بیان کرنے سے برملا طور قاصر رہے ہیں کہ اجلاس کی کاروائی اور روداد کس زبان اور رسم الخط میں تصنیف کی گئی ہیں۔ یہ گمان کرنا کوئی انہونی بات نہیں ہوگی کہ اجلاس کی کاروائی سنسکرت زبان میں ریکارڈ کی گئی ہو۔ اس طرح سے چوتھا بودھ اجلاس بُدھ

مت کی تاریخ میں عہد ساز واقعہ تصور کیا جاتا ہے جسے بودھ صحیفوں کی زبان سنسکرت بن گئی اور سنسکرت زبان میں بودھ عقیدے کی شرح وتفسیر ہونے کا آغاز ہو گیا۔تمام تاریخی کُتب و دستاویزات اس بارے میں خاموش ہے کہ تیسرے بودھ کونسل میں بودھ متبرک صحیفوں کی تصحیح ونظرثانی کے لئے کس اصطلاحی زبان ولغت میں کی گئی ہے۔اس خاموشی کا ہرگز یہ مفہوم ومعنی نہیں نکالا جانا چاہئے کہ چینی شرکاء کو بودھ ضابط و قانون کے بارے میں کوئی رائے نہیں رکھتے تھے جو دوسری زبانوں کے برعکس سنسکرت میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ تاریخ کا ایک نامعقول شاخسانہ ہے کہ قدیم بُدھ مت کے مذہبی قوانین وضوابط جیسے ''تریپٹکا کا'' علی الخصوص جو آج تک محفوظ رہی ہے کو صرف سنسکرت زبان کے ترجمے سے جانا جاتا ہے۔مورخ کیرن کی یہ رائے بڑی محتاط غوروفکر کی متقاضی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شاید یہ تندخو ومتشدد مذہبی تعصب کے خلاف ایک انتباہ بھی ہے۔

ضمیمہ(اوّل).....(APPENDIX 1)

سیلون(سری لنکا)میں بُدھ مت کے اجلاس:

مہاوامسا اور دیگر سیلون (سری لنکا) کی تاریخی روایات کے مطابق سری لنکا میں بُدھ مت کے تین اجلاس منعقد ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا اجلاس راجا دیوانامپیا تیسا(247-207 B.C) کے حکومتی عہد کے دوران آدرجوگ اریتھا تھیرا کی صدارت میں منعقد ہوا ہے۔کونسل کا اجلاس اشوکا کے بیٹے تھیرا ماہندا کی قیادت میں بودھ پادریوں کی سیلون جزیرے میں آمد کے بعد منعقد ہوا ہے۔بودھ تاریخی روایات کے مطابق ساٹھ ہزار بودھ جوگیوں نے اجلاس میں شرکت کی اور تھیرا ماہندا کی خواہش پر آدرجوگ اریتھا تھیرا نے مقدس بودھ صحیفوں کا پاٹھ سُنایا۔تھیرا اریتھا کو تھیرا ماہندا کا پہلا سنہالی (سری لنکائی) تھیرا اور ساتواں اکاریا پرمپرا (سلسلہ

اساتذہ) تصور کیا جاتا ہے۔انوررادھاپورا کے تھوپاراما مقام پر اجلاس کا انعقاد کیا گیا ہے۔تاہم دوسرا کونسل جوراجاواتا گامانی ابھایا (۱۰۱۔۷۷ق م) کے دورحکومت میں منعقد ہوا ہے کوتھیراوادا بودھ مکتب فکر چوتھا بودھ اجلاس تصور کرتا ہے۔البتہ ہندوستان اور دیگر علاقوں کے بودھ پیروکار کنشک کے دوحکومت میں منعقد کئے گئے کونسل کو بُدھ مت کا چوتھا اجلاس مانتے ہیں۔سنہالی روایات کے مطابق کونسل کے دوران نہ صرف ترپٹکا کا اعادہ کیا گیا بلکہ اس کے شرح وتفسیر کی تصحیح وتجدید اور پھر مضامین ومتون کے حساب سے اس کی ازسرنوترتیب بھی دی گئی ہے۔کہا جاتا ہے کہ بودھ مذہبی عملیات میں درآئے خرافات،ثقافت وتمدن متاثر ہونے، مادہ پرستی کی طرف بڑھتے رجحان، مسلسل قحط اور جنگیں برپا ہونے کے نتیجے میں عام لوگوں کے اندر رونما اخلاقی پستی وتنزلی کو دیکھ کر فاضل مہاتھیراوں نے کونسل کے انعقاد کا فیصلہ کیا تاکہ تمام بودھ مذہبی قواعد وضوابط اور شرح وتفسیر کو باقاعدگی سے مرتب ومنظم کر کے صفحہ قرطاس پر لایا جاسکے۔کونسل کے اختتام پر متون وعبارتوں بشمول اتھا کاتھا کو کرتل کے پتوں پر رقم کیا گیا اور ان شاستروں کی حساسیت اور احتیاط کو مدنظر رکھ کر سو سے زیادہ بار پروف ریڈنگ اور تصحیح کے مراحل سے گزارا گیا۔مہاتھیرا راکھیتا کی صدارت میں کم وبیش پانچ سو فاضل بودھ جوگیوں نے مذکورہ سوچ بچار اور تصحیح وتالیف کے اجلاس میں شرکت کی۔اسے الووہیہارا یا الوکا وہیہارا کونسل کہا جاتا ہے چونکہ یہ کونسل سیلون ماٹیل نامی گاوں میں الوکا غار کے پاس منعقد کیا گیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس اجلاس کا بیشتر حصہ راجا کے پردھان کی حمایت سے منعقد کیا گیا تھا۔

تقریباً ایک صدی پہلے 1865 عیسوی میں ایک اور اجلاس سری لنکا کے رتناپورا کے مقام پر عالی المرتبہ ہکادیوی سری سومنگالا کی صدارت میں منعقد کیا گیا ہے۔یہ کونسل اداما لا گوڈا کی سرپرستی اور حمایت سے پانچ مہینوں تک جاری رہی۔

ضمیمہ (دوئم).....(APPENDIX 2)

تھائی لینڈ (سیم) کے اجلاس:

تھائی لینڈ کے شاہی مُنی سومدج پھرا وانارات نے راما (اول) کی دور حکومت میں لکھی گئی اپنی (سینگیتی وامسا)، (پاٹھ) اُچارن کی تاریخ میں بُدھ مت کے منعقد ہوئے کل اجلاسوں کی تعداد نو بتایا ہے۔ اس کے مطابق ان میں سے پہلے تین اجلاس بھارت میں، چوتھی، پانچویں، چھٹی اور ساتویں سری لنکا میں اور آٹھویں اور نویں تھائی لینڈ میں منعقد ہوئے ہیں۔ پانچ اجلاس بشمول سری لنکا کی پہلی دو اجلاسوں کی تاریخ من وعن وہی ہے جو مہاوامسا اور دیگر سنہالی روایات میں درج ہے۔ بقیہ دو کونسل جیسا کہ سینگیتی وامسا میں بیان کیا گیا ہے کہ حقیقی معنوں میں کونسل نہیں تھے۔

(سری لنکا میں) چھٹا اجلاس:

سینگیتی وامسا میں درج تفصیل کے مطابق چھٹا بودھ اجلاس راجا مہانامہ کے دور حکومت میں منعقد ہوا ہے۔ کونسل کے دوران صرف بودھ صحیفوں کی شرح وتفسیر کو سنہالی اور (پالی) مگادہی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ ترجمہ کاری کا کام نامی گرامی بودھ عالم فاضل بھادانتا بُدھا گھوسا نے انجام دیا۔ واضح رہے کہ بھادانتا بُدھا گھوسا کے علم وفضل کی جانچ اور پرکھ سری لنکا کے معروف جوگیوں نے پہلے ہی کر رکھی تھی۔

(سری لنکا میں) ساتواں اجلاس:

کہا جاتا ہے کہ ساتویں اجلاس کے دوران مہاتھیرا کی ترپیٹکا کی شرح وتفسیر کا صرف اعادہ اور نظر ثانی کی گئی اور آخر پر آدرجوگ مہا کاسا پا کی سرپرستی میں ترپیٹکا کا کو پڑھ کر سُنایا گیا۔ یہ کونسل (1587 B.E) راجا پاراکراماباہو اعظم کے

دورحکومت میں منعقد ہوا ہے۔شاہی محل میں منعقد کی گئی مذکورہ کانفرنس ایک سال کے عرصہ تک جاری رہی۔

(تھائی لینڈ میں) آٹھواں اجلاس:

تھائی لینڈ میں بُدھ مت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے شمالی تھائی لینڈ کے راجا سری دھرما چکرورتی تلاکا راجادھراجا نے اپنی سلطنت کی راجدھانی چینگمائی میں کونسل کا اجلاس طلب کیا۔کونسل کا اجلاس مہابودھی آراما نامی جگہ پر دو ہزار قبل مسیح سے لے کر دو ہزار چھبیس قبل مسیح کے درمیان منعقد ہوا ہے جو ایک سال کے عرصہ تک جاری رہا۔اجلاس میں تھائی لینڈ کے تمام ذی فضل ووقار بودھ جوگیوں نے شرکت کی ہے۔

(تھائی لینڈ میں) نواں اجلاس:

یہ اجلاس(2331 B.E) میں بینگ کاک شہر میں تھائی لینڈ اور پڑوسی سلطنت کے مابین جنگ واقع ہونے کے بعد منعقد ہوا ہے۔تھائی لینڈ کی قدیم راجدھانی ایوتھیا(ایودھا) آگ کی واردات میں تباہ ہوگئی تھی اوراس ہولناک آگ کی زد میں کُتب خانہ اور بہت کتابیں اور تری پِٹکا کے نسخے آکر خاکستر میں تبدیل ہو چکے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ بودھ برادری اور بھائی چارہ طویل آپسی رسہ کشی اور جنگ و جدل کے نتیجے میں تتر بتر اور اخلاقی پستی کا شکار ہوا تھا۔راجا راما اول اور اس کا بھائی بودھ عوام کی اخلاقی تنزلی اور پستی کو لے کر بہت مضطرب اور فکرمند تھے۔انہوں نے اپنے ہم خیال لوگوں اور برادری سے صلاح مشورہ کر کے کونسل کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ لیا تا کہ بودھ عقائد اور اخلاقی اقداروں کو از سرنو بحال کیا جا سکے۔218 فاضل جوگی اور 32 بودھ اسکالر شاہی سرپرستی میں جمع ہوگئے اور ایک سال تک تری پِٹکا کا اُچارن جاری رکھا۔اس کونسل کے دوران اور بعد ہی تھائی لینڈ میں بُدھ مت کی تجدید و احیاء کی شروعات تیزی سے آگے بڑھیں۔بودھ خانقاہوں اور مندروں کی مرمت

از سرِ نوتعمیر کی گئیں۔لوگوں کے بودھ مذہب کی تئیں ذوق وشوق دیکھ کر کئی ایک نئے مندر اور بودھ خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔

ضمیمہ (سوم)......(APPENDIX 3)

برما میں بُدھ مت کے اجلاس:

پہلے تین بودھ اجلاس جو بھارت میں اور چوتھا جو سری لنکا میں منعقد ہوا ہے ان کے اندر مذہبی کُتب وصحیفوں کو پالی زبان میں بڑی تزک واحتشام کے ساتھ تصنیف کیا گیا۔ پانچواں اجلاس اس مقصد کو زیرِ نظر رکھ کر منعقد کیا گیا تاکہ ایک پالی بودھ مذہبی کُتب سے ہم آہنگ نسخہ تیار کیا جا سکے اور پھر اس کی حفاظت کے پیشِ نظر اسے سنگ مرمر کی تختیوں پر رقم کیا جائے۔ یہ عظیم بودھ اجلاس ۱۸۷۱عیسوی میں راجا من دون من کی سرپرستی میں مندالے کے مقام پر طلب کیا گیا جس میں دو ہزار چار سو فاضل بودھ جوگیوں اور اتالیق نے شرکت کی ہے۔ فاضل بودھ پادری جگارا بھیوامسا ، نریندا بھیدھاجا اور سومنگالا سامی نے باری باری اجلاس کی صدارت انجام دی۔ تری پٹکا اُچارن اور سنگ مرمر کی تختیوں پر رقم کرنے کا کام شاہی محل کے اندر تقریباً پانچ مہینوں تک جاری رہا۔ فاضل بودھ مہاتھیروں نے تری پٹکا کے دستیاب مختلف اشاعتوں کو بروئے کار لا کر موازنہ وتقابل کر کے تصحیح ونظرِ ثانی کا کام عمل میں لایا گیا اور بعدازاں ۷۲۹ سنگ مرمر کی تختیوں کو منتخب کر کے ان پر نئی اشاعت رقم کر دی گئی۔

چھٹا عظیم بودھ اجلاس:

چھٹے عظیم بودھ اجلاس کا افتتاح مئی 1954 میں رنگون میں کیا گیا جس میں دنیا کے مختلف ممالک بالخصوص بھارت، سری لنکا، نیپال، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، لاوس اور پاکستان سے آئے فاضل بودھ پادریوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اجلاس کی صدارت آدرجوگ ابھیدھاجامہاراتھا گرو بھادانتاروا تانے انجام دی ہے۔ پانچ سو

بودھ عالم و فاضل پادریوں کو برما سے مدعو کر کے تری پٹکا از سر نو جانچ اور تصحیح کرنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ اسی طرح کے بودھ پادری گروہوں کو دوسرے ممالک کے اندر بھی تری پٹکا کے متن و عبارتوں کی جانچ اور تصحیح کرنے کے لئے منظّم کیا گیا۔ 1954 میں افتتاح کی گئی یہ عظیم اجلاس تفویض شدہ ذمہ داری کی تکمیل تک وائیسا کھا (اپریل/مئی) مہینے کی چاندنی رات 1956 عیسوی تک جاری رہا جو مہاتما بُدھ کی مہاپری نروانا کی دو ہزار پانچ سویں سالگرہ تھی۔ بُدھ مت کے پیروکاروں کا ماننا تھا کہ گوتم بُدھ کی مہاپری نروانا کی یہ سالگرہ بودھ مذہب کے عظیم احیاء کی سنگ میل اور وسیع عالمی امن کا باعث ثابت ہوگی۔

بُدھ مت کے چھٹے اجلاس کے افتتاحی پروگرام جو تین دنوں تک جاری رہا کے مبارک موقعہ پر دنیا بھر سے بشمول بھارت کے قابل قدر اور اہم پیغامات وصول ہوئے ہیں۔ بھارت کے صدر جناب ڈاکٹر راجندرا پرساد نے اپنے پیغام میں یوں گویا ہیں:

> ''جو وائی ساکھا پُرنما پر رنگون میں منعقد کیا جارہے بُدھ مت کے چھٹے اجلاس کے اس تاریخی موقعہ پر میں اپنی تکریمی تہنیت اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میرا خیال و شعور بُدھ مت کے سابقہ اجلاسوں کی یاد سے موجزن ہورہا ہے جو گزشتہ دو ہزار پانچ سو سالوں سے وقفہ وقفہ کے ساتھ منعقد ہوئے ہیں۔ جن میں سے پہلے تین عظیم اور تاریخی اجلاس راجاگرہا، وائیسالی اور پاٹالی پترا میں بالترتیب منعقد ہوئے ہیں۔ یہ تینوں جگہیں جہاں عظیم مہاتما بدھ قدم رنج ہوئے ہیں، بودھ تاریخ میں شہرت یافتہ اور متبرک و پوتر مقام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی دو اجلاس سری لنکا اور برما میں بالترتیب منعقد ہوئے ہیں جہاں مہاتما کی تعلیمات کا درس پڑھایا اور سکھایا گیا ہے۔ ان تعلیمات کا درس آج تک لوگوں نے اپنی زندگی اور تہذیب وتمدن میں زندہ جاوید بنا رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک عظیم

سوچ اور فکر ہے کہ بودھ مذہبی صحیفوں کی نظر ثانی اور از سر نو تصحیح کی جائے تا کہ صحیفوں کو نہ صرف رسم الخط اور برمی زبان میں ترجمہ کر کے خالص اور اصلی شکل میں منتقل کیا جائے بلکہ انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کر کے بودھ تعلیمات کو عام کیا جائے۔ ایک فقیدالمثال بودھ یونیورسٹی کے قیام کا پروگرام بلاشبہ ایک تاریخی قدم ہے جو علم کی ضیاپاشیوں سے ظلمت کے اندھیاروں کو منور کرنے کا مرکز ثابت ہوگا۔ اس اجلاس کا انعقاد مہاتما بُدھ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا تجدید عہد ثابت ہونا چاہئے تا کہ بے راہ روی سے ماند پڑی زندگیوں میں حق و راست گوئی، دیانت وامانت، عدل وانصاف، انسانی مساوات، ہم دردی وغم گساری کا ولولہ سرایت کر جائے۔ یہ اجلاس دور جدید کے انسانوں کے اندر روحانی ارتقاء، اصول پسندی اور اخلاقی اقدار کی اہمیت وضرورت کا احساس اجاگر کرنے کے علاوہ ان کے حصول کی تئیں ذوق وشوق کا حوصلہ بخشے گا۔ ان اصول واقدار کو عام کرنے اور حصول کے لئے از حد لازم ہے کہ جہاں انسان کو مقتضیات زندگی اور مادی ضروریات بہم رکھی جائے وہیں اس کے باطن اور درون خانہ کو روحانی روشنی سے منور کیا جائے اور اخلاقی اقدار اور پارسائی کو اس کے رگ و ریشہ کے اندر جاگزیں کیا جائے، ضمیر کا چوکیدار اس کے اندر بیدار کیا جائے۔ تب جا کے یہ ممکن ہے کہ نفس کی بیماری، طمع ولالچ کا اندھاپن ، دغا وفریب کاری، عناد وکینہ پروری، نفرت وحسد میں شولہ زن انسانی نفسیات جو انسان کے ظاہری و باطنی فتنہ وفساد اور عالم گیر جنگ وجدل اور تنازعات کے وجوہات کی جڑیں ہیں کا تدراک کیا جانا ممکن ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ اجلاس بُدھ مت کی تعلیمات چہار سو عام ہو جانے کا ذریعہ بنے۔ بالخصوص ان ملکوں اور خطوں میں جہاں گوتم بُدھ کا یہ مذہب ہنوز متعارف ہونا باقی ہے۔ ہم اس بات کے متمنی ہیں کہ یہ اجلاس بُدھ مذہب کے پیروکاروں اور ماننے والوں کو اس مذہب کی

تعلیمات اور اوامر ونواہی پر عمل پیرا ہونے کا ناقابل شکست جذبہ سے سرشار ہونے کا باعث ثابت ہوجائے۔ہم دعا گو ہیں کہ یہ اجلاس عالم انسانیت کے لئے فلاح وامن کا پیغام لانے کا ذریعہ بن جائے۔''

وزیراعظم جناب جواہرلال نہرو نے ان الفاظ میں اپنا اظہار خیال کیا ہے؛

'' ایک سال یا اسے کچھ زائد عرصہ پہلے برما کے وزیراعظم نے میرے ساتھ بات کرتے ہوئے کہا کہ بُدھ مت کا ایک عظیم الشان اجلاس رنگون میں منعقد ہونے جارہا ہے۔میرا ذہن ایک دم بُدھ مت کی تاریخ کے گزشتہ عظیم الشان تاریخی اجلاسوں کی طرف منتقل ہوا۔میرے ذہن میں مگادھا کے راجا اجاتا ساترو کی طرف سے راجا گرھا کے مقام پر بلائے گئے پہلے بودھ اجلاس سے لے کر 1871ء میں ماندالی میں منعقد کئے گئے تمام تاریخ ساز بودھ اجلاسوں کی یاد تازہ ہوگئی۔یہ اجلاس بُدھ مت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔اوراب مجھے یہ شرف حاصل ہورہا ہے کہ میں اس عظیم مذہب کے چھٹے اجلاس کے انعقاد کا خیر مقدم کررہا ہوں۔اس اجلاس کا افتتاح تاریخی اہمیت کے حامل دن یعنی گرو گوتم بُدھ کے دوہزار پانچ سویں سالگرہ کے موقعہ پر کیا جارہا ہے۔اس مبارک موقعہ پر چاند اپنی پوری تابناکی کے ساتھ ضیا پاشی کرکے آسمان سے لے کر زمین تک ہر ایک چیز کو پھر منور کردے گی جس طرح آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے گوتم بدھ کے ولادت کے موقعہ اور پری نبھانا کے حاصل ہونے کے دن کائنات کا ذرہ ذرہ چمک اُٹھا تھا۔یہ عالمگیر اجلاس بُدھ مت کے عقائد اور اصول وضوابط کا جائزہ لے گا اور شاید بودھ مذہب کے قوانین کو اپنے ماننے والوں کی تفہیم وتعلیم اور عمل پیرا ہونے کے لئے ازسرنو مرتب کرے گا۔گرو گوتم بُدھ کی شخصیت تمام عقائد اور اصول و قوانین سے بالاتر ہے اور اس کی آفاقی تعلیم اور پیغام سے عالم انسانیت صدیوں سے چہچہارہی ہے۔یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ گوتم بُدھ کی امن پر مبنی تعلیمات کی ضرورت جتنا موجودہ دور کی راہ راست سے بھٹکی اور مصائب

ومشکلات سے دوچار انسانیت اور چہار سو پھیلے ہوئے فساد اور درہم برہم ہوئے دنیا کے نظام عدل و انصاف کو ہے شاید ہی اسے پہلے اتنی رہی ہوگی۔ہم دعا گو ہیں کہ یہ اجلاس امن عالم کی نوید بن کر ہماری نسلوں کے اطمینان اور سکون کا ذریعہ ثابت ہوجائے۔ میں گوتم بُدھ کی سالگرہ پر اُس نابغہ روزگار و عظیم المرتبت شخصیت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور رنگون میں منعقد ہونے والے عظیم بودھ اجلاس کو اپنی تعظیم و نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

☆۔۔۔پروفیسر ٹوکن۔ڈی۔سمی
مترجم:گلزار جعفر

کشمیر میں چوتھی عالمی بودھ کونسل

(کنشک کے عہد میں)

کشمیر کی خوبصورت سرزمین زمانۂ قدیم سے ہی رنگارنگ تہذیبوں اور ثقافتوں کی ایک آماجگاہ رہی ہے۔کئی ادوار پہ محیط یہاں کی تاریخ بودھ مت،شیومت اور اسلامی تمدّن کو ایک مالا میں پرونے کا امتیاز رکھتی ہے۔بالخصوص بودھ مت کے مہایانا فلسفے کے فروغ اور اشاعت میں کشمیر ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔مانا جاتا ہے کہ کشمیر کے مرکز سے ہوتے ہوئے یہ مذہب چین،کوریا اور جاپان پہنچا تھا۔اسی طرح وسطی ایشیا میں بودھ مت کو متعارف کرانے میں کشمیری بودھ عالم کمارا جیوا کا کلیدی رول رہا ہے۔کشمیر میں بودھ دھرم کی تاریخ گنارورمن جیسے کئی ایک عظیم عالموں اور فاضلوں سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے اس دھرم اور نظریۂ حیات کی ترویج میں کئی ایک تاریخی کارنامے انجام دیئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کنشک نے چوتھی عالمی بودھ سبھا 72ء میں کشمیر میں منعقد کرانے کو ترجیح دی ہوگی۔

یہ ایک معلوم اور مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ مشہورِ زمانہ عالمی بودھ کونسل کشمیر میں مشہور کشان راجہ کنشک کے دور حکومت میں منعقد ہوئی تھی۔ بودھ کونسل کی تفصیلات سے پہلے کشان قبیلہ (قوم) کے بارے میں چند ایک حقائق کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

کشان دراصل یوچی (یوہ شہہ) قبیلے کی شاخ ہے جنہیں کانسوصوبے میں قریباً 162 قبل مسیح میں اقتدار حاصل ہوا لیکن ان کا سیاسی عروج بہت کم مدت تک رہا۔ان کے سربراہ اور سالار چانگ لنگ کی لاوشانگ کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ 177 قبل مسیح میں انہیں کانسوصوبے سے ترک سکونت کرنا پڑی اور کہا جاتا ہے کہ وہاں سے وہ کشمیر وارد ہوئے۔یہاں اپنے قدم جمانے کے بعد وہ افغانستان عبور کرنے میں کامیاب ہوئے اور وہیں سے کشان نام سے مشہور ہونے لگے۔

مستند تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ کشمیر عظیم کشان سلطنت کا حصہ رہا ہے۔کشمیر کی تاریخ میں یہ بھی شواہد ملتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں مشہور اسرائیلی بادشاہ اور پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے تخت پر سوار ہوا کے دوش پر وارِدِ کشمیر ہوئے اور سرینگر میں واقع لارجیت پہاڑی پر آ کر رکے تھے جسے اب سلیمان ٹینگ کہتے ہیں۔ انہوں نے کشمیر میں دریائے جہلم (ویتھ) کی رکاوٹوں کو دور کرایا اور بارہمولہ میں پانی کی نکاسی کا صحیح بندوبست کرا کے کشمیر کو سیلابوں سے بچنے میں مدد کی۔کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے وادیٔ کشمیر کے انتظامی امورات کی ذمہ داری ترشتکا شہزادوں ہشک ،جشک اور کنشک کے سپرد کئے تھے۔اس واقعہ کا بیان مورخ رتنا کر کے علاوہ پنڈت کلہن نے بھی اپنی راج ترنگنی میں کیا ہے۔

باز آمدم برسرِ مطلب،کشان دور کو بدھ مت کے فروغ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کہ اس دور میں بدھ مت کو جو سرپرستی حاصل ہوئی اس کی وجہ سے یہ مذہب ترقی اور اشاعت کی اعلیٰ منازل سے ہم کنار ہوا۔مندرجہ بالا تین حکمرانوں یعنی ہشک ،جشک اور کنشک کے دور کے سکّوں کی دریافت سے ہماری تاریخ کے کئی حقائق سامنے آ گئے ہیں۔اس کے علاوہ جشک کا بسایا ہوا شہر جشکا پورہ موجودہ (ذکُورہ)،ہشک کا تعمیر کردہ شہر ہشکا پورہ آج کا (اُشکر) اور کنشک کا تعمیر کردہ

شہر کنشک پورہ آج کے (کانسپور بارہمولہ) کی شکل میں ہمارے سامنے اُس دور کی زندہ مثالیں موجود ہیں ۔ اِن راجاؤں نے مختلف جگہوں پر کئی بودھ وِہار تعمیر کرائے تھے۔مشہورِ زمانہ عالم و فاضل شری ناگ ارجن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ست ریشی ون (جنگل) میں قیام کرتے تھے۔اُن کو بودھ ستوا بھی کہتے تھے۔ پنڈت کلہن اِس گیانی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

''اور ایک بودھ ستوا اس ملک میں ایک عظیم روحانی اوتار کی مانند رہتے تھے اور سادر بدوانا کی جگہ ان کا آسن تھا۔ یہ وہی مہارشی تھے جنہوں نے ہندوستان بھر میں رائج ''ساکا یُگ'' (دور) پر حکمرانی کی''۔

مہاتما بدھ کی موت کے فوراً بعد ہی اُن کے معتقدوں اور پیروکاروں نے راج گرہا میں واقع ایک گھپا میں ایک اہم اجلاس منعقد کیا جس کا مقصد بودھ دھرم کے اصولوں اور عقیدوں کو ایک ضابطہ کی شکل دینا تھا نتیجتاً اس اجلاس میں مشہور بودھ گرنتھ ''تری پٹکا'' مرتب کی گئی۔اس واقعہ کے قریباً ایک صدی بعد بودھ دھرم کے پیروکاروں کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہوئے۔ایک فرقہ مذہب کے ضوابط وقوانین میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ جدت پیدا کر کے آسانی کے حق میں تھا جبکہ دوسرا فرقہ بہت ہی زیادہ قدامت پسند تھا اور کسی بھی قسم کی تجدید اور اجتہاد کا مخالف تھا۔اس اختلاف کو ختم کرنے کے مقصد سے دوسری بودھ کانفرنس ویشالی میں منعقد ہوئی۔ اس کونسل میں 700 بودھ بھکشوؤں نے شرکت کی۔ بودھ عالموں کی اکثریت نے بدھ مت کے قوانین میں کسی تبدیلی سے انکار کیا جس کے نتیجے میں مخالف فرقہ نے علاحدگی اختیار کرتے ہوئے ایک نئے باضابطہ فرقے کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''مہاسنگکا'' رکھا گیا۔

یہاں سے عظیم ''بدھ سنگھ'' 18 چھوٹے فرقوں میں بٹ گیا اور قدامت پسند

فرقہ ''ستھاویرا'' یا ''تھیراویدان'' کے نام سے معروف ہونے لگا۔ بدھ سنگھ جس نے پوری قوت اور کمال کے ساتھ بدھ مت کو پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب عدم اتحاد کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔ انہیں کونسلوں کے پس منظر میں اور قائم شدہ روایت پر اب کشمیر میں کنشک کی کونسل منعقد ہوئی۔

اشوک مشہور موریہ راجہ، جس نے تیسری صدی قبل مسیح میں حکومت سنبھالی، کا دور بدھ مت کی اشاعت اور فروغ کا عہد زرین مانا جاتا ہے۔ اس کی حکومت میں بدھ مت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی۔ مہاراجہ اشوک بدھ مبلغوں کو بیرون ملکوں میں روانہ کرنے، وہار تعمیر کرانے، ستوپا بنوانے اور دیگر مذہبی سرگرمیوں کے لئے نمایاں طور جانے جاتے ہیں۔ بدھ سنگھ میں اتحاد بنائے رکھنے کے لئے اشوک نے بودھ عالموں اور مفکروں کی سبھائیں منعقد کرائیں۔ چونکہ یہ اجلاس سرکاری سرپرستی میں شاہی حکم نامے کے تحت منعقد ہوا تھا، اس وجہ سے کم وبیش 50 ہزار بودھ عالموں (ارہات اور بھکشوؤں) نے اس کونسل میں حصہ لیا تھا۔

اشوک کی اس تاریخی بدھ کونسل میں باقی عالموں کے ساتھ ساتھ کشمیری بودھ عالموں نے بھی شرکت کی۔ قدامت پسند فرقے کی سربراہی موگالی پوتاٹسا اور آزاد خیال بودھوں کے رہنما مہادیوا تھے۔ جبکہ اشوک خود قدامت پسند تھیراویدی بودھ فرقے کے حامی تھے۔ اس افواہ سے خوف زدہ ہو کر کہ اشوک آزاد خیال بودھوں (سروستوادی) کو دریا برد کرادے گا، وہ لوگ شمالی ہند سے بھاگ کر کشمیر کی وادیوں اور پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گئے۔

کشمیر کے سروستوادی بودھ مذہبی امورات میں ترقی پسند، تجدید کے حامی اور اصلاح پسند ثابت ہوئے تھے۔ بقول ہیون سانگ اور تارانا تھ، اُن کا یہی مذہبی رویہ فلسفہ مہایان کے معرضِ وجود میں آنے کا محرک بنا اور غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ راجہ

کنشک نے تاریخی چوتھی بودھ کونسل منعقد کرانے کے لئے کشمیر کی سرزمین کا انتخاب کیا ہوگا۔

مستند بودھ روایتوں کے مطابق کشان راجہ کنشک نے چوتھی عالمی بودھ کونسل کشمیر میں منعقد کرائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کنشک نے پرسوا (پرسِوا کا) کی صلاح پر سبھی بودھ عالموں اور بھکشوؤں کو مدعو کیا تا کہ بودھ گرنتھوں نیز سوتر، ونایا اور ابھیدھرما وغیرہ کے مقدس متون کو جمع کیا جائے اور اُن پر جامع تفسیر لکھی جائے۔ یہ کونسل ''کنڈل ون'' کشمیر میں منعقد کی گئی۔ عوام کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ ساتھ اس تاریخی کونسل (اجلاس) میں 500 ارہات، 500 بودھی ستوا اور 500 مہان پنڈت شریک ہوئے تھے۔

عظیم بودھ مفکر اور سنسکرت عالم اشوا گوشا، جو بدھ چرترا، سندرنندا اور سری پترا پترکارنہ جیسی مشہور زمانہ کتابوں کے مصنف ہیں، نے بھی اس تاریخی کونسل میں شرکت کی تھی۔ کئی ایک خصوصیات کے علاوہ اس سبھا کے سر یہ سہرا بھی ہے کہ سبھی موجود بودھ گرنتھوں اور مقدس کتابوں پر مفصل تفاسیر لکھی گئیں اور اُن تفاسیر کو جمع کر کے دو بڑی کتابوں اُپادیشا شاسترا اور وبھاسا شاسترا کی شکل میں منظر عام پر لایا گیا۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ وبھاسا شاسترا کو چینی زبان میں کشمیرشی کہا جاتا ہے۔ اس کونسل کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ پوری بودھ مت کی تاریخ میں پہلی بار آزادیٔ افکار اور آزادیٔ اظہار کو اصولی طور تسلیم کیا گیا اور ساتھ ساتھ بودھ مت کے سبھی 18 مکتب ہائے فکر کو صحیح اور حق بہ جانب قرار دیا گیا کیونکہ ان سب کی بنیاد مہاتما بدھ کی تعلیمات پر ہے۔ مجموعی طور پر یہ کونسل بدھ مت کے حوالے سے ایک تاریخ ساز اجلاس ثابت ہوا۔ یہیں سے پھر بدھ مت کا فلسفہ کابل قندھار سے ہوتے ہوئے وسطی ایشا اور تبت تک پہنچا۔ یہ کانفرنس ہر اعتبار سے راجہ کنشک کا ایک بڑا

کارنامہ ہےاور کشمیر کی طرف سے ''بدھ سنگھ'' کو پیش کئے جانے والا بڑا تحفہ ہے۔

مزید برآں چینی مورخوں کے ساتھ ساتھ باقی ماہرین تاریخ نے یہ لکھا ہے کہ اس کونسل میں کئے جانے والے غیر معمولی اور تاریخی نوعیت کے سبھی فیصلے اور قرارداد یں تانبے کے پتروں پر کُندہ کرا کے انہیں ایک ستوپا کے اندر رکھ کر زمین کے اندر دفنا دیا گیا تھا۔البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُشکر، ہارون اور اہان کی جگہوں پر کھدائی کے دوران جہاں کئی سارے بدھ تبرکات برآمد ہوئے وہاں ان تامر پتروں کا کوئی سراغ نہ مل سکا جو آج تک ماہرینِ آثار قدیمہ کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔

تین ہزار اشعار پر مبنی تینوں پیٹکائیں (بدھ متن) کو بھی تانبے کے پتروں پر کُندہ کرا کے ایک وہار میں محفوظ کیا گیا تھا۔اس کونسل کے حوالے سے مشہور چینی سیاح ہیون سانگ کا یہ ارشاد خاص اہمیت کا حامل ہے:۔

> ''راجہ کنشک کے حکم کے تحت کونسل کی پوری عالمانہ کارروائی تامر پتروں پر کُندہ کرائی گئی۔ پھر ایک پتھر کے ساتھ مہر بند کرا کے اُنہیں ایک ستوپا کے وسط میں محفوظ کر کے اُس ستوپا کو کھڑا کیا گیا۔ پھر اُس کے تحفظ اور نگرانی کا بہترین بندوبست کیا گیا تا کہ یہ تاریخی تحفہ دشمن کی نگاہ اور رسائی سے محفوظ رہے۔''

لیکن یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ ہیون سانگ کے اس بیان کو کئی تاریخ دانوں نے یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ یہ بیان محض افسانہ گوئی ہے جس میں تاریخی حقیقت کا فقدان ہے۔ کیونکہ کشمیری تاریخ کے دو اہم ترین مورخین کلہن اور پرامرتھا نے کشمیر کے اس اہم واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

میں نے خود پنڈت کلہن کی راج ترنگنی کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور یہ بات شدت سے محسوس کی ہے کہ مورخ کلہن نے اپنی کتاب میں بہت سارے

تاریخی اہمیت کے حامل واقعات سے صرفِ نظر کیا ہے۔لیکن یہاں پر یہ مسئلہ موضوع بحث نہیں ہے۔اسی طرح پرامر تھا نے بودھ عالم اشواگوشا کا ذکر ایک بودھ کونسل کے حوالے سے کیا ہے لیکن وہاں بھی کنشک کی منعقد کردہ بودھ کونسل کا تذکرہ نہیں ہے۔لیکن کتاب کے خاتمے پر ایک ایسی تحریر یا نشان موجود ہے جس میں کنشک کی اس کونسل کا ذکر ملتا ہے جس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ایک بڑا بودھ اجتماع یہاں پر منعقد ہوا تھا۔غالباً یہ اجتماع اصل بودھ کونسل کے سلسلے میں تیاریوں کا جائزہ لینے کیلئے کیا گیا ہو۔ یہاں پر ایک اور ابہام آمیز نکتہ یہ ہے کہ ایک راجہ (جس کا نام درج نہیں ہے) کے حکم سے جالندھرا کے مقام پر ایک بڑی سبھا بلائی گئی اور اُنہیں بدھ مت فلسفہ و قوانین جمع کرنے کا آدیش دیا۔بارہ سال تک چلنے والی یہ کونسل ہو نہ ہو کشمیر میں بھی کسی جالندھرا نامی علاقے میں منعقد ہوئی ہو۔یا پھر یہ جالندھرا (موجودہ جالندھر) میں ہی منعقد ہوئی ہو اور اختتام پر وہاں کے دستاویزات کو کشمیر منتقل کیا گیا ہو۔بہرحال ہر زاویہ سے کشمیر عظیم اور مشہور کونسل کے حوالے سے تاریخی بیانیہ Narrative کا مرکز ہے۔

ہاں البتہ جہاں ہیون سانگ نے کشمیر میں منعقدہ چوتھی بودھ کونسل کی تفصیل بیان کی ہے تاہم اُنہوں نے اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے جہاں پر کونسل کا انعقاد ہوا تھا۔تاراناتھ کے مطابق یہ کونسل ''کنڈل ون'' نامی جگہ پر انجام دی گئی تھی۔ماہرین آثار قدیمہ کی رائے میں یہ کنڈل ون وہارایا کزل ون ہے یا پھر کونتی لین کی جگہ ہے جو ہارون اور گپکار سرینگر میں ایک پہاڑی ڈھلوان ہے۔کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ کونڈ نامی جگہ جو کلگام میں واقع ہے، وہاں یہ کونسل منعقد ہوئی تھی۔اسی طرح کچھ مورخین کا ماننا ہے کہ یہ کونسل یا اشکورا (بارہمولہ) یا پھر کنیل ون نزد یک بدھ وہارا (بجبہاڑہ) یا پھر آہان (سمبل) میں منعقد ہوئی ہوگی۔چند ماہرین تاریخ کی رائے میں یہ کونسل غالباً سرینگر سے کچھ 64 کلومیٹر دور بارہمولہ اور ہندواڑہ کے درمیان بڑمل کے مقام پر منعقد ہوئی ہوگی۔بڈگام (بدھا گام) کے بارے میں بھی کہا

جاتا ہے کہ وہیں اس عظیم کونسل کی جائے وقوع رہی ہوگی۔ کیونکہ بڈگام علاقے سے بھی بدھ دور کے کچھ اہم تبرکات برآمد ہوئے ہیں۔ اس ابہام آمیز ماحول میں ضرورت اس بات کی ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ یا پھر یونیورسٹی کی طرف سے ان سبھی جگہوں کی ماہرانہ کھدائی کی جائے اور اس بات کا سراغ لگایا جائے کہ یہ بودھ کونسل کشمیر کے کس علاقے میں منعقد ہوئی تھی۔

کتابیات:

1. Greek Legend on Kanishka Coin. Kashmir Gov't Museumu.
2. Mukamal Tareekh-ì-Kashmir. Fauq. also Ratnakara.
3. Raj Tarangni. Kalhana.
4. Hand Book. S. P. S. Museum, Sriagar.
5. Buddhist Culture in Kashmir and Ladakh, F. M. Hassnain.
6. Encyclopedia Britanica. Le Rois Indo-Scythe. Dr ouin .
7. The Hindu History of Kashmir. H. H, Wilson.
8. Ancient India. B. G. Gokhale.
9. Legende de I' Empereur. Pryzyluski.
10. On Yuan Chwang's Travels in India. Watters
11.Buddhism in Pakistan.
12. Taranatka. Trang. Scbiefner. also Chos-hbyun. Bu-ston. Trans, Obermiller.
13. T'oung Pao. B. Laufer.
14. Chos-hbvun. Bu-ston. Trans. E, Obemiller.
15. Hieun Tsiang's Travels in India. trans. Watters.
16. The Dynastic Arts of the Kushans, John. M. Rosenfteld.
17. Excavations at Harwan were done by R. C. Kak; at Ushkur by Daya Ram Sahnin and at Ahan by F. M. Hassnain.

☆محمد یوسف ٹینگ

کنڈل ون کہاں ہے؟
(بدھ مت کی چوتھی عالمی کونسل کے تناظر میں)

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ ''کاشمیر'' میں
(علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کُنڈل ون کشمیر کے عجائب خانے کا وہ پُر اسرار اور گنجینۂ راز مقام ہے جہاں مہاراجہ کنشک (150-75ق م) کے زمانے میں بدھ مت کی چوتھی عالمی کونسل منعقد ہوئی۔ اِس میں روایت کے مطابق ہزاروں بودھ فاضلوں، ارہتوں اور عالموں نے شرکت کی۔ اس کی صدارت بودھی ستوا اشوگھوش نے کی اور اس میں عالمی شہرت کے بودھ فلسفی ناگ ارجن نے شرکت کی۔ اس میں اس وقت کی دُنیا یعنی چین سے لے کر مشرقِ بعید افغانستان، ایران، ترکستان کے علاوہ برصغیر سے مندوب آئے تھے۔ یہ کانفرنس چھ مہینے جاری رہی اور اسی میں بُدھ مت کے صحیفے ''تِر پیتکا'' کا وہ متن منظور کیا گیا جو بدھ مت کے مقبولِ عام مکتبِ فکر یعنی مہایان کا سرچشمہ فیض ہے۔ اُس سے پہلے یہ متن تیار کرنے کے لئے ہندوستان کے تین مقامات پر ایسی تین کانفرنسیں منعقد کی گئی تھیں لیکن وہاں اتفاق رائے پیدا ہونے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی.....بعض لوگوں نے ہاروَن سرینگر کو اِس کا مقام وقوع قرار دیا تھا اور وہاں پر پنڈت رام چند کاک نے بڑے معنی خیز آثار بھی دریافت کئے۔ لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ ہارون

''ہُن یان'' کے مکتب کا مرکز تھا اور وہاں ایسا نہیں ہوا۔ یاد رہے کہ ''ہُن یان'' اب سری لنکا اور برما تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ البتہ ''ہُن یان'' کی یہ خوبی قابلِ ذکر ہے کہ اُس میں گوتم بُدھ کی مورتی پوجا خارج از بحث ہے۔

''کُنڈل ون'' کی تلاش برابر اِس کانفرنس کے انعقاد کی خبر پھیلنے کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہاں پر روایت کے مطابق تانبے کی وہ تختیاں کسی زیرِ زمین گنجینے میں موجود ہیں جن پر ''تری پٹکا'' کی عبارت درج کی گئی۔ اُس وقت ابھی کاغذ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے کاغذ ایک ناپائیدار شے ہے۔ اِس کے مقابلے میں تانبا ایک ہمیشہ بہار شے ہے۔ اِنسان نے تانبے کو لوہے سے بہت پہلے دریافت کر لیا تھا۔ اہرامِ مصر کے بنانے والوں نے (۳۵۰۰۔۳۰۰۰ ق م) میں اس کے پتھر تانبے کے اوزاروں سے ہی تراشے تھے۔ تانبے کی ایک اور خوبی اُس کی لچک ہے۔ اس کے علاوہ تانبا مٹی کے نیچے بھی رہے تو اِس میں زنگ نہیں لگتا۔

ہمارے ''کنڈل ون'' کے متعلق بھی یہی قیاس ہے کہ یہ برآمد ہو تو وہاں تانبے کی تختیوں پر کندہ عبارت ہی ملے گی۔ جو ہزاروں ایسے Copper Plates کی صورت میں ہوگی جیسے ہندوستان کے ہر بڑے میوزیم خاص طور دِلّی کے نیشنل میوزیم میں رکھے ہوئے ملتے ہیں یہ ملک کے مختلف قدیم تہذیبی مراکز کی Excavations کے وقت دریافت ہوئے تھے۔

کنڈل وَن کا نام لئے بغیر اِس کا تذکرہ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے (۳۴۔۶۳۱ مسیحی) میں کیا تو اس وقت وہ کشمیر میں موجود تھا اور کشمیر کا پہلا مستند سفر نامہ اُسی کا ہے۔ جب ''کنڈل وَن'' میں ''تری پٹکا'' کا بھومی کرن کیا گیا تو اس وقت بدھ مُت کا سورج اپنے نصف النہار پر تھا اور قیاس یہ ہے کہ اِس پر جو ستوپا یا وِہار بنا تھا وہ اُس وقت ایک عالمی زیارت گاہ رہی ہوگی۔ رنگ اور رونق کا مرکز۔ لیکن تاریخ کی

معشوقہ بڑی ہرجائی ہے اور اِسے نئے دوستوں کے نا آشنا پلنگ بہت پیارے لگتے ہیں۔ بقولِ حافظ شیرازی ع

''ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

(یہ بدچلن تو ہزار خاوندوں کی دُلہن ہے)

چنانچہ چند صدیوں میں ہنوں (Huns) کی بُدھ بادشاہوں کی تسخیر کے بعد ''کنڈل وَن'' وِہار پر بھی تخت وتاراج کے سایئے لہرانے لگے۔ بُدھ راہبوں نے اِس کا مقابلہ کرنے کے لئے خاموشی اور راز داری کا مشکوک خیمہ گاڑھنے کی مصلحت کی۔ ''کنڈل وَن'' کے بارے میں سرگوشیوں میں بات کرنا شروع ہوئی۔ بُدھوں کی تعذیب اور تعزیر شروع ہوگئی۔ اُن کے بنائے ہوئے وہار، ستوپا یا چیتیہ وغیرہ ڈھائے جانے لگے بلکہ خود بُدھوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ کشمیر میں بُدھوں اور شیو پرستوں کے درمیان خوں خوار لڑائیاں ہوتی رہیں..... اِسی لئے ''کنڈل وَن'' وِہار اُن کی زبانوں سے اُتر کر اُن کے دِلوں کی گپھاؤں میں پناہ گزین ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہیون سانگ یہاں آیا تو اُس نے بھی اِس کی بات کرتے ہوئے اِس کے نام اور مقام کی طرف اشارہ کرنا دھرم کے مفاد میں نہیں سمجھا ..... بعد میں ''کنڈل ون'' کا نام ہمیں تبّتی بودھ لاما تارانا تھ کی یادداشتوں میں مِلتا ہے۔

''کنڈل ون'' وہار کی بات ہی کیا ہے۔ ہندو راج کے طویل دور میں بودھوں کے شہر کے شہر حافظے سے اُتار دیئے گئے۔ جس زمین پر کپل وستو کے شاکھیہ مُنی نے بُدھ مت کے اصولوں کا دھرم چکر شروع کیا تھا، وہاں بدھوں کا وجود گھٹ ہی نہیں بلکہ مِٹ کے رہ گیا اور ''بُدھم شرنم گچھامی'' کی صدائیں چین، کوریا، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، جاپان، فلپائن وغیرہ مُلکوں سے ہی نشر ہوتی رہیں۔ کشمیر میں اور بھی بُرا ہوا لیکن یہاں بدھ پروہتوں اور ارہتوں نے بدھ کی سونے، چاندی، چندن اشٹ دھاتو (Eight

(Metalled پتھر، مرمر وغیرہ کی مورتیاں چوری چھپے تبت وغیرہ بھیجنا شروع کردیں جو اس وقت بھی وہاں کے وہاروں میں محفوظ ہیں۔لیکن ''کُنڈل ون'' کے تامر پتر کیسے اور کس شمار میں بھیجے جاسکتے تھے۔وہ اپنی جگہ ہی گڑھے کے گڑھے رہ گئے۔

اُنیسویں صدی میں انگریز اور یورپی آثار شناسوں کننگھم ،ہیوگل اور کئی دوسروں نے بھی بہت سے آثار نکالے لیکن اِس کو کسی بزرگ کا شراپ لگ گیا تھا۔لہٰذا یہ کسی کے ہاتھ نہ آیا.....ایک روایت کے مطابق خود کنشک کی وصیت تھی کہ روشنی کے اِس چشمۂ آفتاب کا فیض کشمیر سے ہی دُنیا کو ملنا چاہئے .....بیسویں صدی میں جب کشمیر میں محکمۂ آثار قدیمہ قائم ہوا تو دیا رام ساہنی اور رام چند کاک جیسے ماہرین نے اس کے لئے جستجو کی لیکن ؎

نکل گیا تھا وہ کوسوں دِیارِ حرماں ہے

بیسویں صدی میں شاعر کشمیر مہجور کو بھی اس کی تلاش کی للک لگ گئی ۔مہجور صاحب تو اچھے شاعر تھے ہی،لیکن اُن کو کشمیر کی تاریخ اور آثار سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اگرچہ اُن کا تاریخ کا درک کچھ اوپری سا تھا لیکن ''کنڈل ون'' اُن کے اردگرد بھی کنڈلی مار کر اُنہیں اپنا قیدی بنا گیا.....اِس کی دوسری اور چھوٹی سی وجہ یہ تھی کہ ایسے خزانوں میں عموماً سونے چاندی کے بھی بھنڈار ہوتے ہیں کہ یہ شردھا اور عقیدت مندی کے جذبات سے ایسے بُت کدے تعمیر کرادیتے ہیں جس کا اظہار حال ہی میں کیرالہ کے ایک مندر کے چرچے سے ہوا جہاں ٹنوں سونا چاندی اور ہزاروں اشرفیاں موجود ہیں.....بہرحال یہی وجہ تھی کہ یہ جگہ اُن کی ننھیال اور بعد میں اُن کے اکلوتے فرزند محمد امین ابن مہجور کی سسرال شوپیان کے نزدیک بابہ نارگاؤں میں تھی۔اُن کا بچپن اِسی خوبصورت علاقے میں بسر ہوا۔اس لئے اُن کے کلام میں مقامی خوبصورت مقامات اہرہ بل،کونگہ وٹن،یارون،بلہ پور وغیرہ کے نام بکثرت استعمال ہوتے ہیں

اور ''ہیمال ناگرائے'' اِسی علاقے کی تمثیل ہے جس کا وہ مزے لے لے کر ذکر کرتے ہیں۔ اُن کے زمانے میں اُنہیں موجودہ یارِوَن جو ایک ملحقہ جنگل کے دامنوں سے کثرت سے مورتیاں اور قدیم ضربیات (coins) ملتے رہے۔ جن میں زیادہ تر مہاراجہ کنشک کے دور کے تھے۔ اُن میں ایک ایسی Terra cotta بُدھ مورتی ہے جو دھیان مُدرا میں ہے۔ مگر اُس کی پشت پر ایک وہار کا خاکہ بھی لکیروں سے بنایا گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک گاؤں کا نام آج بھی ڈلوَن ہے۔ یہ پکھر پورہ کے نواح میں ہے اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ Dulwan سے پہلے کے چار اکھشر وں والی Kund اِصطلاح امتدادِ زمانہ سے گر گئی ہے۔ اِسی طرح اس کے اِردگرد کے بہت سے گاؤں اب بھی اِس کی بودھ اصل کا سُراغ دیتے ہیں مثلاً یچھ (یکھشا) گوز، بوٹہ مرن، دیور، وید پورہ، گپت پورہ، شری مال وغیرہ.....ظاہر ہے کہ یارِوَن ہی گذرے زمانوں کا کنڈل وَن ہے۔

''کنڈل ون'' کا یہ وسیع اور ہموار جنگل ایک عالمی کانفرنس کے لئے بڑی مناسب جگہ تھی۔ یہ اُس سڑک پر واقع ہے جِسے سترہویں صدی کے بعد مُغل بادشاہوں کی کشمیر میں آمدرفت کے راستے کی مناسبت سے مغل روڈ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ مغلوں سے بہت پہلے کشمیر آنے کی بڑی گزرگاہ رہا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق آریاؤں کا ایک قافلہ اسی راستے سے کشمیر میں داخل ہوا کہ پیر پنچال کا نام اُن کے ایک قبیلے ''پرو'' سے ہی اپنا نام حاصل کرتا ہے۔ بعد میں کنشکِ اعظم بھی اسی راستے کشمیر میں آیا اور وہ ظالم اظلم بادشاہ بھی جس نے اسی راستے پر واقع ایک تنگ گلی ''ہستی ونج'' سے سینکڑوں ہاتھیوں کو پہاڑ سے نیچے پھینکوا دیا تا کہ وہ اُن کی کروٹ کروٹ لُڑھکن کے ساتھ ساتھ اُن کی جنگل شِگاف چنگھاڑ سے لطف اندوز ہو سکے۔ یہی کشمیر کی شاہراہِ نمک یعنی بارہویں صدی کے سنسکرت شاعر کھیمندر کی ''لونا سرنی'' ہے کہ اِسی راستے

سے پنجاب کی کھیوڑہ چٹانی نمک کی کانوں سے کشمیر میں نمک کی نایاب شے لائی جاتی تھی۔ یہ ''نون'' اِتنا قیمتی ہوتا تھا کہ کشمیری اُسے بنفشے کے پھولوں کے تول سے خریدتے تھے۔ جس کا کشمیری نام آج بھی ''ننہ پوش'' ہے یعنی نمک والا پھول۔ اِسی راستے سے بعد میں مغل، پٹھان خالصے اور ڈوگرہ فوجیں بھی کشمیر میں آئیں۔ کشمیر کے شہمیری سلطان اِسی راستے سے راجوری وغیرہ کو کشمیر سے جوڑے رکھتے تھے۔ اِسی کے مغربی جانب آج بھی 'پوشن' گاؤں موجود ہے (اسے پوشیانہ کہنا خواہ مخواہ اسے پنجابیانا ہے) اور پوشن کے معنی ہیں 'پوش کا'۔ پشکر ناتھ کشمیری پنڈتوں کا ایک عام نام ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ کسی پُشکر ناتھ کی ہی یاد دِلاتا ہے۔

یارِوَن یعنی کنڈل ون کے دو جانب سے رنبز آرہ کی دو شاخیں بہتی ہیں۔ لہٰذا یہاں اوپر کے چشموں کے علاوہ پانی کی بھی بہتات تھی اور اِس کی بلندی سے کشمیر کے شاندار نظاروں کا بھرپور لطف لیا جاسکتا ہے۔ اُس وقت کے بُدھ میزبانوں نے بہت خیال انگیزی سے اس مقام کو چنا تھا۔

یہ سارا جنگل ایک گول آکار کا ہے اور کنڈل کے معنی بھی گول کے ہی ہیں۔ یہی کنڈل کشمیر کی مشہور زمانہ کانگڑی کے اندر بھی ہے اور حیدرآباد (دکن) کے شہر کے باہر گول کنڈہ میں بھی جہاں عادل شاہی بادشاہوں کے مقبرے واقع ہیں۔

یہاں پر اس بات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راقم نے کئی بار پہلے اِس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ کنڈل ون کے محلِ وقوع سے واقف ہے اور وہ اِس کی نشان دہی اُس شرط پر کرے گا کہ راشٹر پتی اِس بات کا یقین دلائیں کہ اس عظیم خزانے کی دریافت کے بعد اِسے کشمیر سے باہر نہیں لیا جائے گا۔ جیسا ''برزہ ہوم'' کے آثار اور کتنے ہی کشمیری آثار کے ساتھ کیا گیا۔

اب بقولِ مرزا غالب ''عزیز دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے'' اس لئے اپنی مجبوری کا

احساس کرتے ہوئے میں اپنی تیس برس کی اِس تحقیقی کدوکاوش کا سراغ درج کر رہا ہوں۔لیکن اِس کا مطلب نہیں کہ یارِوَن کے پتھر اور درخت وہاں ڈھونڈنے والوں کو تامرپتر بھینٹ کرنے کے ساتھ ساتھ وازہ وان کھلائیں گے۔اُنہیں اس سلسلے میں نہایت سائنسی انداز کے Excavation سے کام لینا ہوگا۔اور پھر بھی ممکن ہے کہ وہاں صرف تمنا ہی کا دروازہ کھلے اور اُس سلسلے میں وہاں سائنسی انداز سے تازہ ٹیکنالوجی کی مدد سے Excavation کرنی ہوگی۔پھر بھی ممکن ہے کہ قدیم مِصر کے بہت سے آثار کی طرح اُنہیں ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ نظر آئے اور علیٰ ہذالقیاس۔کیوں کہ یہ عظیم تبرک بے شمار پردوں اور دروازوں کے پیچھے رہنے کو ہی اپنی عزت وعصمت کا راز سمجھتا ہے۔ ع

آخر میں ہر در کے جو دروازہ بند ہے
مجھ کو اُسی کے عقب میں رہنا پسند ہے

مجھے اُمید ہے کہ اگر اس زلیخائے زمانہ نے اپنا گھونگھٹ کھول دینے پر آمادگی دِکھائی تو اپنے دستِ ہوس کو دراز کرنے سے پہلے کنشکِ اعظم کے اِس ارشاد کو زیرِنظر رکھیں کہ اِسے کشمیر سے باہر نہیں لیا جائے بلکہ آثاریات کے بین الاقوامی دُستور کی پیروی میں اِس کو اِس کے اصل مامن اور اپنی ہزاروں سال کی پناہ گاہ پر ہی رکھا جائے جہاں اِس کی حفاظت کا بھی مناسب بندوبست ہو،اس کی نمائش کے بہترین انتظامات ہوں اور اس کے لئے اُسی قسم کا ایک شاندار عجائب گھر تیار کیا جائے۔

●●●

☆.....پروفیسر جہانگیر دانش

شاردا.....بدھ ازم کی یادگار آماجگاہ

کشمیر میں بدھ مت کا دَور ایک طویل اور پُر امن دور رہا ہے۔ جہاں ایک طرف لداخ اور تبت تک براستہ کشمیر بدھ مت کے پھیلاؤ کا سلسلہ تھا وہیں گلگت، مونجی، ہُنزہ وغیرہ جنہیں آج کل پاکستانی حکام شمالی علاقہ جات کے نام سے پکارتے ہیں کو کشمیر سے ملانے کا ایک اور راستہ بارمولہ سے کپواڑہ، کلاروس اور پھر ایک درہ موسومہ سنجلی گلی بلندی قریب (۹۰۰۰) نو ہزار فٹ سے گزر کر وادیٔ کشن گنگا (وادیٔ نیلم) میں داخل ہوتا ہے۔ سنجلی گلی سے ہوکر پیدل راستہ دریائے نیلم کے بائیں کنارے پہنچ کر شمالی مشرقی سمت دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کوئی ۸۹ میل پہنچ کر ایک میدان تک پہنچتا ہے۔ یہاں دریائے کشن گنگا کسی بہت پرانے وقت میں بل کھاتا ہوا بہتا ہوگا کیونکہ اب اس کھلے میدان میں کہیں کہیں پانی سے گھسے ہوئے گول پتھر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی جگہ کا نام ''شاردا'' ہے جہاں بدھ دور میں ایک مشہور دانش گاہ ''شاردا پیٹھ'' ہوا کرتی تھی۔

شاردا کا مقام ایک پڑاؤ اور بیس کیمپ (Base Camp) کی حیثیت رکھتا تھا، کیونکہ وہاں سے آگے گلگت جانے کے دو راستے ہیں، ایک نالہ سرگن کے ساتھ ساتھ اونچی چراگاہوں سے ہوکر یاغستانی علاقہ موسومہ بوڑاوانی (قبائلی نیم آزاد لوگوں کی بستیوں پر مشتمل) ان بلند چراگاہوں سے اُتر کر دریائے سندھ اور دھیر، سوات کی (۱۹۴۲ء سے قبل) نیم آزاد ریاستیں ہوا کرتی تھیں، کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا راستہ شاردا سے دریا کے بائیں کنارے ہوتا ہوا موضع کیل کو جاتا ہے۔ کیل بہت بڑا گاؤں ہے اور جہاں رومن نسل

کے وہ فوجی لوگ آباد ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم نے جب اٹک سے بڑھ کر درہ خیبر (ایرانی شاہراہِ ریشم جو سیکیا نگ چین کو وادیٔ سندھ سے ملاتی ہے) کا رخ کیا تو کچھ فوجی لوگ یا تو تھک کر کنارہ کش ہوئے یا مہم جوئی میں راستہ سے بھٹک کر درہ شونٹھر سے وادیٔ کشن گنگا میں داخل ہوئے۔ سامنے دریا کی لہریں اور شمال مشرق کی طرف کوہ نانگا پربت کی سنگلاخ ڈھلوانیں دیکھ کر یہ لوگ وہاں سستانے کو ٹھہرے اور یہاں کے پُرفضا ماحول میں ایسے بیٹھے کہ آج تک اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اسی کیل کی بستی سے ۲،۳ میل اوپر دریائے کشن گنگا کا ایک معاون نالہ شوہنر آملتا ہے اور اسی نالہ کے ساتھ ساتھ راستہ اوپر بلندیوں کی طرف نالہ کے ٹاپ پر پہنچتا ہے۔ یہاں سے گزر کر دوسری طرف علاقہ چیلاس جو دریائے سندھ کے بائیں جانب نانگا پربت کے شمالی ڈھلوانوں پر مشتمل بونجی، گلگت تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈوگرہ، برٹش دَور میں براستہ مچھل اس گلی کو سر کر کے بانڈی پورہ وغیرہ کو فوجی نقل وحمل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

جغرافیائی محل وقوع اور شاردا پیٹھ کے مقام سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کپواڑہ، سنجلی گلی، شاردا، کیل، شونٹھر، چیلاس، گلگت اور وہاں سے آگے شاہراہِ ریشم سیکیانگ، چین تک جاتی ہے۔ چونکہ بدھ مت اپنے عروج میں تمام شمالی مغربی ہندوستان، افغانستان اور چین، تبت پر پھیلا ہوا تھا۔ بدھ بھکشو جہاں پہنچے ڈیرہ جما کر وہاں رہتے اور ریاضت اور تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ شاردا پیٹھ ویسی ہی ایک درسگاہ تھی۔ کلہن نے اپنی تاریخی کتاب (راج ترنگنی) میں یہاں ایک مندر کا ذکر کیا ہے۔ مگر مقامی لوگ جو کب کے اسلام قبول کر چکے ہیں۔ آج بھی شاردا کو (شاردا جی) کہہ کر عزت سے اس مقام کو یاد کرتے ہیں۔ ریاست کے ایک محقق اور ادیب موتی لال ساقی، پہاڑی لکھاری شریف حسین اور راقم نے اپنی تحریروں میں یہ واضح کیا ہے کہ پہاڑی زبان کا رسم الخط شاردا لپی، بدھ علماء نے شاردا پیٹھ میں ہی ایجاد کیا۔

شاردا تہذیب، شاردا رسم الخط ..... دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی، قدیم تہذیب و تمدّن کا گہوارہ، ۲ر ہزار سال کی معلوم تاریخ، کبھی علم وادب اور ریسرچ کا مرکز..... آج اپنی شناخت کو ترس رہی ہے۔ ماضی کی رونقیں افسانہ لگتی ہیں۔ تاریخ بکھر چکی ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت مقام ہے۔ مقام آباد اسے ''چوراہا'' قرار دیتی ہے۔ یہ علاقہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر، گلگت بلتستان، کشمیر اور ہزارہ کا سنگھم ہے۔ شاردا سرینگر سے ۱۲۰ کلومیٹر اور مظفر آباد سے ۱۳۰ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ وادیٔ نیلم یوں تو انتہائی خوبصورت وادی ہے لیکن شاردا ایک خوبصورت نگینے کی طرح ہے جس کے چاروں اطراف اونچے اونچے اور گھنے جنگلات سے گھرے پہاڑ ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ دریائے نیلم یا کشن گنگا یا مدھومتی بہتا ہے۔ مدھومتی اس کا قدیم نام ہے۔ ہندوستان میں اس دریا کو کشن گنگا کہا جاتا ہے۔ بدھ مت اور ہندو دھرم میں گنگا کی انتہائی اہمیت ہے۔ گنگا کا دوسرا نام پاکیزہ ہے۔ اہلِ ہنود پورے ہندوستان، نیپال اور سری لنگا سے یہاں آکر اس دریا میں نہاتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس دریا میں نہانے سے وہ پاک ہوجاتے ہیں۔ شاردا کو ہندو سرسوتی بھی کہتے ہیں اور اسے شاردا پیٹھ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شاردا میں بیساکھی کا میلہ بھی لگا کرتا تھا جس میں دور دور سے لوگ آکر شرکت کرتے تھے۔ یوں تو شاردا کا علاقہ متعدد دیہات پر مشتمل ہے، شاردا چک، شاردا گراں، کشن گھاٹی، میدان، چھپران، ڈھوکری، بیلا، لڑی مالٹا، چورناڑ، لچھل، رتہ پانی، کھری گام اور خواجہ سیری اس کا حصّہ ہیں۔ گوتم بدھ (۵۶۳۔۴۸۳ ق م) کے بعد کشمیر میں بدھ ازم پھیلا۔ شاردا میں کنشک (۶۰۔۵۰) نے بدھ ازم یونیورسٹی قائم کی۔ ۱۱ صدی عیسوی کے آخر پر ہرش کے دور میں بدھ ازم کا زوال ہوا اور شیومت کو فروغ ملا۔ اس کے بعد مسلم دور کا آغاز ہوا۔ کہتے ہیں شاردا میں منوں کے قدیم ترین درخت کے نیچے سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ (۸۷۴ھ۔۱۴۲۱ء) کی قبر ہے۔ لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ شاردا کے مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قبر بڈشاہ کی ہی ہے،

البتہ یہ تصدیق ہوئی ہے کہ بڈ شاہ نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد شاردا کا دورہ کیا تھا۔ شاردا کو ہندوازم میں شاردامائی کا نام بھی دیتے ہیں کہتے ہیں یہ دو بہنیں ہیں دوسری کا نام ناردامائی ہے۔ شاردا کے بالمقابل پار ناردا پہاڑ ہے۔ شاردا یونیورسٹی اور مندر کے جو کھنڈرات موجود ہیں۔ان میں استعمال ہونے والا مخصوص پتھر اُسی ناردا پہاڑی سے لایا گیا ہے۔ وہ اس علاقے میں صرف ناردا پہاڑی پر ہی پایا جاتا ہے۔ یہ تعمیرات ،فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ اور شاہکار ہیں۔مندر میں داخلے کے لئے پتھروں کے تختے نما سلیں نصب ہیں۔ ہر ایک زینے میں دو دو پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود یہ سیڑھیاں سلامت اور محفوظ ہیں۔ یہ بڑے سلیقے سے تیار کی گئی ہیں۔ان کی تنصیب بھی منفرد ہے۔عبادت گاہ میں داخلے کے لئے صدر دروازے کا یک حصّہ موجود ہے، جو اِن ہی بھاری تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی چار دیواری ہے جس پر چاروں اطراف سے چھت تھی جہاں رہائشی ہٹ تھے۔ان دیواروں میں ہی پتھر کے حفاظتی کمرے بنائے گئے تھے جن کے اندر پہرہ دار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ یہ کمرے اس وقت بھی موجود ہیں۔ایک طرف کی دیوار بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ یہ نالہ شاردا کی طرف کا حصّہ ہے۔ یہ نالہ بھی اہلِ ہنود کے لئے متبرک ہے۔لیکن شاردا نالے میں آنے والے سیلابوں اور تباہ کن زلزلوں نے یہاں کا جغرافیہ ہی بدل دیا ہے۔ جو کسر بچی تھی وہ پاکستانی اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومتوں کی عدمِ توجہی کی نذر ہوگئی۔ یہاں کی اہمیت کسی مذہب کی عبادت گاہ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ یہ عظیم دانشگاہ تھی جس کا رقبہ اب بھی کسٹوڈین محکمہ کی دستاویزات میں موجود ہے۔ یونیورسٹی کا رقبہ تقریباً ۷۰ کنال اراضی پر مشتمل ہے جو غالباً ۱۹۴۷ء کے مہاجرین کو الاٹ کیا گیا ہے جو کہ سراسر غلط فیصلہ ہے۔ یونیورسٹی کا علاقہ دریا کے دائیں کا کنارے واقع ہے۔ دریا پر کشتیاں چلتی تھیں۔اس پورے علاقے میں دریائے نیلم جیسے ٹھہر گیا ہے۔ کسی بھی جگہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دریا کا رخ کس جانب ہے۔اس

میں کشتی رانی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ٹورازم کے فروغ کے لئے بھی کشتی رانی کی جاسکتی ہے جس کی جانب ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔شاردا نالے کی ایک طرف قلعہ ہے اور اس کی دوسری جانب یونیورسٹی کا علاقہ ہے۔پُل عبور کرتے ہی جس جگہ جامع مسجد ہے وہاں پر رہائشی عمارتیں تھیں جبکہ چبوترہ ابھی بھی موجود ہے۔یہ سلیقے سے تراشے اور جوڑے گئے بڑے بڑے پتھر ہیں۔ایک پتھر کا وزن تقریباً ۲ ہزار کلوگرام ہوگا۔اس کی تعمیر میں سینکڑوں پتھر استعمال ہوئے ہیں۔جنہیں ناردا سے لایا گیا ہے جو یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ناردا پہاڑی کے اوپر میدان ہے، جہاں ایک تالاب ہے۔کہا جاتا ہے کہ شاردا ایک جدید ترین شہر تھا۔کھدائی کے دوران یہاں سے مٹی کی بنی ہوئی پائپیں دریافت ہوئی ہیں جو پینے کے پانی اور ڈرینج سسٹم کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔یہاں ایک بڑا بازار بھی تھا جس میں ضرورت کی ہر شے دستیاب تھی۔سرینگر اور دہلی سے یہاں مال سپلائی ہوتا تھا۔یعنی جدید مارکیٹ اس علاقہ کی دسترس میں تھے۔یونیورسٹی کی ایک بڑی لائبریری بھی تھی جو کتاب ٹیکسلا میں دستیاب نہ ہوتی وہ یہاں سے مل جاتی تھی۔دودنیال نالہ سے یہاں کا رابطہ وادی سے ہوجاتا تھا۔اسی وجہ سے دودنیال نالے کو کاشرناڑ بھی کہتے ہیں۔شمالی کوریا، جنوبی کوریا اور چین کا راستہ گلگت اور کیل سے ہوتا ہوا نکلتا تھا۔کیل سے ایک راستہ اسکردو اور دوسرا مژھل کی طرف وادیٔ کشمیر کو جاتا ہے۔نوری ٹاپ سے ٹیکسلا تک ڈیڑھ دن کا راستہ تھا۔شاردا کا ٹیکسلا سے ایک خاص لنک تھا۔ایک راستہ سرگن، نوری ٹاپ، جھل کھڈ، بابوسر سے ہوتا ہوا چیلاس کو نکل جاتا ہے۔شہاب الدین غوری کیل کے راستے ہی حملہ آور ہوا تھا۔ایک راستہ شونٹھر، رٹو، استور، اسکردو کو جاتا ہے۔ایک راستہ مظفرآباد تاریل، کنگن کی جانب وادیٔ کشمیر کو ملاتا ہے۔سرگن سے راستہ نوری ٹاپ جاتا ہے، نوری ٹاپ سے تاراں کاغان ۹ گھنٹے کا سفر ہے۔

شاردا کا مطلب سنسکرت زبان میں علم کی دیوی ہے۔یہاں کی مناسبت سے ایک

معروف رسم الخط ایجاد ہوا تھا جسے شاردا رسم الخط یا شاردا الپی کہا جاتا تھا جو دیوناگری میں تھا شاردا اور تکری سے ہی گورمکھی نے جنم لیا ہے۔

ڈوگرہ دَور میں یہاں ایک بڑی مورتی رکھی گئی تھی اور مہاراجہ نے حکم دیا اس مورتی کو سرینگر پہنچا دیا جائے۔ لوگ پریشاں تھے کہ کیسے اس بھاری پتھر کی مورتی کو اتنا دور لے جائیں گے۔ مقامی لوگوں نے مشاورت کی دوسرے دن کچھ لوگ راجہ کے دربار میں پیش ہوئے اور چیخ و پکار شروع کر دی اور کہا کہ آپ بھگوان کو لے جائیں گے تو ہمارا کیا بنے گا۔ ہم بھگوان کے بغیر کیسے زندہ رہ پائیں گے۔ یہ علاقہ بھی ویران ہو جائے گا۔ راجہ مان گیا اور کہا کہ ٹھیک ہے اسے یہیں رہنے دو۔ لیکن پھر یہ بھگوان غائب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس میں ہیرے، جواہرات تھے، بعض لوگوں نے اسے توڑ کر نایاب ہیرے، جواہرات لوٹ لئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے دریائے نیلم میں ڈال دیا گیا تھا، مقامی لوگ آج بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے دانشمندی اور حکمت عملی سے معاملہ حل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

معروف مورّخ البرونی اپنی تصنیف ''کتاب الہند'' میں شاردا کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں کہ سرینگر کے جنوب مغرب میں شاردا واقع ہے۔ اہلِ ہند اس مقام کو انتہائی متبرک تصوّر کرتے ہیں اور بیساکھی کے موقع پر ہندوستان بھر سے لوگ یہاں یاترا کے لئے آتے ہیں۔ لیکن برفانی اور دشوار گزار ہونے کے باعث میں خود وہاں نہیں جا سکا۔ وہ لکھتے ہیں کہ کنشک اوّل کے دور میں شاردا وسطی ایشیا کی سب سے بڑی تدریسی درسگاہ (Learning Seat) تھی۔ یہاں بدھ اِزم کی باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ ہیئت، منطق، ریاضی اور فلسفے کی مکمل تعلیم دی جاتی تھی۔ اس درسگاہ کا اپنا رسم الخط تھا جو دیوناگری سے ملتا جلتا تھا۔ اس رسم الخط کا نام شاردا الپی تھا۔ اسی مناسبت سے گاؤں کا نام بھی شاردا ہے۔ اس کی عمارت کو کنشک اوّل نے ۲۴ تا ۲۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ کنشک اوّل

نیپال کی ریاست کا شہزادہ تھا۔ شاردا یونیورسٹی کی عمارت شمالاً جنوباً مستطیل چبوترے کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ عمارت کی تعمیر آج کے انجینئرز کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ عمارت برصغیر میں پائی جانے والی تمام عمارتوں سے مختلف ہے۔ خاص کر اس کے درمیان میں بنایا گیا چبوترہ ایک خاص فنِ تعمیر پیش کرتا ہے جو بڑا دلچسپ ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً ۱۰۰ فٹ ہے۔ چاروں طرف دیواروں پر نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ مغرب کی طرف ایک دروازہ ہے، عمارت کے اوپر اَب چھت کا نام ونشاں باقی نہیں ہے۔ تاہم مغرب سے اندر داخل ہونے کے لئے ۶۳ سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ آج بھی کچھ قبائل ۶۳ زیورات پر مشتمل تاج ہاتھی کو پہناتے ہیں اور پھر اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ ۶۳ کا عدد جنوبی ایشیا کی تاریخ میں مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ بدھ مت کے عقائد سے ملتی جلتی تصاویر اس میں آج بھی نظر آتی ہیں۔ ان اشکال کو پتھر میں کرید کر بنایا گیا ہے۔ اس عمارت کے صحن میں ایک تالاب بھی ہوا کرتا تھا جو آج موجود نہیں ہے۔ کوڑھ امراض میں مبتلا لوگ اس تالاب میں غسل کرنے سے شفا پاتے تھے، چونکہ اس کا پانی دو کلومیٹر دور سے سلفر ملے ہوئے تالاب سے لایا گیا تھا۔

تاریخی شواہد کے مطابق شاردا میں پانچ ہزار افراد موجود رہے تھے۔ شاردا سے کشن گھاٹی تک کا سارا علاقہ آباد تھا۔ کشن گھاٹی شاردا کی مرکزی عمارت سے تین کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ایک پہاڑی کا نام، جسے مقدس تصوّر کیا جاتا تھا۔ یہاں ایک لمبی غار تھی، جس میں ایک بُت بنوایا گیا تھا۔ یہاں ہندو مردوں کو جلایا کرتے تھے اور اس راکھ کو کشن گنگا میں بہا دیا جاتا تھا۔ (موجودہ دریائے نیلم)۔ شاردا ماضی بعید میں ناگا اور دراوڑ قبائل کا مسکن رہا ہے جن کے مذہبی عقائد بدھ مت اور جین مت سے ملتے جلتے تھے۔ شاردا قلعہ کے پس منظر سے لوگوں کی اکثریت نابلد ہے، اسی لئے لوگوں میں اس تاریخی اور تدریسی درسگاہ سے متعلق بڑی دلچسپ کہانیاں مشہور ہیں جو یہاں آنے والوں کو سُنائی جاتی ہیں، جن میں دیومالائی قصّے ہوتے ہیں۔ شاردا میں ایک قلعہ بھی تھا، تاہم آج یہ عمارت پُرانے

کھنڈرات کا نظارہ پیش کرتی ہے اور عدمِ توجہ کا شکار ہے۔ اس کی تعلیمی اور تدریسی اہمیت صرف ایک خواب لگتی ہے۔ شاردا میں میر، نائیک، چوہدری، قوتشی (پٹھانوں کی ایک نسل جن کا سلسلہ بٹگرام علاقے سے ملتا ہے) بٹ، لون، ملک، خواجہ اور شیخ جیسی قومیں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ بدھ اِزم کے حکمراں راجہ کنشک اور اشوک کے زمانے میں یہاں یونیورسٹی قائم تھی لیکن آج تعلیم کے میدان میں یہاں کے مقامی لوگ ہزار سال پیچھے چلے گئے ہیں۔ تاہم تحصیل کرناہ کا وہ حصّہ جو ہندوستان کا حصّہ ہے تعلیمی معیار میں کسی سے کم نہیں۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے وزیرِاعظم چوہدری عبدالمجید نے شاردا کا دورہ کیا اور شاردا یونیورسٹی کو بحال کرنے کا اعلان کیا ہے۔ انہوں نے اراضی سے متعلق بھی جانکاری حاصل کی ہے۔ نہ جانے کب شاردا یونیورسٹی ایک بار پھر دنیا کے نقشے پر اُبھر کر سامنے آئے گی اور مقامی وغیر مقامی عوام کو علم کے نور سے منوّر کرے گی۔ وہاں کی حکومت کو شاردا یونیورسٹی کی جانب توجہ دینی چاہئے۔ جبکہ ہندوستان میں ایک نجی یونیورسٹی شاردا کے نام سے قائم ہو چکی ہے اور نوئڈہ نئی دہلی میں ۱۶۳ ایکڑ اراضی پر شاردا یونیورسٹی قائم کر لی گئی ہے جو کہ عالمی معیار کے مطابق ہے۔ یاد رہے کہ شاردا تحصیل کرناہ کے اُس حصّے میں واقع ہے جس پر پاکستان کا قبضہ ہے۔ شاردا میں چنار کے دو درخت تھے جن میں سے صرف ایک باقی ہے۔ چنار کشمیر کا قومی نشان بھی ہے لیکن منوں کے درخت کا مقامی لوگ اکثر ذکر کرتے ہیں۔ ایک درخت مندر کے صدر دروازے میں ہے جبکہ دوسرا سامنے پارگاؤں میں قبرستان میں ہے۔ یہ بڑا درخت ہے جس کے نیچے قدیم ترین قبر ہے۔ اس قبر کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ہزاروں برس قبل دنیا کا جدید ترین شہر آج اکیسویں صدی میں دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔

شاردا کا قلعہ پانڈوؤں نے تعمیر کیا ہے۔ یہاں ہر سال میلہ لگتا تھا، بیساکھی کے موقع پر خیمے لگتے تھے۔ یہاں پر فوج کی چھاونی بھی تھی۔ ڈوگرے قلعے میں رہتے تھے۔ یہاں کے

زمینداروں سے مویشی خریدتے تھے۔ شاردا میں سیب کے درخت بھی تھے۔ سادھو ہمیشہ موجود رہتے تھے، ایک روایت کے مطابق انہیں بلم کہا جاتا تھا۔ شاردا میں سب سے پہلے ''میر'' اور ''ملک'' آباد ہوئے۔ پھر ''لون'' آئے، ''بٹ'' خاندان بعد میں آ کر آباد ہوئے۔

پرانی مشکل بدھمی (ھندکو) یا (ہنکو) یا ہزاروی یا پہاڑی زبان کو افغانستان کے ہزارہ قبائل جو وقت کی دھارا کے ساتھ ساتھ سلسلہ کوش کے آر پار آباد ہو گئے، اُن کی زبان ہزاروی کو دس ہزار سال پرانی بتاتے ہیں۔ زبان اور اس کے رسم الخط کو متوازن اور آسان بنایا اور مقامی بولی ''ہندکو'' کو ہزاروی زبان کے سادہ الفاظ سے مزّین کیا۔ ہندکو یا پہاڑی زبان کے نامور مورّخ ڈاکٹر نیّر ہیں جن کو ''تاریخِ زبان ہندکو'' لکھنے پر صدرِ پاکستان نے تمغہ امتیاز دیا ہے، کے مطابق دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان کشمیر سے لے کر نیپال تک تمام پہاڑی خطے میں پھیل گئی اور پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کی مشترک زبان بن گئی۔ کشمیر کے آس پاس پہاڑوں میں بدھ مت کے عروج کا زمانہ شاردا رسم الخط والی اس ''پہاڑی زبان'' کے عروج کا زمانہ مانا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب بدھ مت کو زوال آنا شروع ہوا، ہندوستان کے میدانی علاقوں سے بدھ بھکشو بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہوئے، تو کشمیر کی وادی بھی شنکر آچاریہ کے جنوبی ہندوستان سے اُٹھائے ہوئے مذہبی انقلاب سے بچ نہ سکی۔ جب شاردا زبان کے بدھ عالموں اور بدھی ثقافت کو تباہ و برباد کیا گیا تو باری بدھ تحریروں پر پہنچی، یہ بھی جلائی گئیں اور سنسکرت زبان کا دور دورہ ہوا تو کشمیری پنڈت جنہوں نے بدھ مت چھوڑ کر ہندو مت اختیار کیا تو اُن کو سنسکرت زبان سیکھنا مشکل تھا تو انہوں نے ہندو عالموں کو کہا کہ وہ ہندوازم کی مذہبی کتابوں کو شاردا لپی جو کہ ان کی مادری بھاشا ہے میں تحریر کروائیں تا کہ ہندوازم عوام الناس کے لئے سیکھنا اور سمجھنا آسان بن جائے۔ چنانچہ بہت سی ہندو پوتھیں شاردا لپی یعنی پہاڑی زبان سے کافی ملتی جلتی بھاشا میں لکھی گئیں اور اب بھی کہیں

نہ کہیں پنڈت تعلیم یافتہ گھرانوں میں شاردا کے سامنے دریا کے دائیں کنارے جہاں سرگن نالہ نیلم (کشن گنگا) سے ملتا ہے، وہاں سے ایک نالہ اُبھر کر پہاڑوں کی چوٹی تک سرگن نالہ واٹرشڈ بناتا ہے۔اس پہاڑ پر کوئی (۱۴۰۰۰) چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاردا پیٹھ کے بدھ بھکشو وہاں بھی تپسیا (عبادت) کرنے جاتے تھے۔اس بلند جھیل کے آس پاس اکثر ابر اور دھند چھائی رہتی ہے اور اکثر اولے گرتے ہیں۔لوگ اُس تقدس کے اظہار کے لئے جو شاردا پیٹھ سے انہیں ہے اس جھیل کو ''مائی ناردا'' کہتے ہیں۔ چونکہ اس علاقہ میں بدھ مت کا وہ فرقہ براجمان تھا جو بتوں کو نہیں پوجتے تھے اس لحاظ سے تحصیل کرناہ کا علاقہ درادہ کشن گنگا دریا کا درمیانی حصّہ یا وادیٔ نیلم) میں مسلم بزرگ بھی اکثر بڑا گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے اور وضع قطع اور بودوباش میں صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔شاردا پیٹھ سے کوئی (۱۵) پندرہ میل نیچے ایک مشہور گاؤں دودنیال ہے۔ یہاں نالہ شالہ بٹھو، جمع گنڈ نیلم کے بائیں طرف سے بغل گیر ہوتے ہیں۔دریا کے بائیں بازو پر دودنیال کا بڑا گاؤں ہے جہاں ڈوگرہ دَور کے شروع میں ایک مکتب ہوا کرتا تھا، جس کے مدرس علامہ انور شاہ کشمیری کے والد بزرگوار پیر معظم شاہ صاحبؒ تھے۔علامہ انور شاہؒ اپنے والد بزرگوار سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہاں سے ہی پہلے پکھلی کے مدرسے میں گئے اور پھر والدِ محترم کے پاس ددنیال آتے رہتے ہونگے کہ دیوبند کی اجازت لیں، چنانچہ دیوبند داخلہ کے وقت حضرت انور شاہ صاحبؒ کی سکونت ضلع مظفرآباد درج ہے۔اس عقدہ کو مولانا محمد سعید مسعودی نے حل کیا کہ علامہ انور شاہ صاحبؒ چونکہ دودنیال سے براستہ ٹیٹوال و مظفرآباد، دیوبند پہنچے تو انہوں نے اپنی سکونت ضلع مظفرآباد لکھوائی کیونکہ دودنیال تحصیل کرناہ کا حصّہ تھا اور تحصیل کرناہ ضلع مظفرآباد کی ایک تحصیل تھی۔الغرض شاردا پیٹھ کے بدھ بھکشوؤں نے نہ صرف پہاڑی زبان و ادب کی خدمت کی ہے بلکہ من پسندانہ رویہ اور سخت ریاضت سے ایسے گہرے نقوش

چھوڑے ہیں کہ آج تک بھی شاردا کا نام عزت واحترام سے شاردا جی کہہ کر لیتے ہیں۔ شاردا جی کے متعلق ایک پرانی روایت بھی چلی آتی ہے کہ جب موسم گرما میں دریا کا پانی سرایت کر کے کہیں کہیں سیجل یا نمی بن کر نکلتا ہے تو خوش اعتقاد دیہاتی اس سیجل یا نمی کے پانی کو جمع کر کے بیمار جانوروں اور بچوں کو شفاء کی امید سے پلاتے ہیں۔ مورّخ کلہن کے کہنے کے مطابق وہاں ایک مندر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ کچھ آوازیں آج کل بھی سُنائی دے رہی ہیں۔

شاردا کو برصغیر کی چار بڑی دانشگاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس دانشگاہ کو عالمگیر شہرت حاصل تھی۔ اس کا قیام ہزاروں برس قبل عمل میں آیا۔ بقول موّرخ البیرونی کہ کنشک اوّل کے دور میں شاردا وسطی ایشیا کی سب سے بڑی تدریسی درسگاہ تھی۔ جس کا تعلق تحصیلِ کرناہ سے ہے۔ یہ دانش گاہ برصغیر بلکہ پورے براعظم ایشیاء کے تاریخی، علمی، ادبی اور ثقافتی ورثے پر محیط ہے۔ شاردا قدیم دور کی چار بڑی اور عظیم دانشگاہوں میں سے ایک تھی۔ جہاں برصغیر کے علاوہ چین، تبت، نیپال اور وسطہ ایشیاء یورپ اور افریقہ کے مما لک سے بھی طلباء آ کر فیض حاصل کرتے تھے۔ شاردا کے کھنڈرات تحصیل کرناہ کے علاقہ کیرن اور آٹھ مقام سے چند میل دور دریائے کشن گنگا کے کنارے وادیٔ نیلم میں آج بھی اس کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ان کھنڈرات کو آج بھی شاردا کہتے ہیں اور یہاں پہاڑی لوگ آباد ہیں۔ تحصیل کرناہ کو آج بھی یہ فخر حاصل ہے کہ ''شاردا جی'' اس کی سرزمین کا حصّہ ہے اور اہلِ کرناہ کے دلوں میں آج بھی علمی ذوق بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہاں کے لوگ ترقی کی سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے شاردا کی عظمتوں اور وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

●●●

☆.....مرزا عارفؔ بیگ
مترجم:۔سید محمد مبشر رفاعی

سفر نامۂ چین

چین پہلا ایسا ملک ہے جہاں ریشم کے کیڑے کی دریافت ہوئی اور جس نے اس سے غنچۂ ابریشم حاصل کر کے ریشم بننے کا طریقہ بھی دریافت کیا۔ ہر سال اس ملکہ کا عرس منایا جاتا ہے جو بیری کے ایک پیڑ کے نیچے چائے نوش کر رہی تھی اور جس کی گرم چائے کی پیالی میں اچانک ریشم کا کیڑا گر آیا اور اس میں سے باریک دھاگہ نکل آیا۔ یہ کوئی چار پانچ ہزار سال پرانی بات ہے۔ تب سے پوری دنیا کو اس بارے میں معلومات حاصل ہوئیں اور ریشم کی صنعت ترقی کرتی گئی۔ مجھے اور میسور کے ایک شخص رام مورتی کو ایک عالمی سطح کے پروگرام کے تحت چین کا ریشم خانہ دیکھنے کیلئے منتخب کیا گیا۔

سال 1957ء کے ماہ مئی کی 6 تاریخ کو میں بمبئی پہنچا۔ لیکن 18 تاریخ تک چین جانے کے اجازت نامے کو منظوری نہیں ملی۔ 19 تاریخ کو میں ہوئی جہاز کے ذریعے بمبئی سے کلکتہ کیلئے روانہ ہوا اور میرا آگے کا سفر شروع ہوا۔

ائر انڈیا انٹرنیشنل سروس کی پرواز ہمیں لے کر دن کے دو بجے روانہ ہوئی اور یہیں سے سمندر شروع ہوا۔ اوپر نیلا آسمان اور نیچے خوفناک نیلا سمندر۔! یہ دلوں اور حوصلوں کے امتحان کی گھڑی تھی۔ ہم میں سے بہت سارے مسافر ایسے تھے جو کئی بار یہ سفر کر چکے تھے۔ ان کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کچھ اطمینان سے کتابیں یا رسالے

پڑھ رہے تھے اور کچھ گپ شپ میں محو تھے۔لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کے چہروں پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ شاید محوِ ورد کلمات تھے۔ میں مضطرب بھی تھا اور اطمینان سے سمندر کا نظارہ بھی کر رہا تھا۔ایک اتھاہ و گہرا سمندر، جس میں پہاڑیوں کی مانند لہریں اٹھ رہی تھیں اور خاموش ہو جاتی تھیں۔ پہلے پہل یہ نظارہ دل فریب لگا، لیکن کچھ وقت کے بعد ہی ہیبت ناک لگنے لگا۔ رات کی تاریکیاں سمندر کو کچھ زیادہ ہی خوفناک بناتی ہیں۔ آفتاب کے غروب ہونے کے ساتھ ہی ایک کالی موٹی چادر نما گھٹا ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔مگر غروبِ آفتاب کا نظارہ اس قدر حسین ہے، جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پوری فضا سرخی مائل چادر کی مستی میں مست ہو جاتی ہے۔ سمندر اور آسمان جیسے جامنی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

رات کے پونے ایک بجے جہاز ایک بستی کے اوپر سے گزرا۔بستی میں رنگ برنگی بتیاں جل رہی تھیں اور یہ بستی دلہن کی طرح سجی خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ جہاز کے اندر سیٹ بیلٹ باندھنے کا اعلان ہوا۔ کہا گیا کہ جہاز بینکاک ہوئی اڑے پر اترنے والا ہے۔

یہ تھائی لینڈ کا شہر تھا۔ پست قد کی حسین تھائی لڑکیاں یہاں کوئلوں کی مانند بول رہی تھیں اور اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ان کو دیکھ کر دل و دماغ کو سکون ملا اور سمندر کی ہیبت سے تیز ہوئی دھڑکنوں کو بھی قرار آیا۔

ہماری گھڑیوں میں بارہ بج کر پینتالیس منٹ بج رہے تھے، لیکن وہاں صبح کا وقت ہو رہا تھا اور گھڑیوں میں صبح کے ساڑے تین بج رہے تھے۔ گھڑیوں میں اتنے فرق کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور یہاں سے آگے میں وہیں کا وقت بیان کروں گا۔ وہاں سے ہمارا جہاز چار بج کر پچپن منٹ پر ہانگ کانگ کیلئے روانہ ہوا۔ پو پھٹی تھی اور طلوع آفتاب کا وقت تھا۔ وہاں سے بھی جہاز کو سمندر کے اوپر پرواز بھرنی تھی۔ ہم نیم دوپہر

کے قریب ہانگ کانگ پہنچنے لگے۔ ہوائی جہاز سے ہانگ کانگ شہر کا منظر قابل دید تھا۔ یہ شہر سمندر کے کنارے شنکر آچاریہ کے مترادف ایک پہاڑی پر واقع تین حصوں میں آباد ہے۔ ان تین حصوں کے درمیان پانی ہے اور کشتیوں اور موٹر بوٹوں کے ذریعے آنا جانا رہتا ہے۔

ہوائی جہاز سے ہانگ کانگ شہر ایک خوبصورت نگینے والی سونے کی انگوٹھی کی مانند لگ رہا تھا۔ یہ ایک فری پورٹ شہر ہے جہاں کسی بھی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا ہے۔ یہ بات اس شہر کو چین، جاپان اور فارموسا آنے جانے والوں کیلئے ایک بہت بڑی تجارتی منڈی بناتا ہے۔

رات بھر شام راک ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد میں 21 کی صبح کو لووو ریلوے سٹیشن کی جانب نکل پڑا۔ کار میں وہاں تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹے کا وقت لگا۔ وہاں سے چین کے جنوبی سرحد تک ریل گاڑی جاتی ہے۔ بیچ میں ایک ٹنل ہے، جس میں سے گزرنے کو ریل گاڑی کو کم وبیش پندرہ منٹ کا وقت لگتا ہے۔ اسی سٹیشن سے گھڑیوں میں چین کا مقامی وقت متعین کیا جاتا ہے۔ اُس وقت گھڑیوں میں ہانگ کانگ کے مقامی وقت کے مطابق گیارہ بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے۔ گھڑیوں کو ایک گھنٹہ پیچھے کر کے ان میں دس بج کر پچاس منٹ کا وقت دکھانا پڑا۔

ہم دوپہر تین بج کر پینتیس منٹ پر چین کے پہلے ریلوے سٹیشن شمچون پہنچے۔ وہاں سے آگے میری ساری دنیا بدل گئی اور میں اس ملک میں داخل ہو گیا، جو کئی برسوں سے آزاد دنیا کیلئے ایک پہیلی بنا ہوا تھا۔ اس ملک کے بارے میں ہم نے جنت اور دوزخ کی طرح کہانیاں سنی تھیں، لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا جو یہ کہتا کہ اس نے یہ طلسماتی ملک اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

وہاں سے آگے زمین بھی نئی تھی اور وقت بھی۔ لوگ بھی الگ تھے اور زبان

بھی الگ۔ شچون ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ ہم ایک معمولی سے ہوٹل میں گئے، جہاں ہم نے پہلی بار چینی کھانا کھایا۔

ایک بڑے سے چینی پیالے میں میرے سامنے شوربے میں تیر رہی چھوٹی مچھلیاں جیسی رکھی گئیں۔ یہ دراصل مشروم کے چھوٹے چھوٹے قاش تھے۔ وہ مشروم نہیں، جو ہم کھاتے ہیں۔ چاول بھی لائے گئے۔ اس کے ساتھ سبزی بھی اور گوشت بھی۔ چاول کے ساتھ دو چاپ سٹکس بھی، جن سے چینی لوگ چاول کا ایک ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہیں۔ اگر میں نے اپنے وطن میں چینی پکوان نہ دیکھے ہوتے تو مجھے ہنسی بھی آتی اور حیرت بھی ہوتی۔ اس پڑاؤ سے میں چینی حکومت کا یوں کہئے کہ ایک فردِ خانہ تھا اور میرے کھان پان کی ذمہ داری چینی حکومت کے سر تھی۔ وہاں سے روانہ ہونے کے بعد ہم دوسرے روز ساڑھے تین بجے کے قریب کان ٹان نامی پہلے شہر میں پہنچے۔

ریل گاڑی کے ڈبے ہماری ریل گاڑیوں کے ڈبوں سے کچھ بہتر نہیں تھے۔ لیکن اتنا فرق تھا کہ سارے ڈبے ایک جیسے تھے۔ کوئی کوچ پہلے یا دوسرے درجے کا نہیں تھا۔ ہوتے بھی تو کس لئے۔ وہاں ان دنوں ایک ہی کلاس تھا۔ سب لوگ ایک ہی درجے کے۔

کان تان میں مجھے سترہ منزل والے ایچون نامی ایک ہوٹل میں رکھا گیا جو پرل رور دریا کے کنارے واقع تھا۔ اس دریا میں بھی بستیاں ہیں۔ ڈونگوں اور کشتیوں میں لگ بھگ ایک لاکھ لوگ تھے۔ کچھ کشتیاں اچھی طرح سجائی گئی تھیں اور کچھ بہت ہی سادہ تھیں، جس طرح ہمارے یہاں عام ہانجی رہتے ہیں۔ دودھ پیتے بچوں کی کمر پر مائیں لکڑی کے بڑے ٹکڑے باندھ کر رکھتی ہیں تاکہ پانی میں گرنے کی صورت میں انہیں آسانی کے ساتھ بچایا جا سکے۔

مچھلیوں کو تازہ رکھنے کا ان کا طرز عمل سیکھنے کے قابل ہے۔ مچھلیوں کو ایک بڑے سے پنجرے میں رکھا جاتا ہے اور یہ پنجرہ آدھا پانی میں رکھا جاتا ہے۔ اس طرح مچھلیاں پانی میں بھی رہتی ہیں اور قابو میں بھی۔ کوئی بھی خریدار کسی بھی وقت زندہ مچھلی خرید سکتا ہے۔ مچھلیوں کے خراب ہونے اور ان سے بدبو پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا ہے۔

کان تان شہر سمندر کے نزدیک چین کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ علاقہ میں نے چین کا دورہ مکمل کرنے کے بعد واپسی پر اچھی طرح دیکھا اور میں نے وہاں کے ریسرچ سینٹر میں تقریباً پندرہ روز تک قیام کیا۔

اس علاقے کی ساری اشیا ہمارے مدراس، بنگلور وغیرہ کے شہروں اور دیہات کی اشیا کے ساتھ کافی حد تک ملتی ہیں۔ پیڑ پودے، میوے اور فصلیں بھی ایک جیسی ہیں اور غنچۂ ابریشم بھی وہی ہے جو ہمارے یہاں میسور میں ریشم کی صنعت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

ایک دن وہاں کے ڈائریکٹر اور اعلیٰ افسران توت کی ایک نرسری میں میرے ساتھ محو گفتگو تھے کہ اچانک وہاں سے ایک چھپکلی گزری۔ بحث ادھوری کی ادھوری رہ گئی۔ سارے چینی افسران چھپکلی کے پیچھے لگ گئے اور اس کو پکڑے بنا ہار نہیں مانی۔ سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ ایسی میٹھی چیز اب تک کیونکر قابو میں نہ آئی تھی۔ تعجب ہے! اس سے ذائقہ دار پکوان بنتا ہے۔

چینیوں نے کبھی حلال و حرام کا تصور بھی نہیں کیا ہے۔ وہاں کی زیادہ تر آبادی بودھوں اور کنفیوشنوں کی ہے، جن پر کھانے پینے کے تعلق سے کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ لوگ اس معاملے میں مردہ جانوروں، مردہ گائیوں، مویشیوں اور جنگلی جانوروں میں کوئی فرق نہیں کرتے ہیں۔ سانپ، کتے، غرض کیڑے مکوڑوں

سے لے کر شیر اور بھالو تک، یہ لوگ ہر طرح کے جاندار کو کھاتے ہیں۔ صرف مسلمان حلال اور حرام کا فرق جانتے اور مانتے ہیں۔ کئی علاقوں میں مسلمان ان دیہات سے دور رہتے ہیں جہاں خنزیر پالے جاتے ہیں۔

واپسی پر میں نے تقریباً پندرہ روز تک اس شہر میں قیام کیا اور تفصیل سے وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ وہاں ہزاروں مسلمان بھی رہتے ہیں اور ان کی کوششوں کی بدولت وہاں ''مطبخۃ المسلمین'' نامی ایک بڑا مسلم ہوٹل بھی کھولا گیا ہے۔ پانچ چھ ماہ تک چین میں قیام کے دوران میں نے اسی ہوٹل کا سائن بورڈ کسی دوسری زبان میں لکھا دیکھا۔ یہاں انگریزی زبان کا کہیں نام نشان بھی نہیں ملتا ہے۔

مسجدیں، گرجے اور پگوڑے بھی حیرانگی کے عالم میں ہیں۔ اندر سے آباد ہیں، لیکن باہر کوئی بھی شخص مسلمان، عیسائی یا بودھ بن کر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ سب چینی ہیں اور سب کو زندگی کی یکساں سہولیات دستیاب ہیں۔ وہاں نہ کوئی اکثریت ہے اور نہ کوئی اقلیت۔ یہاں تک کہ کوئی سیاسی جماعت بھی نہیں ہے۔ سب لوگ ایک ہی نظام کے پابند ہیں اور سب ایک ہی وطن کے وطن دار۔

مساجد سے متعلق کچھ باتیں کہنے لائق ہیں۔ جمعہ کے دن خواتین دو چار صفیں باندھ کر مردوں کے پیچھے نماز پڑھتی ہیں۔ جب تک امام صاحب یا وعظ خوان قرآن وحدیث بیان کرتے ہیں، تب تک سادات، عالم اور بزرگ لوگ منبر کی طرف پیٹھ پھیر کر اور باقی نمازیوں کی جانب رخ کر کے ایک صف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جوں ہی امام صاحب خطبہ دینا شروع کرتا ہے تو یہ لوگ قبلہ رو ہو کر پہلی صف ترتیب دیتے ہیں۔ اس طرح امام کے پیچھے کوئی بھی اَن پڑھ یا چھوٹا بچہ نہیں رہتا ہے۔ اس صف میں سب نیک، بزرگ، عالم دین اور حافظِ قرآن ہوتے ہیں۔

سن کیانگ صوبے کو چھوڑ کر چین کے کسی بھی علاقے میں مسلم خواتین برقع

نہیں پہنتی ہیں۔نماز کے بارے میں کافی حساس ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ انہوں نے کبھی بھی برقع کا استعمال نہیں کیا ہے، حالانکہ اسلام وہاں 47 ہجری میں پہنچا ہے۔

کان تان سے ریل گاڑی میں دودنوں اور دوراتوں کا سفر کرنے کے بعد ہم 25 مئی کو رات کے ساڑھے دس بجے چین کے اہم شہر اور دارالخلافہ پیکنگ پہنچ گئے۔وہاں کے اعلیٰ حکام ہمارے انتظار میں تھے اور ہمارا والہانہ استقبال کیا گیا۔

●●●

اُردو افسانہ.....کل، آج اور کل

شرکائے گفتگو

(ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وزیر آغا، جوگندر پال، سہیل عظیم آبادی، رتن سنگھ، شکیلہ اختر، کلام حیدری، رشید امجد، بلراج کامل، کوثر چاند پوری، ظفر اوگانوی، ہرچرن چاولہ، مظفر حنفی، مسیح الحسن رضوی، اکرام جاوید، عطیہ نشاط، ہربنس لال ساہنی، امیر اللہ شاہین، خموش سرحدی)

سوال ۱۔ کیا آپ عصری اُردو افسانے کی رفتار ترقی سے مطمئن ہیں؟

سوال ۲۔ مختصر افسانے میں آپ کن عناصر و اجزا کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں؟ آپ افسانویت سے کیا مراد لیتے ہیں؟ کیا آپ کی رائے میں افسانے میں افسانویت ضروری ہے؟

سوال ۳۔ عصر حاضر کے ایسے افسانہ نگاروں میں جنھیں تقسیم ہند سے قبل شہرت حاصل ہو چکی تھی آپ ذاتی طور پر کسے ترجیح دیتے ہیں اور کیوں؟

سوال ۳ (ب)۔ پچھلی پود کے بعض افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو جس بلند فنی سطح پر پہنچا دیا تھا کیا آپ کے خیال میں نئی پود کے افسانہ نگاروں نے گزشتہ برسوں میں اس میں توسیع اور اضافہ کیا ہے؟

سوال ۴۔ آپ کے خیال میں ۱۹۵۰ء کے بعد مشہور ہونے والے کن افسانہ نگاروں نے

اردو افسانے کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا ہے؟
سوال ۵ (الف)۔ تجریدی اور تمثیلی افسانے کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟
سوال ۵ (ب)۔ کیا تجریدیت سے افسانے کی ارضیت مجروح ہوتی ہے؟
سوال ۶۔ دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں اردو میں افسانے کو جو امتیازی مقام اور اہمیت حاصل ہے آپ کی رائے میں اس کے کیا اسباب ہیں؟
سوال ۷۔ اردو کے وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جن کی منتخب کہانیاں دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ایسی دس کہانیوں کی نشاندہی کیجئے۔

.....

سوال ۱: کیا آپ عصری اُردو افسانے کی رفتارِ ترقی سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر محمد حسن: جی نہیں

ڈاکٹر وزیر آغا: عصری ادب ہمیشہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اور اس لئے کچھ وقت گزرنے پر ہی اس کی ترقی یا تنزل کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے۔ تاہم اگر عصری ادب میں نت تجربات ہو رہے ہوں اور ادبا اپنی بات کو سوڈھنگ سے بیان کرنے میں مصروف ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب پر جمود طاری نہیں اور اس لئے اس کی ترقی کے امکانات روشن ہیں۔ عصری اُردو افسانے نے خود کو پامال راہوں سے الگ کرنے اور زندگی کو متعدد اور متنوع زاویوں سے دیکھنے کی جس طرح سعی کی ہے وہ اُردو افسانے کے ایک تابناک مستقبل کی ضمانت ہے۔ بالخصوص علامتی افسانہ کی روش نے ایسی تخلیقات کو منظرِ عام پر آنے میں مدد دی ہے جو ابھی سے اپنی توانائی اور تازگی کا احساس دلا رہی ہیں۔

جوگندر پال: عصری افسانے کی رفتارِ ترقی سے غیر مطمئن ہونے کا کوئی سبب نہیں، لیکن ہماری ہر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی نئی زندگی کی مانند نئے افسانے کو بھی ہر لحظہ بڑھتے اور پھیلتے

جانا ہے۔ اگر ابھی سے ہم اطمینان سے لیٹ گئے تو پانچ سال میں زندگی ہماری سوتے سوتے ہی اتنی بدل جائے گی جتنی گزشتہ پچاس برس میں بھی نہ بدلی ہو۔

سہیل عظیم آبادی: میں عصری اردو افسانے کی رفتار ترقی سے مطمئن نہیں ہوں۔ پرانے افسانہ نگار خاموش ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں نے اب تک کوئی افسانہ پیش نہیں کیا جو سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہو۔ بلکہ افسانہ نگاری کو علامتوں اور الفاظ کے بھول بھلیاں میں اُلجھا رکھا ہے کہ پڑھنے والوں پر افسانہ کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ اگر کوئی دل چسپی کی چیز ان افسانوں میں ہوتی ہے۔ تو وہ لفظوں کی بازی گری ہے۔ ایک دو افسانے جو کبھی اچھے نظر آجاتے ہیں۔ اُن کو محض اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں کہ عصری افسانوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں' بلکہ جدید افسانوں کی طرف سے مایوس بھی ہوں۔

رتن سنگھ: ترقی کی رفتار سے مطمئن ہونا، ترقی کی رفتار کو روکنا ہے۔ اس لئے عصری اردو افسانے کی رفتار سے مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن میں موجودہ رفتار سے مایوس بھی نہیں۔

کلام حیدری: مطمئن کا لفظ ایسا ہے کہ میں اس سوال کا جواب سوائے 'نہیں' کے اور کچھ نہیں دے سکتا۔ اور رفتارِ ترقی سے اگر مراد معیار کا اونچا ہونا ہے تو اس سے مجھے مایوسی ہوتی ہے' کیونکہ پچھلے کے مقابلے میں افسانوں کا محض 'مختلف' ہونا لازمی طور پر ترقی ہی کی نشانی نہیں کہی جاسکتی لیکن بلاشبہ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ ہمارے افسانہ نگار نئی راہیں تلاش کررہے ہیں' تلاش بڑی اہم چیز ہے اور اس سے کامیابی کے راستے کُھلتے ہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری کی جو رفتار 'انگارے' کی اشاعت کے بعد بڑھی تھی اُس کے مقابلے میں آج کی رفتار یقیناً سُست ہے جو IMPETUS ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے ادب کو عموماً اور افسانہ نگاری کو خصوصاً دیا تھا ویسا کوئی افسانہ یا افسانوں کا مجموعہ (۵۰ء کے بعد) متاثر اور متحرک نہیں کرسکا۔

برِاعظم کی تقسیم اور اختیارات کا تبادلہ بہت سی تباہیوں کا باعث بنا۔ تاریخ

جاننے والے جانتے ہیں کہ آزادیٔ وطن کی جدوجہد کسی ایک سیاسی پارٹی کی monopoly نہیں تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ آزادی کے بعد وطن کی ترقی ۔بہبودی کے لئے مختلف نظریئے تھے لیکن انگریزوں نے اختیارات صرف ایک پارٹی کے حوالے کر کے اور ملک کو تقسیم کر کے دونوں حصوں کو نیا ملک بھی بنا دیا اور دائیں بازو کا غلبہ بڑھا دیا۔ اردو مخالف عناصر کُھل کر سامنے آ گئے اور اردو کے محافظ مقدس لفظ 'ہجرت' کے سائے میں پناہ گزیں ہو گئے ۔جو رہ گئے وہ مدتوں شرمسار ہے اور اکثریت کے جارحانہ مطالبوں کے آگے بڑے بڑے بین الاقوامی قسم کے سکولرسٹ بھی سرنگوں ہو گئے ۔ اردو ادب مجموعی طور پر متاثر ہوا اور اردو ادب کے فروغ کا کام کرنا کوئی نفع بخش کام نہیں رہا۔میری بات کی سچائی دیکھنی ہو تو ۴۷ء کے بعد ہندی کی ترقی (مجموعی اعتبار سے) اور اردو کی ترقی کا موازنہ کر لینا کافی ہوگا۔ ہندوستان میں اردو افسانوں کی ترقی کی رفتار کینسر کے مریض کا افاقہ ہے کہ اُسے بہر حال کلی طور پر صحت یاب ہونے کی اُمید نہیں ہو سکتی۔

شکیلہ اختر: نہیں

ڈاکٹر ظفر اوگانوی: میں قطعی طور پر مطمئن ہوں کیوں کہ ۵۰ء کے بعد جو اردو افسانہ نگار اُبھرے یا اُبھر رہے ہیں ان کی تعداد ایک مفہوم میں بہت مختصر سہی مگر وہ جو لکھ رہے ہیں خوب سے خوب تر کی ایک کوشش ہے اور ان کے افسانے ہر لحاظ سے ارتقائی سمت متعین کرتے جا رہے ہیں۔

رشید امجد: عصری اردو افسانے نے ہمارے یہاں کی افسانوں روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں عصری رجحان نسبتاً بہتر طریقے سے' پیش کیا گیا ہے۔ممکن ہے بعض حضرات اس ضمن میں ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں کا حوالہ دیں' اس سلسلہ میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں

نے عصری تقاضوں کا ساتھ تو بیشک دیا ہے لیکن ان میں سے اکثر کے یہاں فکری فقدان ہے۔ نئے افسانہ نگار کے یہاں اس عصری رجحان کے ساتھ فکری وسعت اور تنوع نے افسانے کو جو توانائی بخشی ہے وہ یقیناً اردو افسانے کے اس سفر کی غماز ہے۔

بلراج کومل: مکمل اطمینان کا اظہار کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

امیر اللہ شاہین: جی ہاں! بے اطمینانی کی کوئی وجہ نہیں۔

کوثر چاند پوری: عصری اردو افسانے کی رفتارِ ترقی سے غیر مطمئن ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اردو افسانہ ہر عہد میں ارتقاء پذیر رہا ہے' گذشتہ چند سال میں جو انتخابات شائع ہوئے ہیں ان میں اس دور کے بہترین افسانے شامل ہیں جن کے پیش نظر عصری افسانوں آرٹ کی رفتار ترقی سے پورا اطمینان ہوتا ہے' جن انتخابات کا میں نے حوالہ دیا ہے ان میں ہندو پاک کے نئے پرانے افسانہ نگاروں کی نئی تخلیقات شامل ہیں۔

ہرچرن چاولہ: نہیں۔عصری اردو افسانہ کی ترقی کی رفتار غیر تسلی بخش ہے۔ پریم چند کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک کھیپ سامنے آئی جس نے افسانہ کو ایک نیا روپ دیا۔ جہاں پریم چند نے گھریلو بوڑھی عورتوں کی رات کو بچوں کو سنائی جانے والی کہانیوں کے دائرہ سے نکل کر زندگی کی حقیقی عکاسی اور ہندستانی دیہات کی صحیح ترجمانی اور کسانوں کے دُکھ درد کے سچے اور آنکھوں دیکھے حالات اور واقعات کو نہایت عمدگی اور فن کاری سے نئے افسانے کا جامہ پہنا یا اور ہمیں ''بیٹی کا دھن''، ''پچھتا وا''، ''کفن'' اور ''دو بیل'' جیسے بے شمار دیہاتی زندگی کے خدوخال کو تصویر کی طرح فریم میں سجا کر آنکھوں کو خیرہ کرنے والے اور آنکھوں میں نمی لانے والے افسانے دئے، وہاں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت اور قاسمی نے نئے اور کشادہ ماحول جس میں بین الاقوامی تہذیب کی وسعت اور پھیلاؤ کی خرابیاں گھس رہی تھیں، کو بڑی بے چینی اور تلخی سے افسانے کا روپ دیا۔ اُن کے سامنے متعدد محرکات تھے۔ طبقاتی کش مکش، جنگ

آزادی، دوسری عالم گیر جنگ کی تباہ کاریاں اور تقسیم وطن۔حساس اور باشعور ذہن کو متاثر کرنے والے بے شمار حالات تھے کہ ادیب قلم اُٹھاتا تھا اور قلم کی نوک پر نظریات اور خیالات کی ایک یلغار سی ہو جاتی تھی۔ بعد میں انقلابی مقاصد کے تحت تحریر کیے گئے افسانوں کا ایک سلسلہ لامتناہی تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ کچھ افسانے کرشن چندر کے بلاشک ذہن پر گہرا اور انمٹ نقش چھوڑ گئے مگر فنی اور ادبی قد وقامت میں اُن سے نکلتے ہوئے بھی دو تین نام سامنے آئے جیسے بیدی، منٹو اور عصمت ذاتی طور پر مجھے بیدی اور کرشن چندر کی بعض تخلیقات نے کافی متاثر کیا وہاں منٹو کے کچھ افسانے جیسے ایک صد پائے کی طرح ذہن سے چپک کر بیٹھ گئے۔اب اردو انسانہ کی ترقی کی ویسی رفتار کہاں!

عطیہ نشاط: عصری اردو افسانہ میرے نزدیک عجیب مبہم سمت میں سفر کر رہا ہے۔اچھی صلاحیتوں کے فن کار الجھنوں میں گھرے نئے راستوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں ۔ نہ سمت کا تعین ہے نہ منزل کا پتہ۔ پرانے انداز کو انھوں نے چھوڑ کر تجربہ کا دامن پکڑا ہے۔آگے بڑھنے اور ترقی کی راہ میں قدم رکھنے کے لیے تجربوں کا دامن پکڑنا ضروری بھی ہے لیکن اس میں جو غیر یقینی کیفیت' اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کا عالم ہوتا ہے وہ بھی موجود ہے۔کوئی بات اچھی بھی کہہ دیتا ہے اس کی نگاہِ زندگی گہرائیوں میں اتر کر موتی بھی ڈھونڈ نکالتی ہے لیکن سمندر کھنگالنے میں کیچڑ ہی زیادہ ہاتھ لگتی ہے اس لیے مجھے اس میں ترقی کم ہی نظر آتی ہے۔

مظفر حنفی: میں عصری اردو افسانے کی رفتار ترقی سے مطمئن نہیں ہوں کیوں کہ اطمینان ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ہربنس لال ساہنی: پہلے سوال کے جواب میں اگر میں ''یقیناً نہیں'' کہہ کر خاموش ہو جاؤں۔تو بے جا نہ ہوگا۔اس لئے کہ آپ نے تشریح وتفصیل کا مطالبہ نہیں کیا۔اور

''کیوں؟'' کا اضافہ نہ کر کے ہم سب پر احسان کیا ہے۔

مسیح الحسن رضوی: جی نہیں پچھلی نسل نے' مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کر کے' اور عصری زندگی کے مسائل کو سمجھ کر افسانہ نگاری کی تھی۔ موجودہ نسل' پچھلی نسل کی تخلیقات کی اندھی تقلید کر کے افسانہ نگاری کرتی رہی۔ اس کے فوراً بعد جو نسل آئی ہے وہ عالمگیر بحران سے پراگندہ ہو کر افسانہ نگاری کرتی ہے جس میں بے لاگ خلوص کی کمی کے ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان کی خوبی بھی نہیں، زندگی کی بے راہ روی کوئی مقصد نہیں۔

اکرام جاوید: جی نہیں، میں عصری اردو افسانہ کی رفتار ترقی سے مطمئن نہیں ہوں۔

خموش سرحدی: یقیناً عصری افسانہ معتدل رفتار کے ساتھ تدریجی ترقی کے مرحلوں سے گذر رہا ہے۔ لیکن جدیدیت کی دُھن میں کچھ جدیدیوں نے موضوع، متن اور اسلوب کے لحاظ سے افسانہ کو ہیت کی کرتب بازی بنانے کی عجیب سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔ جس سے عصری افسانہ کی صحت مندانہ قدروں کو کچھ گھاؤ لگے ہیں۔ اس لئے عصری افسانہ تغیر پذیر عوامل کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اور اب کہنا پڑتا ہے کہ اس کی رفتارِ ترقی لائق تسلی و اطمینان نہیں رہی۔ تاہم اسکا مستقبل محفوظ نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں ذہین و فہیم افسانہ نگاروں کی کوششیں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئیں۔

<u>سوال نمبر۲: مختصر افسانے میں آپ کن عناصر و اجزا کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں؟ آپ افسانویت سے کیا مراد لیتے ہیں؟ کیا آپ کی رائے میں افسانے میں افسانویت ضروری ہے؟</u>

ڈاکٹر محمد حسن: اس سلسلے کے تین سوالات میں سے پہلے اور آخری سوال ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ میرے نزدیک مختصر افسانے میں بنیادی اہمیت افسانویت کی ہے اور افسانویت کے معنی یہ ہیں کہ قصے اور کردار کے ذریعہ قاری تک کوئی ایسی کیفیت یا تاثر

پہنچایا جائے جو زندگی کا ایک نیا وژن دے سکے۔ قصے اور کردار کی اصطلاحوں کو مطلق نہیں جاننا چاہیے۔ قصے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لازمی طور پر اس میں بنیادی اہمیت کہانی ہی کی ہو اور واقعات کا پیچ وخم ہی سب سے اہم قرار پائے۔ قصے سے میری مراد سرگزشت ہے یعنی کسی خاص موقعے یا صورت حال میں انسان پر کیا گزری ہے۔ ایک مخصوص انسان پر جو ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ شاعری میں (اور خصوصاً داخلی شاعری میں) جہاں اس بات پر زور ہے کہ واحد متکلم کسی خاص صورت حال میں کس طرح کے جذبات واحساسات سے گزرا ہے وہاں افسانے میں (یا ناول میں) زیادہ زور اس بات پر ہوگا کہ واحد غائب پر کس طرح کی صورت حال گزری ہے گویا یہاں واحد متکلم بھی واحد غائب ہی فرض کیا جائے گا۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے گو اپنے افسانوں میں واحد غائب کے بجائے واحد متکلم ہی کا صیغہ استعمال کیا ہے مگر قاری یہاں انھیں واحد غائب ہی کے پردے میں دیکھتا ہے اور 'میں' کو بھی ایک مستقل کردار جانتا ہے جو اس سے اور مصنف کی ذات سے الگ اور منفرد ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہاں شاعری میں کیفیت صورت حال سے الگ بھی جگہ پا سکتی ہے مگر افسانے میں کیفیت کو صورت حال کے ذریعے ہی ادا کیا جا سکتا ہے (اور یہ صورت حال تمثیل بھی ہو سکتی ہے علامتی بھی اور واقعاتی بھی) یہی افسانویت کی بنیاد ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا: مختصر افسانہ چاہے وہ کردار کے بارے میں ہو یا ٹائپ کے بارے میں' اگر وہ اسلوب اور کہانی پن کی صفات سے دست کش ہو جائے تو اس صنف کے تحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہی اس کے بنیادی اجزا ہیں۔ افسانویت سے مراد کہانی پن کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر افسانہ نگار کو کوئی کہانی بیان نہیں کرنی ہو تو اسے مختصر افسانے کی صفت کو استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر افسانے کی کامیابی کا انحصار ایک بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ افسانہ نگار کہانی کو بیان کیسے کرتا ہے اور واقعہ پر کس نئے

زاویے سے نظر ڈالتا ہے۔ تجریدی افسانہ بھی جو بظاہر احساسات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، کہانی کے عنصر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس میں کہانی سدا ایک مدھم دیئے کی طرح ٹمٹماتی ہے اور کردار ہیولوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ تقسیم سے قبل اردو افسانے کو ایک مضبوط بنیاد عطا کرنے والوں میں پریم چند' کرشن بیدی، منٹو، غلام عباس، رفیق حسین، ممتاز مفتی، شمس آغا' بلونت سنگھ' قرۃ العین حیدر' عصمت چغتائی' مسعود شاہدہ وغیرہ خاص طور پر بہت نمایاں تھے لیکن نئی پود کے افسانہ نگاروں نے گزشتہ دس برس میں اردو افسانے کو مزید وسعت بخشی ہے۔ بالخصوص اسلوب کی پختگی اور کہانی کہنے کا انداز فنی طور پر زیادہ بالغ ہو گیا ہے۔ یقین نہ آئے تو تقسیم سے پہلے لکھے گئے اُن افسانوں کو ایک بار پھر پڑھیے۔ جن سے آپ نے اُس زمانے میں بے پناہ تاثر قبول کیا تھا اور آپ کو فی الفوران میں سے بیشتر افسانوں کی زبان اور اسٹائل میں کچے پن کا احساس ہوگا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی پود کے ہاں افسانے کی زبان نسبتاً زیادہ منجھی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔

جوگندر پال: افسانے کا کوئی بھی جز بذات خود اہم نہیں۔ بنیادی اہمیت اس امر کی ہے کہ ہمارا ہر افسانہ اپنی ضرورت خود آپ ڈکٹیٹ کرے۔ اگر آپ کو کسی وقت سماعت کے لئے کان درکار ہوں تو آپ منہ سے نہیں سن پائیں گے۔ اچھی کہانی میں سبھی اجزا حسب ضرورت از خود اپنا اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس طرح اچھی کہانی یوں نہیں ہوتی کہ آج میں پلاٹ یا کردار یا ماحول کی کہانی لکھوں گا۔ میرے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ جب کہانی تیار ہو جاتی ہے تو مجھے اُس کی صورت کا پتہ چلتا ہے کہ کوئی پرندہ ہوا ہے یا انسان ۔ نمبر دو: افسانے میں افسانویت کا مطلب یہ ہے کہ کہانی میں کہانی ہوں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کہانی کیا ہے: کہانی لکھنا اور سُنانے کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے ہم سب لوگ۔ کہانی کسی جامد شئے کا نام نہیں کہ اُس کی ایک ہی صورت ہو۔ اگر

ہمیں کہانی کے توسط سے موجودہ اور مستقبل کی زندگی کی تمامتر باریکیوں کی سمجھ بوجھ سے لطف اندوز ہونا ہے تو فن کار کی آزادی کو چیلنج کرنا اور اُسے اُس کا فارم اور موضوع ڈکٹیٹ کرنا فکری ترقی کا گلا گھونٹنا ہے۔ مستقبل کے سیاق وسباق میں نئے نئے اسالیب کی تلاش ہی 'لکھے ہوئے لفظ' کی آبرو کا باعث ہوسکتی ہے۔ فکر بدلنے لگی، تو صورت کا بھی تغیر پزیر ہونا ناگزیر ہے۔ کیا ہمیں اپنے ناک نقشے سے اتنا ہی پیار ہوگیا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو نئی فکر کے ایڈونچر سے عاری رکھنے پر تُل جائیں؟ اگر ہمارے آباء واجداد بھی ہماری مانند اتنے قدامت پسند ہوتے تو آج ہماری صورتیں کیسی ہوتیں؟ حقیقت یہی ہے کہ فن کو متعین نتائج اور تعریفوں کا پابند بنانا انسان کو ماضی کے صحرا میں لے جانے کی کوشش سے کم نہیں۔

سہیل عظیم آبادی: میرے خیال میں مختصر افسانے میں سب سے اہم عنصر مجموعی تاثر ہے اور خوبیاں افسانے میں کتنی ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر مجموعی تاثر ہو تو وہ افسانہ کامیاب ہے۔ ہمارے اکثر بڑے لکھنے والوں کے یہاں بعض کمزوریاں ہیں۔ لیکن پھر بھی اُن کا افسانہ اس لئے بہتر اور کامیاب سمجھے گئے کہ مجموعی تاثر سے بھرپور ہیں۔ میں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا۔ ہمارے نقادوں نے ان کمزوریوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ پھر بھی افسانوں کو کامیاب اور لکھنے والوں کو بڑا فن کار مانا ہے اور غلط نہیں۔ افسانوں میں افسانویت (کہانی پن) کا ہونا ضروری اس کے بغیر اس میں کوئی اثر پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

رتن سنگھ: افسانہ کوئی ایسی مرکب چیز نہیں ہے جو اجزا یا عناصر کو ملا کر بنتی ہو۔ افسانہ بہتے ہوئے پانی کے بہاؤ کی مانند ہے جو اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنے اندر جذب کرتا ہوا متواتر چلتا رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف قاری کی پیاس مٹتی ہے' بلکہ وہ اس کے شفاف پانی میں جھانک کر اپنا اور اپنے دور کا اور گزرے ہوئے دور کا عکس دیکھ سکتا ہے۔

افسانہ آنے والے دور کی نشاندہی بھی کرسکتا ہے۔ میرے نزدیک افسانویت سے مراد تسلسل ہے۔تسلسل جو افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی قاری کے ذہن میں قائم رہتا ہے اوراس کا ہونا کسی بات کوافسانہ بناتا ہے۔

کلام حیدری: میں افسانے میں سب سے اہم چیز 'تاثر' کو مانتا ہوں'۔ظاہر ہے خلاقانہ عمل کا 'نتیجہ' تاثر کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ باقی اجزا افسانے میں 'تاثر' کے لئے ہی ہوتے ہیں اُن کی الگ اپنی اہمیت محض اسکولوں اور کالجوں کی چیز ہے۔مرکب عمل میں اجزا کو تلاش کرنا اور الگ الگ اُن کے رتبہ کی بات کرنا موضوع سے بہکنا ہے۔آدمی جیسے جیسے سائینس کی دریافتوں اور ایجادات کے طفیل اپنی ''جسامت'' کھوتا جارہا ہے اوراس کی جگہ 'ذہن' لیتا جارہا ہے ویسے ویسے کہانیوں میں 'عمل' کا دخل کم ہوتا جارہا ہے اور ذہن کا عمل اُس کی جگہ لیتا جارہا ہے۔ پلاٹ غیر ضروری ہے (اپنے میکانکی ہونے کے اعتبار سے) لیکن بہرحال افسانے میں ایک 'پلاٹ' ہوتا ہے۔ذہن کو الفاظ میں اسیر کرنے کا کام 'عمل' کو اسیر کرنے کے مقابلے میں مشکل ہے اسی لئے نیا افسانہ نگار زیادہ تر ناکامیاب اور کم کامیاب ہوتا ہے اور اپنے بیان میں پُراسرار اور مبہم مبہم سا لگتا ہے۔افسانے میں افسانویت سے مراد اگر فارسٹر والی ''ریڑھ کی ہڈی'' ہے تو اب یہ بات افسانے میں ضروری نہیں رہی کیونکہ اس کے لئے نیا افسانہ نگار پریشان نہیں ہوتا۔

شکیلہ اختر: کسی ایک عنصر کو اہمیت حاصل نہیں ہوتی کُل کا نام فن ہے' افسانویت ضروری ہے لیکن اُس کے مختلف رنگ اور آہنگ ہوتے ہیں' فن میں تعصب مُضر ہے۔

ڈاکٹر ظفر اوگانوی: میں مختصر افسانے میں اس دروں بینی کو بنیادی اہمیت دیتا ہوں جو باہر کی دنیا میں ترسیلی مفاہمت کیلئے ایک ایسی ''صورت'' تخلیق کرتی ہے جو ہمارے یا بعد کے دور کے کسی بھی فرد کی اندر کی ذات کی تصویر ہوسکتی ہے۔اس کیلئے میں کسی

مخصوص فضا' پلاٹ اور مربوط واقعاتی سلسلے کی کسی شرط کو تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ مگر یہ سارا کچھ ایک افسانہ نگار کو اتنی چابکدستی کیساتھ پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس ظاہری بے ربطی میں بھی اندرون ربط و تسلسل کی ایک ایسی لہر (current) ہوتی ہے جو بیک وقت افسانے کے پہلے جملے سے آخری جملے تک جاری رہتی ہے اور قاری کے ذہن کو بھی اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ میں مختصر افسانے کے اس عنصر کو افسانویت سے تعبیر کرتا ہوں اور افسانے میں اسی اندرونی افسانویت کا میں قائل ہوں۔

رشید امجد: افسانہ میں طے شدہ عناصر کی ترتیب ایک پرانا مسئلہ ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ لفظ ''افسانویت'' کبھی مجھے بوڑھے نقادوں کا جمایا ہوا لفظ معلوم ہوتا ہے جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں۔ میں افسانہ کو ایک اکائی تصور کرتا ہوں اور لکھتے ہوئے میں یہ کبھی نہیں دیکھا کہ اس کے عناصر کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں۔ دراصل یہیں سے نئے اور پرانے رویے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ نیا افسانہ نگار پرانے افسانہ نگار کی طرح پہلے پلاٹ کو منطقی ترتیب نہیں دیتا بلکہ وہ پلاٹ کے بجائے خیال کو لکھتا ہے۔ بعض اوقات پرانے افسانے نگار تو محض ایک جملے کے لئے افسانہ لکھا کرتے تھے' ظاہر ہے کہ انھیں پلاٹ' کردار اور ماحول کی بڑی فکر رہتی تھی' یہ ساری چیزیں نئے افسانہ نگار کا مسئلہ بنتی ہی نہیں ہیں۔

بلراج کومل: ہر مختصر افسانہ ایک بنیادی نقطے کے اردگرد گھومتا ہے۔ افسانہ نگار فنِ افسانہ نگاری کے روایتی طریقے استعمال کرے یا ان سے مکمل طور پر آزاد ہو، بہر حال اس بنیادی نقطے کا احترام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ افسانویت افسانہ کی وہ فضا ہے جو زندگی کا عکس ہوتے ہوئے بھی عکس سے مختلف ہے اور اپنی منفرد کائنات رکھتی ہے۔ یہ فضا ہمیں اس لئے مسحور کرتی ہے کیونکہ اس میں تھوڑی دیر کے لئے سانس لینے کے بعد ہم اپنے آپ کو نئے سرے سے دریافت کرتے ہیں۔ یہ فضا افسانے کا فطری جزو ہے اور

افسانہ نگار اسے تفصیلات' خیالات اور جذبات کے مختلف منطقی اور غیر منطقی اور نفسیاتی رشتوں کی مدد سے تیار کرتا ہے ۔ پلاٹ' کردار اور جزیات روایتی افسانے کا جزولاینفک ہیں۔عصری افسانے نے اکثر روایتی عناصر سے انحراف کیا ہے لیکن بدقسمتی سے ایک بہت بڑی قربانی دیکر۔ بیشتر عصری افسانہ افسانویت کے اس جوہر سے عاری ہے جو افسانے کو جمالیاتی سطح پر دلچسپ اور جاذب نظر بناتا ہے۔

امیر اللہ شاہین: کردار' فضا اور پلاٹ علی الترتیب ۔تاہم ان عناصر کی موجودگی کو معنویت دینے والی چیز بلکہ وصفِ خاص' اختصار' ہے۔ یہ اختصار لفظوں کی ''پرچین کاری'' سے حاصل ہوتا ہے۔کوئی لفظ بلاضرورت استعمال نہ کیا گیا ہو' ہر لفظ اس تاثر کو آگے بڑھائے جو افسانہ نگار کو مطلوب ہے۔ یہ اختصار سطروں' صفحوں اور جسارتوں کی گنتی کا طلب گار نہیں۔ چند سطروں سے ہزار سطروں تک افسانہ پھیل سکتا ہے۔ دراصل افسانہ گرفتاریٔ لمحہ کا فن ہے۔شعلہ مستعجل بھڑکا اور بجھا۔ اتنی دیر میں افسانہ ہوجاتا ہے۔ بات بیگھوں میں نہ پھیل جائے۔ ذیلی اور ضمنی قصّے نہ چھڑ جائیں۔ ایک وقت میں ایک کا اصول افسانے میں ناگزیر ہے۔ ورنہ تاثر بھرپور نہ ہوگا۔ نہ صرف عبارت یا اسلوب مختصر ہو' موضوع بھی مختصر ہو بلکہ مختصر تر! حقیقت کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ حقیقت ہوتے ہوئے افسانہ نظر آئے۔ افسانویت افسانے کے فن میں ادبیت کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح آج ادب کا دائرہ حددرجہ وسیع ہے ۔سماجی' معاشی' ثقافتی ہر قسم کے موضوعات زیر بحث آتے ہیں تاہم ''ادبیت'' کو ان سب پر ایک بالادستی حاصل ہونی چاہئے اسی طرح حقیقت اور ارضیت کے لاکھ دعاوی کے علی الرغم ''افسانویت'' افسانے کے لئے ناگزیر ہے۔

کوثر چاندپوری: مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ' کلائمکس' بنیادی کردار اور وحدت تاثر کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ موضوع اور تکنیک کو بھی اس سلسلہ میں نظرانداز

نہیں کیا جا سکتا۔ پلاٹ اب ضروری نہیں سمجھا جاتا لیکن وحدت تاثر کی عدم موجودگی میں افسانہ ایک بڑی اور لازمی خصوصیت سے محروم ہو جاتا ہے تکنیک بہت حد تک موضوع کے تابع ہے ہر موضوع اپنی تکنیک کو آپ ہی جنم دیتا ہے' افسانویت سے مراد ہے کہانی پن' یعنی کسی واقعہ یا کردار کو فنی پابندیوں کے ساتھ پیش کرنا۔

ہرچرن چاولہ: افسانہ میں کردار نگاری' ماحول اور پلاٹ کو میں ضروری سمجھتا ہوں مگر اس کے باوجود بھی کبھی کبھی بغیر پلاٹ کی کہانیوں نے اپنی دوسری فنی خوبیوں کی بنا پر مجھے متاثر کیا ہے۔ ہاں افسانے میں افسانویت از بس ضروری ہے ورنہ اُسے ہمیں افسانہ نہیں کوئی اور نام دینا پڑے گا۔

عطیہ نشاط: میرے نزدیک افسانے میں زندگی کے کسی پہلو' کسی نفسیاتی حقیقت یا تعلقات وجذبے کے کسی رُخ کی وضاحت ضرور ہونی چاہئے اور زیادہ تر دیکھا گیا ہے کہ کسی طرح کے پلاٹ ہی سے یہ نمایاں ہوتا ہے ویسے بغیر کہانی کے بھی اس میں بہت سی کامیاب مثالیں نظر آئیں گی۔

مظفر حنفی: مختصر افسانے کو افسانہ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی مختصر بھی۔ اس کیلئے وحدت تاثر بھی ضروری ہے۔ افسانویت مختصر افسانے کی روح ہے' اُسے افسانے کے رگ وپے میں یوں جاری وساری ہونا چاہئے جس طرح جسم میں خون۔ میرے خیال میں افسانویت سے عاری تحریر کو افسانہ کہنا ممی کو ذی حیات تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ افسانویت سے میری مراد اس مخصوص فضا سے ہے جو خالصتاً واقعہ نگاری' حقیقت کی عکاسی یا نفسیاتی ٹامک ٹوئیوں سے نہیں پیدا ہوتی۔ افسانویت حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت بنانے کے آرٹ کا نام ہے۔

ہربنس لال ساہنی: میرے خیال میں مختصر افسانہ کے بنیادی اجزاء وعناصر بھی وہی ہیں جو افسانہ کے ہیں۔ البتہ فنکار کے رویہ' اسلوب بیان اور تکنیکی صلاحیتوں کا اس

میں زیادہ دخل ہے۔مختصر افسانہ کو بہ لحاظ فن افسانہ یا طویل افسانہ کے لئے مختص مختصر بنیادی عناصر سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔البتہ مختصر افسانہ بیان وزبان کے لحاظ سے حشو وزوائد کی کثافت کو برداشت نہیں کرسکتا۔جیسا کہ افسانہ یا طویل افسانہ میں (بشرطیکہ یہ بھی کوئی صنف افسانہ ہو) بعض موجودہ دور کے افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔افسانہ نے (مختصر اور غیر مختصر کی پابندی سے قطع نظر) ہمیشہ ذہنوں کو متاثر کیا ہے۔موضوع کی آفاقیت' کرداروں کا تنوع وتناسب' زندگی اور سچائی کی ابدی قدروں تک رسائی' پرخلوص انداز واسلوب اور تاثر وہ عناصر ہیں جنھیں فن افسانہ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے'۔رہی ''افسانویت'' کی بات۔تو وہ افسانہ ہی کیونکر ہوا جس میں افسانویت نہ ہو۔وہ تجریدی افسانے جو افسانویت کے تاثرات اور واضح خدوخال سے عاری ہوتے ہیں۔اخلاق وابہام کی بدترین صورت ہوتے ہیں۔لیکن پھر بھی ایک منظّم گروہ بضد ہے کہ اسے افسانہ تسلیم کیا جائے۔بہرنوع اسی ضمن میں میری رائے قطعی صاف ہے۔آپ نے افسانویت کے بارے میں ''ضرورت'' کا لفظ لکھ کر تکلف سے کام لیا ہے۔ورنہ افسانہ میں افسانویت ہونا قدرتی بات ہے اس کے بغیر افسانہ کوئی اور صنف ادب ہوسکتا ہے افسانہ نہیں۔

مسیح الحسن رضوی: مرکزی خیال' الفاظ کی کفایت' افسانوی حقیقت۔پلاٹ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ افسانہ'' Anti story'' کے ذریعہ بھی کامیاب رہ سکتا ہے۔قرۃ کے اکثر افسانے اس کی مثال ہیں۔

اکرام جاوید: مختصر افسانہ میں ''فضا'' اور ''نقطہ نظر'' کو میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ ویسے مختصر افسانہ میں ''وحدت خیال'' کی بنیادی اہمیت سے خوب واقف ہوں! افسانویت سے میں ''قصہ پن'' مراد لیتا ہوں اور اسے افسانہ کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔

خموش سرحدی: ''مختصر افسانہ'' کے اکثر بنیادی عناصر بھی وہی ہیں۔ جو افسانہ کے ہیں۔ البتہ مختصر افسانہ کا ایک امتیازی عنصر ''ہیت کا جامع تنوع'' ہے، اپنے مخصوص مزاج کے لحاظ سے یہ ''صنف افسانہ'' فن کار سے تجربات ومشاہدات نیز داخلی وخارجی اثرات کے اظہار کے لئے رسمی اور سطحی کے برعکس گہری بصیرت اور ماہرانہ فن کاری کا مطالبہ کرتی ہے۔ جو بہ یک وقت تخلیق نگار کو لذت جاں سوزی وجگر کاوی اور قارئین افسانہ کو ''جو سُنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے'' کا احساس مسرت عطا کر سکے۔ ''مختصر افسانہ'' میں ''اسراریت'' کا عمل کام نہیں دے سکتا بلکہ افسانہ کی عام روش سے ذرا ہٹ کر اس سے داخلی تقاضوں کے لئے جذباتی آسودگی اور نفسیاتی تسکین کے سامان پیدا کرنے کا کام بدرجہ اتم لیا جا سکتا ہے۔ چونکہ فنکار کو مختصر افسانہ کے وسیلہ سے تھوڑے الفاظ میں اتنا اہم فریضہ سرانجام دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اسے اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے محرکاتِ افسانہ کے واضح خدوخال متعین کرنے پڑتے ہیں تا کہ تخلیق کے کسی مرحلہ پر اسے عدم تکمیل یا احساس ناکامی کا شکارانہ ہونا پڑے۔ مختصر یہ کہ ''مختصر افسانہ'' عام افسانے سے نازک تر صنف ادب ہے۔ جو مصنوعی لب ولہجہ یا ابہام واسرار کے وار نہیں سہہ سکتا۔ یہاں تک کہ ایک بے جوڑ جملہ بھی مختصر افسانے میں جھول پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس میدان میں جچی تلی بات تو کہی جا سکتی ہے۔ لیکن حشو وزوائد سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ جہاں تک ''افسانویت'' کا تعلق ہے میرے خیال میں وہ افسانہ ہی نہیں ہوسکتا جس میں افسانویت کا فقدان ہو۔ کیا ضروری ہے کہ افسانویت کے بغیر کسی تخلیق کو افسانہ ہی کہا جائے۔ البتہ یہ بات موضوع بحث ہوسکتی ہے۔ کہ افسانویت کیا ہے؟

سوال نمبر۳: عصر حاضر کے ایسے افسانہ نگاروں میں جنھیں تقسیم ہند سے قبل شہرت حاصل ہو چکی تھی آپ ذاتی طور پر کسے ترجیح دیتے ہیں اور کیوں؟

ڈاکٹر محمد حسن: بیدی، منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری۔
بیدی کو اس نرم اور چبھتی ہوئی رمزیت کی وجہ سے جو زندگی کا نیا عرفان بخشتی ہے۔ منٹو کو اس کی کھردری حقیقت پسندی اور انسان دوستی اور کردار نگاری کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر، کرشن چندر کو ان کی سجی ہوئی نثر اور رچی ہوئی رومانیت کی بنا پر، جس میں اُس دور کی عصری آگہی کو اُنھوں نے سبک رو اور شیریں انداز میں سمویا ہے، احمد ندیم قاسمی کو گردوپیش کی عارفانہ ترجمانی کی بنا پر اور حیات اللہ انصاری کو ''آخری کوشش'' کی بنا پر۔

جوگندر پال: افسانہ تخلیقی فنون سے وابستہ ہے۔ کسی ایک ہی موضوع پر پہلی ڈگری کے طلباء کی مشق نہیں۔ دریں حالات میں ایک فن کار کو دوسرے پر ترجیح کیونکر دے سکتا ہوں؟ اس ضمن میں ہمارے ادب کی متوسط الذہن تنقید کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بڑی بی خواہ مخواہ اپنے اوپر شہرت بانٹنے اور ترجیحوں کے فرمان صادر کرنے کی ذمہ داری لاد لیتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی: یہ سوال ذرا پیچیدہ ہے۔ پریم چند کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ ان کو دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کرنا میرے خیال میں درست نہیں۔ ان کی حیثیت دوسرے افسانہ نگاروں سے میرے خیال میں بالکل مختلف ہے۔ اُن کی حیثیت اُردو افسانوں میں حقیقت نگاری کے جنم داتا کی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے کے افسانہ نگاروں میں کسی کو کسی پر ترجیح دینے کا خیال عجیب سا ہے۔ سب نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اور اُن کے فن کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اُن میں اکثر ایسے لکھنے والے بھی ہیں۔ جنھوں نے شہرت کی طرف سے بے اعتنائی برتی اور خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ انھیں وہ شہرت نہیں مل سکی، جس کے وہ مستحق تھے۔ ایسی حالت میں ترجیح کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن مجموعی طور پر میں اردو کا

سب سے بڑا افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کو مانتا ہوں' جس کا ہر افسانہ پڑھنے کے بعد دل میں ایک کانٹا چھوڑ جاتا ہے۔ جو دیر تک کھٹکتا رہتا ہے۔ نئی پود کے افسانہ نگاروں نے گزشتہ دس برسوں میں کچھ اضافہ ضرور کیا ہے۔ لیکن یہ اضافہ معمولی سا ہے۔ افسانوں کے نام پر بہت سی ایسی چیزیں بھی آ گئی ہیں۔ جو اور کچھ ہو تو ہو افسانہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادھر دس برسوں کے اندر مجھے تو عیاث احمد گدی اور بشیشر پردیپ اور اقبال متین کے علاوہ کوئی اور افسانہ نگار نظر نہیں آتا۔ جس نے اچھے افسانے لکھے ہوں۔ اقبال مجید نے دو اچھے افسانے ضرور لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی اور نے بھی کچھ اچھے افسانے لکھے ہوں۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایسا کوئی نہیں ہے۔

کلام حیدری: میں ذاتی طور پر تقسیم ہند سے قبل شہرت پا لینے والوں اور آگے تک چلنے والوں میں کرشن چندر اور بیدی کو سبھوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے اس سوال کے جواب میں کوئی ایک ہی نام لینا چاہئے تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے میرا جواب مکمل نہیں ہوتا اس لئے میں معذرت کے ساتھ دو نام لے رہا ہوں۔

کرشن چندر کی حالت میرؔ کی شاعرانہ حیثیت جیسی ہے بلند، پست اور بہت پست! لیکن اس سے کرشن چندر کی اہمیت کی یکتائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کرشن چندر نے جس بلندی کو چھوا ہے۔ وہاں تک کوئی نہیں پہنچ پایا، بیدی بھی نہیں۔ کرشن چندر کے یہاں وسیع و بسیط دنیا ہے۔ اُس نے معیار کی کئی دنیائیں دریافت کی ہیں جبکہ بیدی کے یہاں گہرائیاں ہی گہرائیاں ہیں، وسعت نہیں، وہ پھیلاؤ نہیں۔ کرشن چندر کا فن ایک سمندر ہے جو حد نظر سے آگے پھیلا ہوا ہے' گہرا بھی ہے۔ اس سمندر کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنا اور پھر اس وسیع گہرائی میں پتہ نہیں بڑے بڑے پہاڑ، کتنی قیمتی کانیں اور گوہر ہیں۔ اُن کو تلاش کرنا کئی نسلوں کا کام ہے کرشن سے زیادہ بڑا جینئس افسانہ نگار اردو نے پیدا نہیں کیا ہے۔ کرشن جن جن دنیاؤں سے ہو آیا ہے وہ کسی کا نصیب نہیں۔ بیدی ماہر

صنّاع ہے وہ آدمی کے اندر کی دنیاؤں کو دریافت کرنے والا ہے اور کرشن کی طرح ایسا آزاد منش نہیں جو فقیروں کا بھیس بدل کر تماشا دیکھے' وہ سرتاپا متانت' گہرائی' صناعی اور جادوگری ہے۔ کرشن آزاد منش دنیا دنیا گھومنے والا وہ رشی ہے جو اپنے آپ کو کسی 'معیار' کا پابند نہیں بناتے' وہ خود معیار بناتے ہیں اور خود ہی مسمار کرتے ہیں۔ سوال میں جن افسانہ نگاروں کے نام لئے گئے ہیں اُن میں سے حیات اللہ انصاری اور عصمت چغتائی کا نام معیار سازوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ دس برس کے اندر آنے والوں میں سوائے غیاث احمد گدی اور جوگندر پال کے اور کوئی اُس سطح کو قائم بھی نہیں رکھ سکا جو اُنھوں نے بنائی تھی۔

شکیلہ اختر: کسی ایک کو ترجیح دینا غلط ہے' کرشن چندر' بیدی' منٹو' عصمت' قرۃ العین حیدر' ندیم' سب کے فن کے الگ الگ لطف ہیں پھر یہ بھی ہے کہ ہر فن کار کا ہر افسانہ معیاری نہیں ہوتا۔

ظفر اوگانوی: میں منٹو کو ترجیح دوں گا کہ منٹو کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں وہ تخلیقی ٹیلنٹ نہیں تھا جو منٹو کو ودیعت ہوا تھا۔ اور اس کے بعض ہم عصر نظریاتی زنجیریں اپنے پیروں میں ڈال چکے تھے۔ پھر وہ ہندوستان جس کو گاندھی جی نے دیہاتوں کا ملک کہا تھا اور پریم چند نے حالات کے تحت اپنی افسانہ نگاری کے لئے منتخب کیا تھا بعد کے بعض افسانہ نگاروں نے پریم چند کی روش کو بہت آسان سمجھ کر فیشن کے طور پر اپنا لیا تھا ،یعنی منٹو کے بعض ہم عصر ترقی پسند جبریت کے شکار تھے اور بعض شہروں میں رہ کر دیہاتی زندگی کے کرب کو خود پر مسلط کئے ہوئے تھے۔ مگر منٹو اپنے دور کا واحد افسانہ نگار تھا۔ جس نے یہ کمزور بے ساکھیاں قبول ہی نہیں کیں۔ وہ تو بس ذات کی ہمہ گیریت سے اثر قبول کر کے افسانے کی تخلیق میں مصروف رہا۔ اس کی جارحیت اس بغاوت سے بے حد مختلف تھی جو انگارے کے مصنفین نے برپا کی تھی۔ منٹو اردو افسانے کا وہ

ذہن تھا جو حال اور مستقبل کی پیچیدگیوں کا سمبل تھا اور اس کی یہ جمالیاتی پیچیدگی اسکی فکری انفرادیت کی رہین منت تھی۔

منٹو کے بعد، راجندر سنگھ بیدی کے یہاں منٹو کی سی sharpness تو نہیں ہے پھر بھی وہ اپنے ہم عصروں کی تخلیقی فکر سے عاری بھی نہیں ہیں۔ مگر میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اجتماعی کاوشوں کا سرے سے منکر بھی نہیں ہوں کہ انھوں نے مشترکہ طور پر اردو افسانے کو ایک نئی جہت ضرور دی تھی اور ترقی پسند جبریت کے باوجود انھوں نے اردو افسانے کے ارتقا میں عصری رول ادا کیا تھا۔

لیکن نئے بین الاقوامی سیاسی حالات کے تحت انسان جس غیر ارضی سماج کا ایک فرد بن گیا اور اس کی پیچیدگیوں کے نتائج سے ہندوستان میں ۱۹۵۰ء یا اس کے بعد جو اثرات نمایاں ہوئے۔ اس سے یہ ہوا کہ زندگی غیر مربوط ہوتی چلی گئی۔ کردار مسخ ہوگئے۔ لمحہ لمحہ اعتماد کی دیواریں ریت کی دیواروں کی طرح منہدم ہونے لگیں۔ اتوپیائی خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔ اور بین الاقوامی سماج میں اقتصادی اور ایٹمی لاٹھیوں سے اپنی اپنی بھینسیں ہانکی جانے لگیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ۵۰ء کے بعد کے ذہن کے مقابلے میں ۵۰ء اور پھر ۶۰ء کے بعد کا ذہن زیادہ پیچیدہ اور زیادہ بالیدہ ہوگیا۔ نیز وقت کے ساتھ ساتھ مسائل بھی وسیع تر ہوتے چلے جائیں گے۔ ایسے میں یہ سوال تحصیل حاصل ہے کہ نئی پود کے افسانہ نگاروں نے کیا گذشتہ دس برسوں میں افسانے میں توسیع و اضافہ کیا ہے۔

رشید امجد: میں تقسیم ہند سے قبل کے افسانہ نگاروں میں سے کسی کو دوسرے پر فوقیت دیتا ' کہ مجھے یہ سارے ایک ہی دائرے میں مقید نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو پڑھ لیجئے، سمجھئے سب کو پڑھ لیا ہے، سب ایک دوسرے کی دوہرائی ہوئی باتیں دوہراتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کوئی نیا افسانہ نگار ان میں سے کسی سے متاثر ہوا ہوگا؟

بلراج کومل: سعادت حسن منٹو کیونکہ وہ 'نوری' ہے نہ 'ناری'۔ وہ انسان کو اس کی مکمل غلاظتوں اور تضادات کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

امیر اللہ شاہین: راجندر سنگھ بیدی ان مقبول فن کاروں میں قابل ترجیح ہیں۔ یہ دور حقیقت کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرنے کا ہے۔ خواب گوں ابہام اور داستانوں خواب ناکی کا دور ختم ہو چکا۔ وہ موضوع کے اعتبار سے ہو کہ اسلوب کے لحاظ سے۔ بیدی نے ابتدا سے ہی اس راز کو پالیا تھا۔ دنیا بھر میں اس فکر کو جلا ملی ہے، بیدی نے اس رخ کو اختیار کر کے نہ صرف فکری بالیدگی کا ثبوت دیا ہے بلکہ ان عوامل کی ہم نوائی بھی کی ہے جن کی بلندی کی شہادت کائنات کے دوسرے گوشوں سے بھی ملی ہے۔ اسی لئے بیدی کو شہرت و شہابت ہاتھ آئی۔

کوثر چاندپوری: جو افسانہ نگار تقسیم سے قبل شہرت حاصل کر چکے تھے ان میں پریم چند' بیدی' کرشن اور منٹو کو میں ترجیح دیتا ہوں۔ پریم چند نے دیہاتی ماحول کو پوری حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بیدی اپنے گردوپیش کی زندگی کا مطالعہ بڑی گہری نگاہ سے کرتے ہیں اُن کو تحلیل نفسی اور کردار نگاری میں بھی کافی مہارت حاصل ہے اگرچہ وہ اکثر اوقات فن کو نظر انداز کر دیتے ہیں تاہم ان کے آرٹ میں حُسن' تاثیر اور کشش ہے۔ کرشن چندر معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار پر نگاہ رکھتے ہیں زندگی سے ان کا ربط بہت گہرا ہے وہ بیباک نگاری کے وصف سے بھی متصف ہیں ان کے موضوعات میں رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ منٹو کے فن میں بڑی گہرائی اور تاثیر ہے۔

ہرچرن چاولہ: تقسیم ہند سے قبل لکھنے والے افسانہ نگار ہمارے سامنے ہیں مگر جو زیادہ مقبول ہوئے اور جنھوں نے اردو افسانہ پر جاں توڑ عرق ریزی کی وہ یہی لوگ منٹو، بیدی، کرشن، قاسمی اور عصمت ہی ہیں۔ ان میں ذاتی طور پر مجھے منٹو زیادہ پسند ہے۔ بو، بابو گوپی ناتھ' کالی شلوار اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسی موثر' دل نشین اور گہری چھاپ

چھوڑنے والی کہانیوں کی وجہ سے۔

عطیہ نشاط: تقسیم ہند سے پہلے شہرت حاصل کرنے والے افسانہ نگاروں میں ذاتی طور پر مجھے عصمت چغتائی زیادہ پسند ہیں۔

مظفر حنفی: عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں تقسیم ہند سے قبل اپنا مقام بنا چکے تھے ذاتی طور پر میں بالترتیب راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ان کے افسانوں میں افسانویت ملتی ہے اور عصریت بھی۔

ہربنس لال ساہنی: بیدیؔ، کرشنؔ چندر، منٹوؔ اور احمد ندیم قاسمی میرے نزدیک ایسے افسانہ نگار ہیں۔ جنھیں میں ذاتی طور پر ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ مرحوم منشی پریم چند کے بعد عصری تقاضوں کے تحت زندگی کے تغیر پذیر عوامل سے انہی فن کاروں نے محرکات افسانہ کا کام لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی ناقابلِ فراموش تخلیقات سے اپنے دور کو بھی متاثر کیا ہے۔ اگر آپ نے ''تقسیم وطن'' سے پہلے کی شرط لگا کر راستہ روک نہ دیا ہوتا۔ تو ایسے اور بھی فن کاروں کا ذکر کیا جا سکتا تھا۔ جنھیں حالات کے تحت بھلے ہی شہرت نہ مل سکی ہو لیکن افسانوی ادب کو ان کی تخلیقات سے کچھ فائدہ ضرور ہوا ہے۔

اکرام جاوید: تقسیم ہند سے قبل شہرت یافتہ افسانہ نگاروں میں مجھے ممتاز مفتی اور راجندر سنگھ بیدی بہت زیادہ پسند ہیں۔ مختصر افسانہ کے فن اور مواد سے وابستہ ساری تو قعات اور کم وبیش ہر اہم شرط یہ دونوں پوری کرتے ہیں۔!

خموش سرحدی: منشی پریمؔ چند، کرشنؔ چندر، راجندرؔ سنگھ بیدی اور مرحوم منٹوؔ میرے خیال میں وہ معیاری افسانہ نگار ہیں جنھیں تقسیم سے پہلے ہی قبول عام اور شہرت تام کا درجہ مل چکا تھا۔ کیونکہ انھوں نے اعلیٰ انسانی قدروں کی شکست وریخت، معاشرے میں عدم توازن کی تخریب کاری، صنعتی تقاضوں کے تحت ابتدائی اخلاقی واقتصادی تصادم وتغیّر،

حیات وکائنات کے داخلی وخارجی انتشار واضطراب کے مظاہر اور اپنے دور میں جھلکتے ہوئے مستقبل کی تغیر پذیری کو ابھرتے ہی محسوس کرلیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے معصوم سادگی، پرخلوص لب ولہجہ اور دیانتدارانہ تابِ اظہار کے ساتھ ترجمانی کے فرائض ادا کئے۔ وجدان وآگہی کی صحیح رسائی ''APPROACH'' کے لحاظ سے ان فنکاروں کی معیاری تخلیقات عصری ادب کی نمائندہ شاہکار ہیں جنھیں افسانوں ادب کی تواریخ نظرانداز نہ کرسکے گی۔ بالخصوص مرحوم منٹو کو، جس نے اردو افسانہ میں کئی منفی کرداروں کی نقاب کشائی نہایت سلیقہ سے کرکے جہاں مردہ معاشرے پر غمناک قہقہے لگائے ہیں وہاں قاری کے سوز وگداز اور جنس وجمالیاتی شعور کو نئی ٹیس ٹپک بھی عطا کی ہے۔ افسانوی ادب کو بات کرنے کا جدید اسلوب دیا۔ اور زندگی کے ان بدبودار ناموروں کی مرہم پٹی کی جنھیں تہذیب وشائستگی کے نام پر نظرانداز کردیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں حسن عسکری، ممتاز شیریں اور عصمت چغتائی نے بھی کچھ جرأت مندانہ قدم اُٹھائے ہیں۔ ''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''؟

سوال ۳: (ب) پچھلی پود کے بعض افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو جس بلند سطح پر پہنچادیا تھا کیا آپ کے خیال میں نئی پود کے افسانہ نگاروں نے گزشتہ دس برسوں میں اس میں توسیع اور اضافہ کیا ہے؟

ڈاکٹر محمد حسن: کیا ہے مگر بہت کم!

جوگندر پال: اس سوال کے دوسرے حصے کا جواب کے دوسرے سوالنامے کے کسی سوال کے حوالے سے دے چکا ہوں۔

رتن سنگھ: یقیناً افسانہ نگاروں کی نئی پود میں اب تک ایک افسانہ نگار بھی ایسا نہیں ہے جسے پریم چند، کرشن چندر، بیدی، عصمت، حیات اللہ، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر کی صف میں ابھی کھڑا کیا جاسکے۔ لیکن نئے افسانہ نگاروں نے مجموعی طور پر یقیناً اردو

کے افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔اور یہ اضافہ ہے ایک نئی طرح کی SENSIBLITY کی شکل میں، جس نے اردو افسانے کو پُرانے دور سے نکال کر اسے نئی وضع کے خوبصورت اور دلکش کپڑے پہنائے ہیں۔

شکیلہ اختر: نئی پود نے مستحسن اضافے تو کئے ہیں لیکن تسلی بخش طور پر نہیں، اس کے علاوہ بہتر سے زیادہ تعداد کہتر کی ہے۔

رشید امجد: آپ کے اس سوال کے تیور بتاتے ہیں کہ سوال کرنے والا نئے افسانہ کی ترقی ورفتار سے مطمئن نہیں، ورنہ یہ سوال ہی نہ پیدا ہوتا کہ کیا واقعی نیا افسانہ آگے بڑھ رہا ہے؟ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ نئے افسانہ نے موضوعاتی طور پر جس وسعت کا اظہار کیا ہے اُس سے پُرانا افسانہ بڑی حد تک محروم تھا۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے جن افسانہ نگاروں کے نام لئے ہیں ان میں سے بہت سارے فکری طور پر اندر سے کھوکھلے ہیں۔اب وہ دور تو گیا جب داستان گو صرف زبان کے چٹخارے کی مدد سے اور داستان میں تکنیکی ہیر پھیر کر کے اپنا کام چلا لیتا تھا کہ اس کا اور اسکے دور کے قاری کا مبلغ علم اتنا ہی تھا لیکن اب علوم کی ترقی اور پھیلاؤ نے فکری افق کو وسیع کر دیا ہے، اب صرف تکنیکی ہیر پھیر سے کسی کو متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔

امیر اللہ شاہین: دراصل نئی پود کے افسانہ نگاروں نے ابھی کوئی ایسا کارنمایاں سرانجام نہیں دیا جو انھیں ممیّز وممتاز کر دے۔اسکا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُنھیں ممتاز کرنے والے حالات مستقبل میں کہیں پوشیدہ ہیں۔یہ صحیح ہے کہ وہ ترقی کی کسی ایک ایک جہت پر نہیں رُکے۔وہ کوشاں ہیں نئی ترقیوں کے لئے، نت نئے تجربے دل آویز بھی ہیں۔تاہم ایک بات میں بڑی کمی ہے۔وہ ہے زبان برتنے کا سلیقہ۔گزشتہ دس برسوں میں منجھے ہوئے افسانہ نگار اور منجھ گئے نومشق کہنہ مشق بنے۔عصمتؔ اور منٹوؔ نے جو زبان اختیار کی وہ نئے سماجی شعور کی آئینہ دار ہے۔کرشن چندر، حیات اللہ انصاری

'احمد ندیم قاسمی کے ہاں زبان کے جو تجربے ملتے ہیں وہ زمانے کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ان میں جن کے ہاں رنگینی ہے اسی کے پہلو بہ پہلو حقیقت کا انعکاس بھی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس عرصے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ان کی ابتدائی تحریروں میں جو اکھڑا اکھڑا انداز تھا وہ نہ صرف ختم ہوا ہے اس میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا ہوا ہے۔یہ زبان ان خیالات کی سچی آئینہ دار ہے جن کو سب نے پیش کیا ہے۔

ہرچرن چاولہ:پریم چند ۔منٹو۔بیدی ۔کرشن چندر ۔حیات اللہ ۔عصمت چغتائی۔قاسمی ۔قرۃ العین حیدر۔احمد علی اور پچھلی پود کے دوسرے افسانہ نگاروں نے افسانہ کو جہاں چھوڑا تھا جیسے وہیں کا ہو کر رہ گیا۔جیسے کسی نے اُس کے پاؤں میں کیلیں گاڑ دی ہوں۔افسانوں کی متاثر کُن اور چونکانے والی جو تعداد یکے بعد دیگرے سامنے آتی گئی تھی جیسے اُس میں بریک لگ گئی یا اُس کی رفتار اتنی سُست ہوگئی کہ یہ گاڑی ہمیں اپنی سست رفتاری کی وجہ سے ایک جگہ کھڑی سی نظر آنے لگی۔بہت کم افسانوں نے اپنا اثر چھوڑا اور وہ بھی جلدی مٹ کر رہ گیا یا دو چار اچھی کہانیاں لکھنے کے بعد نئے افسانہ نگار ایسا گہرا غوطہ مار گئے کہ کافی کافی عرصے تک اُبھر کر سامنے ہی نہ آسکے۔

عطیہ نشاط:نئی پود کرشن چندر،عصمت،قرۃ العین،بیدی،منٹو،خواجہ احمد عباس وغیرہ کی پود سے آگے بڑھنا کجا اسے بھی برقرار نہیں رکھ سکی اس لئے کہ کوئی چیز ایک جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔اس راہ میں بلندیاں حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے خاص طور پر تجربہ کی وادیوں میں نئے لوگ سرگرداں ہیں لیکن اس میں بھی جو حالت ہے وہ پہلے سوال کے جواب میں کہی جا چکی ہے۔

مظفر حنفی:پچھلی پود کے افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو جس بلندی پر پہنچا دیا تھا نئے

پود کے افسانہ نگار اُس میں کوئی توسیع واضافہ نہیں کر سکے کیونکہ نئی پود کے سفر کا رُخ دوسری سمتوں میں ہے۔

ہربنس لال ساہنی: میرے خیال میں نئی پود کے کچھ سنجیدہ اور حساس کہانی کاروں نے اس سلسلہ میں کچھ کام ضرور کیا ہے۔اور تسلیم کرنا ہوگا کہ فن افسانہ کو پچھلی ایک دہائی میں واقعی ''جدید معیار'' سے روشناس کرایا گیا ہے۔لیکن تدریجی ارتقا کا یہ حمل تسلی بخش رفتار سے نہیں ہوا۔غالباً اس لئے کہ جدید فن کاروں میں تخلیقی فن کار کم تھے۔اور سازشی دماغ رکھنے والے زیادہ۔جنھوں نے افسانے کی ''رفتار ترقی'' میں پُر خلوص تعاون دینے کی بجائے ذاتی نام ونمود کے لیے منظّم کوششیں کی ہیں۔تاہم اردو ادب میں ہم افسانے کے عصری معیار اور تدریجی ترقی کے عمل سے آپ اس کے خوشگوار مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسیح الحسن رضوی: منٹو، بیدی، قاسمی۔نئی پود میں اگر انتظار حسین کو شامل کیا جائے تو اس نسل نے فنی بلندیوں تک پہنچنے کی ضرور کوشش کی۔انتظار حسین بڑا کامیاب افسانہ نگار ہے۔گو کہ عصری معنوں میں ترقی پسند نہیں۔

اکرام جاوید: پچھلی پود کے افسانہ نگاروں نے جس ماحول اور فضا میں اردو افسانہ کو جس بلند فنی سطح تک پہنچایا تھا، نئی پود کے افسانہ نگار گذشتہ دس برسوں میں اس میں توسیع واضافہ نہیں کر سکے۔اس کی کئی وجوہات ہیں اور سب سے بڑی وجہ اُس ''ماحول اور فضا'' کا خاتمہ ہے جس میں اردو افسانہ فنی بلندی کی ایک سطح تک پہنچا تھا۔

خموش سرحدی: اس ضمن میں نئی پود کے بعض افسانہ نگاروں نے کچھ ارادی وغیر ارادی کوششیں ضرور کی ہیں۔لیکن توسیع واضافہ کے مقاصد کو معتد بہ فائدہ نہیں ہوا۔بحرانی دور کے فن کار جن سے کچھ اُمیدیں وابستہ تھیں ناکامی ونامرادی، شکست وتنہائی، اور متحرک زندگی کے نشیب وفراز سے سہمے ہوئے، احساس کمتری میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

اور ذمہ داریوں سے فرار کی راہیں اختیار کر کے گوشۂ عافیت کی تلاش میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان فن کاروں کی بہتر صلاحیتیں ان کارناموں (ادبی کارناموں) سے خراج نہیں لے سکیں جوان کے پیش رو لے چکے ہیں۔ اگر چہ ''اردو افسانہ'' کے پچھلے دس برسوں کو جمود و سکر کا زمانہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس زمانہ میں توسیع و ترقی کے وہ نمایاں آثار بھی نہیں ملتے۔ کہ اسے ترمیم و تجربہ' اور توسیع و اضافہ کی معقول جدّتوں کا زمانہ کہا جائے۔

سوال۴: آپ کے خیال میں ۱۹۵۰ء کے بعد مشہور ہونے والے کن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے؟

ڈاکٹر محمد حسن: قاضی عبدالستار، جوگندر پال، رام لال، رتن سنگھ، عیاث احمد گدی اور بلراج منیرا۔

جوگندر پال: اُن افسانہ نگاروں کے سوا جو افسانے کی ترقی کی بجائے محض اپنی ذات کی آڑی ترچھی' مشکوک ترقی سے OBSESSED رہے' دیگر فنکاروں کی کوششیں بارآور معلوم ہوتی ہیں' البتہ یہ بھی ہے کہ وقت ان کی بھی کانٹ چھانٹ سے باز نہ آئے گا اور REVALUATION میں ان میں سے بھی شاید صرف دو چار کا فن ہی بدستور تازہ دم موزونیت کا حامل رہے۔

سہیل عظیم آبادی: ۱۹۵۰ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے فن کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا۔ اُن میں جیلانی بانو' واجدہ تبسم' غیاث احمد گدی' احمد یوسف' بشیشر پردیپ' رام لعل' اقبال متین' کلام حیدری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ اور نام چھوٹ گئے ہوں۔

رتن سنگھ: انتظار حسین، رام لعل' جوگندر پال' مسیح الحسن رضوی' واجدہ تبسم' اقبال مجید' اقبال متین اور سریندر پرکاش اور جیلانی بانو زیادہ پسند ہیں۔

کلام حیدری: نام لینا بڑا خطرناک کام ہے لیکن آپ دار پر چڑھانا ہی چاہتے ہیں تو سنئے بلاترتیب اور بغیر کسی ریمارک کے۔قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، انور سدید، احمد یوسف، اقبال متین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ام عمارہ، انور عظیم، رام لعل، بلراج منیرا، سریندر پرکاش، نزہت نوری، شوکت صدیقی وغیرہ وغیرہ۔

شکیلہ اختر: قاضی ستار، رام لعل، غیاث احمد گدی، اے حمید، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی وغیرہ۔

ظفر اوگانوی: اگر اردو افسانے کے نقشے پر کوئی خط تقسیم نہ کھینچا جائے تو انتظار حسین، عبداللہ حسین، انور سجاد، خالدہ اصغر، انور عظیم، عابد سہیل، اقبال متین، بلراج مین را، سریندر پرکاش اور (بزعم خود) ظفر اوگانوی نے ۵۰ء ۶۰ء کے بعد نمایاں حصہ لیا ہے۔ویسے صرف ''حصہ'' لینے والوں کی تو اپنی اپنی مرضی اور پسند سے بھی کافی فہرست بنائی جاسکتی ہے۔

رشید امجد: انور سجاد، بلراج منیرا اور سریندر پرکاش وغیرہ۔

بلراج کومل: بہت سے نئے افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کے امکانات کو توسیع دینے کی کوشش کی ہے۔ترقی فی الحال اس سلسلے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

امیر اللہ شاہین: بلونت سنگھ، رام لعل، بلراج کومل، بلراج منیرا، احمد ہمیش، جیلانی بانو۔

کوثر چاندپوری: جن افسانہ نگاروں نے ۱۹۵۰ء کے بعد مقبولیت حاصل کی اور افسانے کی رفتار ترقی میں رام لعل، انور عظیم، شوکت صدیقی دیوندر اسر، اے حمید، انتظار حسین اور بعض جدید تر افسانہ نگاروں کا نام لیا جاسکتا ہے، رام لعل ۱۹۵۰ء سے قبل بھی منظر عام پر آچکے تھے لیکن اس کے بعد ان کی مساعی اور زیادہ تیز ہوگئیں، اور ان کی فن کارانہ چابکدستی کا اظہار ہوتا رہا۔

ہرچرن چاولہ: ۵۰ء کے بعد مقبول ہونے والے افسانہ نگاروں میں رام لعل، شوکت

صدیقی، دیوندر اسر اور جوگندر پال نے افسانوی ادب پر صدق دلی سے عرق ریزی کی اور قاری کو اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کی طرف متوجہ کیا مگر پھر دو چار کو چھوڑ کر باقی کی لکھنے کی رفتار اتنی سُست رہی کہ ان کے افسانہ یا افسانوی مجموعے تقریباً نفی کے برابر سامنے آئے شاید اُن کے سامنے مندرجہ بالا محرکات نہیں تھے اور نہ ہی تقسیم سے پہلے کے اردو رسائل کی وہ تعداد اور مقبولیت۔

عطیہ نشاط: ۱۹۵۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں میرے نزدیک یہ لوگ نمایاں ہیں۔ غیاث احمد گدی۔ آمنہ ابوالحسن۔ جیلانی بانو۔

مظفر حنفی: بلونت سنگھ، جوگندر پال، قاضی عبدالستار، رام لعل، غیاث احمد گدی، ستیہ پال آنند، اقبال فرحت اعجازی، شوکت صدیقی، جیلانی بانو، اقبال مجید، واجدہ تبسم، رتن سنگھ، انور عظیم، بلراج منیرا، سریندر پرکاش، مسعود اشعر، رشید امجد، کمار پاشی، دیوندر اسر، احمد شریف وغیرہ نے ۱۹۵۰ء کے بعد اردو افسانہ کی ترقی کیلئے وقتاً فوقتاً کامیاب کوششیں کی ہیں۔

ہربنس لال ساہنی: یہاں کسی ایک افسانہ نگار کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ کسی ایک فن کار کی جملہ تخلیقات معیاری و مستند نہیں ہوسکتیں۔ البتہ محترمہ قرۃ العین حیدرؔ، جنھیں تقسیم وطن کے بعد شہرت نصیب ہوئی ہے۔ ایسی فن کار ضرور ہیں جنہیں بحیثیت مجموعی ''مقبول'' کہہ دینا بیجا نہ ہوگا۔ لیکن مقبول افسانہ نگار کے طور پر انھوں نے افسانہ کی ترقی کیلئے کیا کچھ کیا ہے؟ یہ غیر متعلقہ لیکن قابل غور بات ہے؟ افسانہ اور اس کی رفتار ترقی کے مسائل اجتماعی کوششوں سے وابستہ ہیں، نہ کہ انفرادی مساعی کے ساتھ، اگرچہ اُردو افسانہ نگاری کی عمر بہت نہیں۔ تاہم اس نے عروج و ارتقاء کے جو مراحل طے کئے ہیں۔ وہ پچھلے پچاس برسوں کی مشترکہ اور اجتماعی سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہیں

مسیح الحسن رضوی: آپ شوکت صدیقی، قاضی عبدالستار کا نام اس سلسلے میں لے سکتے

ہیں۔رتن سنگھ کا بھی۔رام لعل اگر کم لکھیں تو ان کا بھی۔

اکرام جاوید: ۱۹۵۰ء کے بعد مقبول ہونے والے تقریباً سب ہی افسانہ نگاروں نے اپنی سکت اور صلاحیت کے مطابق اردو افسانہ کی ترقی میں ''خاموش'' اور ''نمایاں'' حصہ لیا ہے۔

خموش سرحدی: اس سلسلہ میں قرۃ العین حیدر، اقبال متین، جوگندر پال، عیاث احمد گدی، راج، رتن سنگھ، ہربنس لال ساہنی، انور سجاد اور انتظار حسین (اس صف کے کچھ اور فن کار بھی ہو سکتے ہیں) صفِ اوّل کے فن کار ہیں۔جنھوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد جدید افسانہ کیلئے صاف ستھری راہیں متعین کی ہیں۔اس ضمن میں کچھ ایسے کہانی کاروں کی تخلیقی سوجھ بوجھ کا اعتراف بھی کیا جانا چاہئے، جنھوں نے پرانی روایات کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کے جدید محرکات سے بھی استفادہ کیا ہے اور فن کے اصولوں پر گہری نظر رکھی ہے۔اگر ۱۹۶۰ کی اسی پابندی کو نظر انداز کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا جائے۔ہمیں ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، ابوالفضل صدیقی، غلام عباس اور جمیلہ ہاشمی جیسے ذہین اور تجربہ کار افسانہ نگاروں کا رواں دواں قافلہ بھی نظر آتا ہے۔جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ افسانوی ادب کے کم وبیش ہر زاویے سے گہرے رابطہ کا اظہار کیا ہے۔ایک دہائی سے کچھ پہلے اور بعد کے یہی وہ ارباب قلم ہیں۔جنھوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر جدید رجحانات کے تحت فن افسانہ کو نکھارا اور اس کی رفتارِ ترقی میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

سوال ۵ (الف):۔ تجریدی اور تمثیلی افسانہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سوال ۵ (ب):۔ کیا تجریدیت سے افسانے کی ارضیت مجروح ہوتی ہے؟

ڈاکٹر محمد حسن:۔یہ دونوں واقعاتی افسانے سے کہیں زیادہ مشکل ہیں اور اُن کے ساتھ صرف اس وقت انصاف کیا جا سکتا ہے جب افسانہ نگار کا وژن اتنا واضح ہو کہ تجرید اور

تمثیل میں بھی روشنی، تابنا کی اور واضح معنویت پیدا کر سکتا ہو۔ارضیت کے بغیر آفاقیت ممکن نہیں لیکن ارضیت کے معنی بیانیہ افسانے کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ عصری آگہی اور ماحول کے گہرے مشاہدے کے ہیں جن کے بغیر اچھا افسانہ لکھنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا: تجریدی یا تمثیلی افسانہ کہانی بیان کرنے کا ایک نہایت کارآمد اور وقیع سلسلہ ہے مگر جیسا کہ قاعدہ ہے ہر مقبول صنفِ ادب کچے اذہان کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ تجریدی افسانہ نے بھی بہت سے ناپختہ اذہان کی سہل انگاری کے لئے سنہری موقع عطا کیا ہے مگر کسی رجحان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے اس کے تحت لکھی گئی عمدہ تخلیقات ہی کو معیار بنانا چاہئے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہر چند کہ تجریدی افسانے کو اردو ادب میں داخل ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا، تاہم اس نے ابھی سے توانائی کا ثبوت دینا شروع کر دیا ہے۔ اردو میں تجریدی یا تمثیلی افسانہ یقیناً ایک نہایت اہم اضافہ ہے لیکن ''کا تا اور لے دوڑی'' قسم کے افسانہ نگاروں نے اسے بدنام بھی کیا ہے؛ ان لوگوں نے ''چونکانے'' کی کوشش زیادہ کی ہے اور یہ بات خود ان کے حق میں مضر ثابت ہوتی ہے۔

جوگندر پال: ارضیت سے یہ مطلب اخذ کرنا حماقت ہے کہ کوئی مخصوص شکل ہی کسی شخصیت کی پہچان کا واحد وسیلہ ہے۔تخلیق بڑا Fluid فن ہے لہٰذا اس کی بیک وقت کئی شکلیں ممکن ہیں؛ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے نظارے سے اس کی کوئی شکل صرف ہمارے ذہن میں ہی بن پائے یعنی یہ ہمیں اپنے اپنے آپ میں نظر آنے کی بجائے اپنے ذہن میں دکھائی دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیدھی سادہ خارجی شکلیں فنی اعتبار سے ناقابل توجہ ہیں۔عین ممکن ہیں کہ خارجی نشانات کی بدولت ہی ہم بالاتر روح اپنی گرفت میں لاسکیں۔فنِ لطیف دراصل انسانی تجسس کی تحریک سے عبارت ہے۔بس سراغِ رسانی میں جُٹے رہئے اور باطن یا خارج کے کسی ثبوت کے امکانات کو

نظر انداز کیجئے فن کو محض اُس کی تجرید یا تمثیل کے باعث اچھا یا برا نہیں سمجھا جاتا، اور نہ ہی محض یہ یا وہ علامت اُس کی پوری پہچان میں ہماری معاون ہوتی ہے۔ ان کی پوری شخصیت سمجھنے کے لئے میں وہاں بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے جہاں وہ غائب ہے، یا کسی دوسرے چہرے میں حاضر ہے۔ فن کوئی Taken For Granted قسم کی چیز ہوتی تو ہم اس کے طے شدہ اسباب کی اس کے بارے میں کوئی دوٹوک لہجہ اختیار کر سکتے تھے، مگر ایسا نہیں ہے۔ تجربہ اور تمثیل کہانی کے دو ٹولز ہیں اور بس، اور ظاہر ہے وہ اپنے مناسب استعمال کے مناسب نتیجے کی وجہ سے اہم ہیں۔ سٹین گن ہو یا کند چاقو، اُس کا بے جا استعمال قتل کے ارتکاب کا باعث ہوسکتا ہے۔

سہیل عظیم آبادی: تجریدی اور تمثیلی افسانوں کے متعلق میری رائے محفوظ سمجھے۔ کم سے کم مجھے پسند نہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنا ہو تو افسانہ نگار کو پاس بیٹھا لیجئے۔ پھر پڑھیئے تاکہ وہ اس کا مطلب آپ کو سمجھتا جائے۔ میں تو کم سے کم نہیں سمجھ پاتا۔ اس انداز کے لکھنے والوں میں مجھے بلراج منیرا کی دو تین کہانیاں پسند آئیں۔ ورنہ دوسرے تو کیا لکھتے ہیں۔ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور اب تو اس قسم کی کہانیاں پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ سمجھ میں آتیں نہیں۔ سر مارنے اور وقت خراب کرنے سے فائدہ؟ اس میں کوئی شک نہیں کی تجریدیت افسانے کی ارضیت کو مجروح کرتی ہے۔ اور ارضیت کے بغیر افسانے میں آفاقیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

رتن سنگھ: میرے خیال میں افسانے کو حدوں میں باندھ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ افسانہ کی کوئی بھی شکل ہوسکتی ہے۔ شرط صرف روانی کی ہے اور روانی ایک طرح کی نہیں ہوتی۔ جب دریا میں گھمن گھیر پڑھتے ہیں، تب پانی سیدھا چلنے کے ساتھ ساتھ الٹی طرف بھی چلتا ہے طرح طرح کی چکر بھی کاٹتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات پانی کی اوپری تہہ کے نیچے ایک اور تہہ ہوتی ہے جو بہت دور تک اُلٹی طرف چلتی ہے۔ جس

طرح پانی ہر نشیب و فراز میں ڈھل جاتا ہے‘ اس طرح افسانے کی شکل بھی ہر موضوع کے ساتھ بدل جاتی ہے۔

کلام حیدری: تجریدی افسانے ابھی ابتدائی منزلوں میں ہیں‘ بعض‘ ایک حد تک کامیاب بھی ہیں لیکن ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے کچھ اور صبر سے کام لینا پڑے گا۔ ارضیت‘ آدمی کا مقدر ہے‘ یہ خیال مجھے بنیادی طور پر غلط معلوم پڑتا ہے کہ تجریدی تخلیقات میں ’’ارضیت‘‘ نہیں ہوتی‘ اس سے مفر ناممکن ہے۔

شکیلہ اختر: آرٹ کے مختلف میلان ہوتے ہیں‘ تجریدیت کوئی بُری چیز نہیں‘ فن کار اچھے اور بُرے ہوتے ہیں۔ نوسکھوں کے لئے تجریدیت زہر ہلاہل ہے‘ بڑا فن کار ہی تجریدی رنگ کے شہکار پیش کرسکتا ہے‘ ارضیت دونوں سے انسانی روح کو تسلی ہوسکتی ہے‘ ارضی افسانے انسانی نفس کے دو اہم میلانات ہوتے ہیں‘ تجریدیت اور ارضیت‘ دونوں سے انسانی روح کو تسلّی ہوسکتی ہے‘ ارضی افسانے بھی بُرے ہو سکتے ہیں اور تجریدی بھی۔ فن کار مواد اور میلان سے بلند ہوتا ہے‘ فن کار کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ انھیں کس کس طرح برتتا ہے‘ وہ خواب و خیال سے کہانی بناتا ہے یا آب و گِل سے میلان پر تنقید کرنی غلط ہے‘ فنی نمونوں پر تنقید ہونی چاہئے۔

ظفر اوگانوی: ایک فن کار اس وقت بڑا ہوتا ہے جب وہ اپنے پیچیدہ، منفرد اور لطیف ترین احساسات کو دوسروں تک بعینہٖ منتقل کرنے کے لئے ایک منفرد اور لطیف ذریعۂ اظہار اپناتا ہے۔ مگر یہ منفرد میڈیم دوسروں کے لئے نامانوس اس لئے ہوجاتا ہے کہ وہ فن کار کی ذہنی پیچیدہ ساخت تک اول تو پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور دوم یہ کہ جن میں صلاحیت ہے بھی تو ان کی ذہنی تربیت اس فضا اور ماحول میں ہوئی ہے جس میں پیچیدگی کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف خود اس فن کار کے لئے اپنے اس تجریدی یا تمثیلی ذریعے اظہار میں نیا پن تو ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا

ذریعہ اظہار خود اس کے لئے اجنبی بن جائے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ فن کا اپنے منفرد تجربات کی ترسیل کے لئے مانوس علامتوں، استعاروں اور تراکیب سے ہٹ کر کچھ اپنے طور پر علامتوں اور تراکیب سے نئے پیکر اور حسی پیکر بھی تراشنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اور علامتوں کی تخلیق میں وہ بعض الفاظ یا گوشے اس طرح کے پیدا کرتا ہے جس سے ذہین قاری علامت کی اس سطح تک پہنچ جائے جہاں وہ قاری کو لے جانا چاہتا ہے۔

لیکن تجریدی افسانوں میں صرف Flashes ہوتے ہیں جبکہ تمثیلی افسانوں میں کبھی مربوط اور کبھی غیر مربوط سلسلے سے کردار کو سمبل بتایا جاتا ہے۔ کبھی واقعہ اور کبھی فضا سے علامتوں کی مجموعی تمثیل کا مصرف لیا جاتا ہے۔ تمثیلی افسانے میں کم سے کم دو سطحوں کا ہونا ضروری ہے۔ سطح کے اوپر ایک مفہوم ہوتو ہے اور سطح کے نیچے دوسرا اور سطح کے نیچے ہی افسانہ نگار کا حقیقی تاثر روپوش ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بنین کی Pilgrim Progress جو اپنی اوپری سطح میں بچوں کیلئے پریوں، دیوؤں، محلوں اور خوشگوار کی کہانی ہے اور نچلی سطح میں عیسائیوں کے لئے اس روح کی کہانی ہے جو شہر تخریب سے شہر تقدیس کا سفر کرتی ہے، کافکا اور تھامس مان کے یہاں نئے تمثیلی افسانوں کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں.....اردو میں تجریدی افسانوں کا تجربہ کیا تو گیا ہے مگر کوئی کامیاب نہیں ہوسکا۔ مگر تمثیلی افسانے مثال کے بعد باضابطہ طور پر اور بہت زیادہ لکھے گئے ہیں۔

تمثیلیت یا تجریدیت سے افسانے کی ارضیت مجروح ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا کیوں کہ اب ارضیت کا وہ تصور نہیں ہے جو کبھی تھا۔ اب اس جغرافیائی اور ملکی حدود سے نکل کر وہاں پہنچ چکی ہے جہاں صرف ذاتی اور شعوری ارضیت کی اہمیت باقی رہ جاتی ہے۔ بہت ہی معمولی اور ذیلی فرق کے ساتھ ہر ایک فن کار وقت اور مسافت کے وسیع ترین مفہوم کا عادی ہو چکا ہے اور نیا فن کار غیر ارضیت سے ارضیت کی طرف

آتا ہے کیونکہ اس کے پہلے قاری وہ ہیں جو اس کے آس پاس رہتے ہیں اور اس کی زبان اور اشارے کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس بنیادی اور ظاہری صورت میں فن کار بھی مقامی زبان، علامتوں، استعاروں اور تراکیب کے ذریعہ ترسیل پر مجبور ہے، مگر یہ میڈیم چونکہ فن کار کی غیر ارضی کی راہ میں حائل نہیں ہوتا ہے اس لئے نئے فن کار کے سامنے ارضیت یا مقامیت وغیرہ کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہ گیا ہے جتنا چند سال کے افسانہ نگاروں نے اس کو اپنے ساتھ چپکا رکھا تھا۔

رشید امجد: شعوری طور پر جب بھی کسی چیز کو دوسرے پر ٹھونسا جائے گا' اس کا ردعمل ہمیشہ منفی ہوگا۔ تجریدیت ایک بے ساختہ عمل ہے لیکن جب افسانہ نگار محض و برائے نام' شہرت کے لئے اسے ذریعہ بناتے ہیں تو یہ منفی رجحان کی نشاندہی کرتی ہے۔ افسانہ نگار اسے خلوص کے ساتھ فطری اندازی میں تو افسانہ میں نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ساری باتیں لکھنے والے کے اپنے خلوص اور جذبہ سے متعلق ہیں کہ وہ کسی چیز کو کسی حد تک محسوس کر کے لکھ رہا ہے اور کس حد تک محض برائے نام انفرادیت کے لئے۔

بلراج کومل: افسانہ بہرحال افسانہ ہوتا ہے۔ تجریدی یا تمثیلی یا علامتی محض الفاظ ہیں ان کے استعمال سے کسی افسانے کا کردار تخلیقی سطح پر بلند نہیں ہوسکتا۔ اردو کے اکثر نئے ادیب محض الفاظ کے اسیر ہیں ہر اچھا افسانہ انسانی تجربے کے کسی پہلو کا عزیز ترین گوشہ پیش کرتا ہے اور پڑھنے والا اسی عزیز گوشے کو پہچاننے کے بعد افسانے کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ تجریدی اور علامتی، محض فیشن ساز تنقید کے Catch Words ہیں۔ ارضیت ہی سے افسانے کی آفاقیت برقرار رکھی جاسکتی ہے۔

امیر اللہ شاہین: بہرحال افسانہ ہے۔ اس کی معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ رہی ارضیت کی بات تو ارضیت یقیناً متاثر ہوتی ہے۔ تاہم خیال ہے کہ افسانہ بہرحال

افسانہ ہے اس میں ارضیت کی بھی ایک حد خاص تک گنجائش ہے۔ افسانویت لازمی ہے جو کسی بھی ذریعہ سے حاصل کی جاسکتی ہے تجریدی انداز ہو کہ تمثیلی پیرایۂ بیان تاہم واضح ہو کہ اگر ان انچھروں سے بات ناقابل فہم اور فکر ذولیدہ ہو تب وہ افسانہ نہیں لطیفہ ہو جائے گا۔

کوثر چاند پوری: تجریدی یا تمثیلی افسانہ کے متعلق میری رائے بری نہیں۔ ان کو افسانے کی ایک ایسی شاخ جانیے، جس کا بارآور ہونا ممکن ہے جہاں تک تجریدیت اور ارضیت کا تعلق ہے۔ تجریدیت سے ارضیت کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے اور ارضیت کے بغیر آفاقیت کا حاصل ہونا توقعات کے مطابق نہیں، افسانہ کا بنیادی عنصر زندگی ہے جو ارضیت ہی کی پیداوار ہے۔

ہرچرن چاولہ: تجریدی اور تمثیلی افسانہ ابھی تک ایک مداری کا پٹارہ بنا ہوا ہے اور نہ ہی اس پر ابھی کھل کر بحث ہوئی ہے یا لکھا گیا ہے کچھ افسانوں پر آپ نے جن ادّبا کے خیالات جانچے اور شائع کئے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ خود ہی ایک جادونگری میں پھنس کر رہ گئے ہیں جس کے باہر نکلنے کے دروازے اُنھیں خود معلوم نہیں۔ ہر افسانہ نگار یا ناقد نے افسانے کے اس تالے کو نئی نئی چابیوں سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے قاری کا ذہن اور پیچیدہ ہو کر رہ گیا ہے اور وہ تالے کی اصلی چابی سے ناواقف ہے۔ کچھ نے کھلے بندوں کتاب کے صفحات پر ہی اسے ایک پہیلی کا نام دیا ہے اور پہیلی کو سب کا ایک ہی نام سے بوجھ لینا ناممکن نہیں تو مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ضرور ہے۔ اس پر ناقدین کے مضامین بھی اتنے کم شائع ہوئے ہیں کہ بات کھل کر سامنے آ ہی نہیں سکی مگر اتنا ضرور محسوس ہوا ہے کہ افسانے نے وقت کے ساتھ خود بخود ہی ایک نیا موڑ مڑا ہے۔ افسانے کی گاڑی میں سوار ہر آدمی (افسانہ نگار) کے جسم (ذہن) نے اس موڑ کے ساتھ ایک بل کھایا ہے یہی انسانی سانس اور زندگی کا اصول ہے مگر کئی لوگ خواہ مخواہ

اس قدر ایک طرف جھک اور مُڑ گئے ہیں کہ وہ گاڑی کیلئے ہی خطرے کا سبب بن گئے ہیں۔ پرانا افسانہ ایک فوٹو تھا جسے اُتارنے سے پہلے فوٹو گرافر (افسانہ نگار) مختلف اطراف سے بہت بڑی بڑی روشنیاں ڈال ڈال کر اُتارتا تھا۔ اُسی فوٹو کو نیا افسانہ نگار اس کے اصلی لائٹ اور شیڈ کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتار لیتا ہے۔

عطیہ نشاط: آج کل تمثیلیت کی طرف ادب کے تمام اصناف کا رجحان ہے۔ اچھی تمثیل میں بڑی معنویت ہوتی ہے اور اس طرح بات ایسی اچھی طرح کہی جاسکتی ہے جو سادہ اور سلیس طرز اظہار میں ممکن نہیں اور سچ پوچھئے تو مختصر افسانہ خود ہی ایک تمثیل کے پیرایہ تجربہ کا اظہار ہے لیکن تمثیلی انداز یا تجریدی انداز جدید افسانے کی خصوصیت ہے وہ میرے نزدیک عظیم افسانے نہیں پیدا کرسکتا اور نہ اس طرز کی مقبولیت اچھے نتائج لاسکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض اچھے اور کامیاب نمونے سامنے آگئے ہیں۔ لیکن اس رجحان سے مجھے زیادہ اُمید نہیں۔

مظفر حنفی: تجریدی اور تمثیلی افسانوں کے بارے میں میرا خیال نیک ہے۔ بے شک تجریدیت سے افسانے کی ارضیت مجروح ہوتی ہے لیکن میں اس خیال سے متفق نہیں کہ ارضیت کے بغیر افسانہ کو آفاقیت نصیب نہیں ہوتی ورنہ ہم اب تک ایڈگر ایلن پو اور آسکر وائلڈ وغیرہ کو فراموش کر چکے ہوتے۔ البتہ افسانے میں شعری اصنافِ سخن جیسے گاڑھے ابہام کی گنجائش نسبتاً کم ہے کہ نثر تشریح وابلاغ کا مطالبہ کرتی ہے۔

ہربنس لال ساہنی: تجریدی اور تمثیلی افسانے وقت کا تقاضہ اور عصر حاضرہ کی پیداوار ہیں۔ لیکن اسے دشوار تر صنفِ افسانہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر اس سے افسانہ کی ارضیت مجروح ہوئی ہے۔ تو اس لئے کہ ''ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی''۔ مشق و مداولت کی آنچ میں تپے ہوئے، تجربہ کار تخلیقی افسانہ نگار جو داخلی کیفیات، وجدانی کشاکش سے بچ نکلتے ہیں تجریدی و تمثیلی افسانوں سے کماحقہٗ انصاف کرنے میں کامیاب نظر

آتے ہیں۔ ورنہ نتیجہ مجذوب کی بڑ اور گونگے کا گیت؟ میرے خیال میں ارضیت کو مجروح کئے بغیر تجریدی افسانہ کو آفاقیت حاصل ہوسکتی ہے۔ارضیت کے بغیر نہیں؟

مسیح الحسن رضوی: میرا کوئی خیال نہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ ایک مہمل افسانہ تجریدی قرار دے دیا جائے۔ تمثیلی افسانہ ضرور ایک بہتر فن (اور اس کے ذریعہ ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنی باتیں قاری تک پہنچائی ہیں)۔ میں ارضیت کو ضروری سمجھتا ہوں اس کے برتنے سے آفاقیت بھی پیدا کی جاسکتی مثال کے طور پر حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''ہانمٹ''۔ جو جبر و اختیار کے مسئلہ پر ہے۔

اکرام جاوید: تجریدی یا تمثیلی افسانہ کے خدوخال ابھی غیر واضح اور مبہم ہیں۔ اور یہ ابھی ''تجرباتی مراحل'' طے کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا.....! تجریدیت سے افسانہ کی ارضیت مجروح نہیں ہوسکتی۔ ارضیت کے بغیر کسی افسانہ کو آفاقیت حاصل نہیں ہوسکتی.....!

خموش سرحدی: تجریدی یا تمثیلی افسانہ ابھی تجربہ کے ناگزیر دور سے گزر رہا ہے۔ اور خود تجریدیت نواز افسانہ نگار ابھی تک اپنے جذبہ و شعور کے لئے صحیح سمتوں کا تعین نہیں کر سکے۔ اور نہ ہی یہ مختصر سا گروہ تجریدیت ''Abstraction'' کے اصطلاحی معنوں پر متفق ہو سکا ہے۔ اصول و ضوابط کی ترتیب و تہذیب تو ابھی دور کی بات ہے.....سریندر پرکاش اور بلراج منیرا جو بزعم خویش تجریدی افسانوں کے سلسلہ میں امامانِ فن کہلاتے ہیں۔ اعلانیہ ایک دوسرے کے ادبی وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ محمود ہاشمی صاحب تجریدی افسانوں کو صرف جدید رویہ (تکنیک) کا اظہار کہتے ہیں۔ جو قاری کو چونکا دے۔ جبکہ سریندر پرکاش اسے داخلی کیفیات کا نجی معاملہ سمجھتے ہیں۔ جس سے صرف فن کار کے جذبات کو تسکین ملتی ہے۔ قاری یا سماج کو اس سے کچھ ملے نہ ملے۔ اس کی ذمہ داری تجریدی افسانہ نگار پر عائد نہیں کی جاسکتی ''عقیدہ و

نظریہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد رہ کر یہ صنف افسانہ زندگی وسچائی کی صالح قدروں کی علمبردار ہے'' بلراج منیرا صاحب کا اس سلسلہ میں یہ فتویٰ ہے۔ حالانکہ خود ان کے تجریدی افسانوں میں فلسفۂ (ویدانت) کی گھسی پٹی.....تفصیلات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تاہم تجریدی افسانہ کو فہم جدید کے ذریعہ نئے اور تابناک افق مل سکتے ہیں۔ اگر اسے بقدر ضرورت ایسے دانشور اور تجربہ کار فن کاروں کی سرپرستی نصیب ہوسکی۔ جو اسے داخلی انتشاروں اور خارجی تصادمات کی کشمکش سے نکال کر تکمیل کی منزلوں کی طرف لے جانے کا شعور رکھتے ہوں، بحالاتِ موجودہ اس سے افسانہ کی ارضیت کو گھاؤ لگے ہیں۔ لیکن ایسے امکانات کی کمی نہیں۔ کہ ارضیت کو مجروح کئے بغیر اس صنفِ افسانہ کو آفاقیت حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ سریندر پرکاش اور مین راؔ کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں انتظار حسین کے فن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔''

سوال ۶:۔ دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں اردو میں افسانے کو جو امتیازی مقام اور اہمیت حاصل ہے آپ کی رائے میں اس کے کیا اسباب ہیں؟

ڈاکٹر محمد حسن: شاید ہمارے غزل پسند مزاج کو بھی اس میں دخل ہے ناول جس بڑے وژن اور جس مسلسل پرواز کو طلب کرتا ہے وہ ریزہ خیالی کے منافی ہے۔ پھر ہمارے لکھنے والوں کے تجربے کی دنیا بھی بڑی حد تک محدود ہے۔ شہری زندگی اور وہ بھی ادنیٰ متوسط طبقے کی۔ پھر اردو پر جو وقت پڑا ہے اس کی وجہ سے کسی بڑے پروجیکٹ کے ماتحت کام کرنے کا حوصلہ اردو والوں میں نہیں ہے۔ اور بھی کئی اسباب ہیں۔

جوگندر پال: دیگر اصنافِ ادب کے مقابلے میں افسانے کی اہمیت شاید اس لئے زیادہ ہے کہ اس صنف میں فری مینٹل پلے کا اسکوپ بہت زیادہ ہے۔ ہمارے اکابر ایک عرصہ تک نثری ادب سے بے اعتنائی برتتے رہے کہ اُن کے خیال میں شعری ادب کا صوتی ردھم اُس کی طویل عمری کے اسباب میں تھا، مگر نثر کے اہم لکھنے والے بخوبی

جانتے ہیں کہ ہر ''رہ جانے والا ادب پارہ'' اپنے معنوی ردھم کے سبب سے ہی رہ جاتا ہے.....اور اس معنوی ردھم کا سامان کرنا نثر و شعر ہر دو میں برابر جان جوکھوں کا کام ہے۔موجودہ افسانوی ادب علم تخلیق کے بیشتر تقاضوں سے آشنا ہے اور فائن آرٹس کی ذمہ داری قبول کرنے سے اُسے انکار نہیں، اس لئے بظاہر اُس کا مستقبل خوبصورت نہ ہونے کا کوئی ڈر نہیں۔

سہیل عظیم آبادی: دوسرے اصناف و ادب کے مقابلے میں افسانوں کو جو امتیازی جگہ ملی ہے اس کی بڑی وجہ مطالعہ کی دِل چسپی اور زندگی کی وہ نت نئی تصویر جن کو افسانے پیش کرتے ہیں۔

رتن سنگھ: افسانہ کو امتیازی حیثیت صرف اردو میں ہی نہیں دنیا کی ساری زبانوں میں حاصل ہے دراصل یہ ہے ہی افسانے کا دور۔افسانہ وہ فن ہے جس میں ہر انسان افسانے کے الفاظ میں اپنے دل کی دھڑکن کو پڑھ سکتا ہے اور اپنے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو معنی پہنا سکتا ہے یہی ہے افسانے کی مقبولیت کا راز۔

کلام حیدری: یہ سوال با قاعدہ سروے کا محتاج ہے۔

شکیلہ اختر: میرے خیال میں افسانے کو کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں۔

ظفر اوگانوی: اردو مختصر افسانے کو اس کی تسلی بخش رفتار کے باوجود امتیازی اہمیت بس اسی حد تک حاصل ہے کہ سال ڈیڑھ سال پر کسی نے اردو افسانے یا افسانہ نگاروں کا جائزہ لے لیا۔اپنے دوست افسانہ نگاروں کی ایک فہرست تیار کر دی۔یا کہیں دو چار نے مل بیٹھ کر اپنے طور پر اظہار خیال کر لیا اور اس کو افسانے پر سمپوزیم کا نام دیدیا۔اور جب افسانے پر کوئی سمپوزیم ہوا بھی تو اس میں اور شاعروں نے جو افسانے سے بہت دور بھاگتے ہیں افسانہ نگاری پر اظہار خیال فرمالیا اور ''باکار'' لوگوں کو فلسفہ نگار بنا دیا گیا۔صف اول کے عصری ناقد اب بھی افسانہ نگاری یا اس کے رجحانات پر قلم اُٹھاتے

ہوئے ڈرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ یا تو افسانے پڑھتے ہی نہیں ہیں یا افسانے کو تخلیقی روپ میں شمار کرنے سے جان بوجھ کر کتراتے ہیں۔ حالانکہ آج کا مختصر افسانہ شاعری کی طرح تحقیقی ادب کے زمرہ میں داخل ہو چکا ہے۔

اردو مختصر افسانے کی مقبولیت اور اہمیت کا ایک طرف یہ عالم ہے کہ اردو کا کوئی بھی رسالہ صرف شاعری کو پیش کر کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ کوئی بھی پبلشر مختصر افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کے لئے آسانی کے ساتھ تیار نہیں ہوگا۔تا آنکہ کوئی خاص ''وجہ'' نہ ہو۔اردو کا پبلشر افسانوں کے بجائے ضخیم ناول کی فرمائش کریگا اور کہے گا کہ افسانوں کے مجموعے بازار میں فروخت ہی نہیں ہوتے' ان کی مانگ ہی نہیں ہے.....اس کے علاوہ افسانے کا فن فی زمانہ کچھ اتنا دقیق اور پیچیدہ تر ہو گیا ہے اور ہوتا جارہا ہے کہ اس میں آسانی کے ساتھ افسانہ نگار اپنی انفرادیت کو تسلیم نہیں کرا سکتا ہے۔ کیونکہ ترقی پسندوں کی طرح آج نئے افسانہ نگاروں کے پاس پبلسٹی کے لئے کوئی تنظیم یا کوئی سیاسی پلیٹ فارم بھی نہیں ہے۔اس لئے بعض کمزور قسم کے افسانہ نگار جن کو خود پر بھروسہ نہیں ہے وہ اس میدان کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہونے پر آمادہ ہیں۔

رشید امجد: بنیادی طور پر پاک و ہند کے لوگوں کا مزاج داستانی ہے اس لئے ہمارے یہاں ہمیشہ ہی عوامی سطح پر داستان کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔شعری دائرہ ہر دور میں محدود و مخصوص رہا ہے۔

بلراج کومل: میری ذاتی رائے میں مختلف اصناف سخن کی فہرست میں اردو افسانے کا مقام فی الحال غیر یقینی ہے۔

امیر اللہ شاہین: داستانوں کے طومار سے نفور' وقت کی کمیابی' زندگی میں پیچیدگیوں کا فقدان (وہ پیچیدگیاں جو صنعتی دور کی انتہائی ترقیوں میں سامنے آتی ہیں)۔ اردو

والے صنعتی دور میں ابھی داخل نہیں ہوئے۔ شاعرانہ فکر کی افسانے میں بالاتری، اردو والوں کا شاعرانہ مزاج جس کے ڈانڈے تن آسانی اور آرام طلبی سے جا ملتے ہیں۔ دوسری طرف افسانوں میں حقیقت کا انعکاس۔ یہ متحرک تصویریں اپنے گردوپیش سے متعلق ہونے کے سبب اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہیں۔ اس پر مستزاد ان کا آسان حصول جس میں نہ اسٹیج کے لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے نہ بڑے کینواس کی، نہ ٹکٹ کی لائن میں لگنے کی۔ ۳ گھنٹے کے حبس دوام کے بجائے ۳ سے ۷ منٹ میں ایک مکمل تاثر اُبھر آتا ہے۔

کوثر چاند پوری: افسانہ زندگی کے بہت قریب، سادہ اور ایسی دلکش اور متحرک تصاویر پیش کرتا ہے جن میں ہر شخص اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے افسانہ زندگی کے ہر پہلو کو نہایت خوبصورتی اور سچائی کے ساتھ نمایاں کر دیتا ہے۔ حقیقت اور واقعت کو پیش کرنے کے جو وسیع امکانات افسانے میں موجود ہیں وہ کسی اور صنفِ سخن میں نہیں یہی وجہ ہے کہ افسانہ ہر عہد میں مقبول رہا ہے آئندہ بھی اس کی یہ خصوصیت باقی رہیگی۔

ہرچرن چاولہ: اصنافِ اردو ادب میں افسانہ نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے اتنی کہ اس صنف کی بعض تخلیقات کو بجا طور پر دوسری زبانوں کی تخلیقات کے مقابل رکھنے میں فخر اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ پرانی حد بندیاں اور قدیم روائتیں توڑنے میں افسانہ ہی پیش پیش رہا ہے۔ بات کہنے کے موثر، سلیس اور سادے ڈھنگ کی وجہ سے اور ذہنی سطح سے دوسری تخلیقات کے مقابلہ میں جلد متاثر ہونے اور کرنے کی وجہ سے نئی افسانہ نویسی کی کم عمری بھی پرانی روایات اور اس کی گہرائیوں میں اُترنے میں مددگار ثابت ہوئی کیونکہ ابھی اس کے نقوش زیر تکمیل تھے۔ ابھی کچی مٹی کو کھلونا ہونے کی وجہ سے افسانہ نے ہر تبدیلی اور محرکات کا کھلی بانہوں سے خیر مقدم کیا۔ اسی لئے یہ صنف دوسری اصناف کے مقابلہ جلد مقبول ہو کر امتیازی اہمیت کی حامل ہوگئی۔

عطیہ نشاط: افسانے کی مقبولیت کا راز میرے نزدیک اس کے اختصار میں ہے۔ اختصار کی وجہ سے رسائل میں اس کا جگہ پانا اور لوگوں تک پہنچنے کی آسانی۔ پھر ہم لوگ جس انتشاری دور سے گزر رہے ہیں اس میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں سامنے آکر دل کو متاثر کرتی ہیں اور طویل ناولوں کو ہضم کرنے، ان سے اثر لینے کے لئے نسبتاً ایک مطمئن اور منظّم زندگی کی ضرورت ہے کہ اس کے پھیلے ہوئے کینواس کو دائرہ اثر میں لے اور اسے اپنے اندر جذب کرے۔ جاسوسی دنیا آج کا قاری ضرور پڑھتا ہے لیکن وہاں تو صرف وقت کاٹنا مقصود ہوتا ہے اس سے اثر لے کر زندگی کی کسی سچائی تک پہنچنے کی کوشش نہیں ہوتی۔ مختصر افسانے کے چھوٹے چھوٹے وار ہم اپنے انتشار میں سہہ لیتے ہیں لیکن چونکہ اپنی زندگی وسیع اور منظّم خاکے سے خالی ہے اس لئے ناول کی وسعت ہماری موجودہ حالات سے مطابقت نہیں رکھتی اور اسے وہ قبولیت نہیں ملتی۔

مظفر حنفی: جہاں تک اردو سے براہِ راست تعلق رکھنے والے طبقے کا تعلق ہے، میں آپ کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں رکھتا کہ اس میں اردو افسانہ امتیازی اہمیت اور مقبولیت کا حامل ہے۔ البتہ تراجم کے توسط سے اردو ادب کا جائزہ لینے والوں میں اردو کی دیگر اصناف کے مقابلے میں افسانہ زیادہ پسند کیا جاتا ہے ظاہر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ شعری اصناف کی بہ نسبت اردو افسانہ اپنی اصل خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے بہ آسانی دوسری زبان میں منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہربنس لال ساہنی: مختصر یا طویل افسانہ کے کیا معنی؟ دوسری اصناف سخن سے قطع نظر افسانوی ادب نے دنیا بھر میں اس لئے اہمیت حاصل کی ہے کہ اس نے زندگی کے ابدی اور جمالیاتی حقائق کا مشاہدہ نہایت قریب سے کیا ہے۔ اگر چہ ہمارے یہاں صنف ادب افراط وتفریط کا کسی حد تک شکار ضرور ہوئی ہے۔ پھر بھی اس میں مختلف و متنوع تجربے کئے گئے ہیں۔ ذات کے واسطہ سے حیات و کائنات کے تہہ در تہہ

مسائل کو متاثر کیا گیا ہے۔انسانی نفسیات کی تسکین کے سامان پیدا کئے گئے ہیں۔غالباً اُردو میں بھی افسانہ اب عروج کے اس دور میں داخل ہو چکا ہے۔جہاں اس کی اہمیت کونظر انداز کرنا آسان کام نہیں۔افسانے کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ یہ فطرت انسانی سے ہم آہنگ وہمنوا رہا ہے۔شاید صنعتی دور کی موجودہ ہماہمی میں مختصر افسانہ کوکوئی امتیازی اہمیت حاصل ہو۔تاہم افسانہ کی افادیت اور مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مسیح الحسن رضوی: افسانہ جلد پڑھا جاسکتا ہے۔غزل کے ایک شعر کی طرح وہ بھرپور ہوتا ہے اور زندگی کے کسی گہرے رمز کی طرف نشان دہی کرتا ہے تھوڑے الفاظ میں وہ بہت ہی بڑی باتیں کہہ جاتا ہے۔

اکرام جاوید: قصہ کہانیوں سے انسان کی دلچسپی ازلی ہے۔زندگی کے حقائق کو انسانی ذہن قصہ کہانیوں کے موثر ''واسطے'' سے بہتر انداز میں قبول کرتا رہا ہے۔مقدس کتابوں میں قصوں' کہانیوں اور تمثیلات کا پایا جانا اس خیال کو اور مستحکم کرتا ہے میرے خیال میں دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں اردو افسانہ کی اہمیت اور مقبولیت کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

خموش سرحدی: مختصر افسانہ کا ''ماحول'' اُس لایعنی پھیلاؤ کی بدعتوں سے پاک ہوتا ہے جو غیر مختصر افسانوں میں پایا جاتا ہے اور اسکی اہمیت اور امتیازی خصوصیت یہی ہے' جبکہ غیر مختصر افسانوں میں افسانہ نگار اور قاری کے درمیان بعض اوقات پیچ در پیچ فاصلے اور بے حس اُلجھنیں، کشش اور تاثر کے اُس تسلسل کو روک دیتی ہیں۔جو ہر لمحہ قائم رہنا چاہئے۔اس کے برعکس مختصر افسانہ میں تاثر وکشش کے اس براہ راست تسلسل میں کوئی مصنوعی روکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی۔اور قاری کا شعور' افسانہ کی فنی لطافتوں اور معنوی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ آخری مرحلوں تک سبک خرام رہتا ہے۔

غالباً مختصر افسانہ کی یہی فطری اور بنیادی خوبی ہے۔ جو اسے عام صنفِ افسانہ سے زیادہ اہمیت عطا کرتی ہے۔اور قبولیت بھی!

سوال ۷: اردو کے وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جن کی منتخب کہانیاں دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہیں۔ ایسی دس کہانیوں کی نشان دہی کیجئے۔

ڈاکٹر محمد حسن:

۱	منٹو	(موذیل)
۲	بیدی	(اپنے دکھ مجھے دے دو)
۳	حیات اللہ انصاری	(آخری کوشش)
۴	کرشن چندر	(دو فرلانگ لمبی سڑک)
۵	قرۃ العین حیدر	(ہاؤسنگ سوسائٹی)
۶	عصمت چغتائی	(ننھی کی نانی)
۷	رام لال	(او۔سی)
۸	رتن سنگھ	(جس تن لاگے)
۹	قاضی عبدالستار	(دو دو چراغ محفل)
۱۰	بلراج منیرا	(ماچس)

نوٹ: اس انتخاب میں پاکستان کے اردو افسانے شامل نہیں ہیں۔احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، انتظار حسین اور غازی صلاح الدین اور ممتاز مفتی کے ہاں کم سے کم ایک افسانہ اس معیار کا ضرور ہے۔اس انتخاب میں مختصر افسانہ، طویل مختصر افسانہ اور ناولٹ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

جوگندر پال: آپ نے اپنا یہ اچھا خاصہ سوال اتنی سادگی سے پوچھ لیا ہے کہ میں

Stuck-up ہوکر رہ گیا ہوں۔

سہیل عظیم آبادی: اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں بہت سے ایسے افسانے لکھے گئے ہیں۔ جن کو دنیا کے افسانوی ادب کے سامنے بڑے اعتماد کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہزاروں افسانوں میں سے دس کا انتخاب بڑا مشکل کام ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں یہ افسانے دنیا کی کسی زبان کے افسانوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔

۱	سعادت حسن منٹو	(بو، ہتک)
۲	کرشن چندر	(دوفرلانگ لمبی سڑک)
۳	راجندر سنگھ بیدی	(ٹرمنس سے پرے)
۴	حیات اللہ انصاری	(آخری کوشش)
۵	رامانند ساگر	(جب پہلے دن برف گری تھی)
۶	عصمت چغتائی	(دو ہاتھ)
۷	بلونت سنگھ	(کالی تیتری)
۸	ہاجرہ مسرور	(کنیز)
۹	اختر اورینوی	(کلیاں اور کانٹے)
۱۰	سہیل عظیم آبادی	(بھوک)

رتن سنگھ: منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی کے ہاں اتنی کہانیاں مل جائیں گی کہ ان میں سے ہر ادیب کا ایک ایک مجموعہ ایسا نکل آئیگا جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے بہترین افسانوی ادب کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں خواجہ احمد عباس، حیات اللہ قاسمی اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں سے قطع نظر نئے افسانوں کی تلاش کر رہا ہوں جنھیں دنیا کے عمدہ افسانوں میں شمار کیا جانا چاہئے اس اعتبار سے جو افسانے

مجھے اس وقت یاد آ رہے ہیں وہ ہیں جیلانی بانو کا ادھوری بات، رام لعل کا نئی دھرتی پر اُگے گیت، دُھویں کی دیوار، جوگندر پال کا بازیافت، اقبال مجید کا عدو چچا اور دو بھیگے ہوئے لوگ، مسیح الحسن کا مٹی، رضیہ سجاد ظہیر کا ''خاص موقعے کے لئے'' عابد سہیل کا 'میں اور میں' ستیہ پال آنند کا 'پاگل خانہ' اور قیصر تمکین کا.....'اعتراف'۔

کلام حیدری: کرشن چندر، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، شوکت صدیقی۔

کرشن چندر: (۱) زندگی کے موڑ پر (۲) آدھے گھنٹے کا خدا

سعادت حسن منٹو: (۱) یا پو گوپی ناتھ (۲) ٹوبہ ٹیک سنگھ

قرۃ العین حیدر: (۱) پت جھڑ کی آواز (۲) چھٹے اسیر تو بدلا.....

جوگندر پال : (۱) بوڑھا جزیرہ (۲) کچھوا

غیاث احمد گدی : پیاسی چڑیا

شوکت صدیقی : تیسرا آدمی

شکیلہ اختر: میرا مطالعہ ادب عالم کا بالکل نہیں۔ میں نے چند ترجمے پڑھے ہیں۔

ظفر اوگانوی: اگر آپ ۵۰ء کے بعد کے متعلق پوچھ رہے ہیں تو جن متذکرہ (جواب ۴) افسانہ نگاروں نے ۵۰ء کے بعد اردو افسانے کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے انھیں کی درج ذیل کہانیاں اس حد تک بلند ہیں جو دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہیں:

(۱) زرد کتا (انتظار حسین) (۲) ندی (عبداللہ حسین) (۳) دوب، ہوا اور لنجا (انور سجاد) (۴) ہزار پایہ (خالدہ اصغر) (۵) درد کا ساحل کوئی نہیں (انور عظیم) (۶) وہ ایک لمحہ (عابد سہیل) (۷) گریو یارڈ (اقبال متین) (۸) ماچس (بلراج مین را) (۹) دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم (سریندر پرکاش) (۱۰) پیچ کا ورق

(ظفر اوگانوی)

بلراج کومل: اردو کے ممتاز افسانہ نگاورں کی کہانیاں فی الحال دیگر ہندوستاں کی کہانیوں کی سطح پر نہیں پہنچ سکیں۔ بین الاقوامی موازنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو بھی فہرست تیار ہوگی غیر حقیقی ہوگی۔

امیر اللہ شاہین: پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس ،علی عباس حسینی، جیلانی بانو، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، رام لعل، بلونت سنگھ۔ (سوال کے آخری جز سے امتحان کے پرچے کی بو آتی ہے)۔

کوثر چاندپوری: جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی ہیں اردو میں، ان کی تعداد مایوس کن نہیں۔ ہر زمانہ میں ایسے افسانہ نگار سامنے آتے رہے ہیں جن کی کہانیاں دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا مقابلہ کرتی ہیں.....ایسی کہانیوں میں کفن، نیا قانون، گرم کوٹ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے ہتک، آخری کوشش دوفرلانگ لمبی سڑک، میرا پیشہ، موذیل اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کو بھی بے تکلف ایسی کہانیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ہرچرن چاولہ: میری نظریں پریم چند (کفن)، کرشن چندر (زندگی کے موڑ پر، اَن داتا، دوفرلانگ لمبی سڑک) بیدی (اپنے دکھ مجھے دو، لاجونتی، گرم کوٹ) منٹو (کالی شلوار، بُو، بابو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ) اور رام لعل (او۔سی اور ایک شہری پاکستان) ایسی کہانیاں ہیں جو دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی ہیں۔

عطیہ نشاط: اردو کے حسب ذیل افسانہ نگاروں کی تخلیقات دنیا کے ادب میں جگہ پاسکتی ہیں ان کی ترتیب ان کی اہمیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ جیسے جیسے یاد آئے لکھ رہی ہوں۔ عصمت چغتائی (جڑیں، چوتھی کا جوڑا)، حسن عسکری (حرام جادی)، قرۃ العین

(پت جھڑ کی آواز)، احمد ندیم قاسمی (سناٹا، ماتم) پریم چند (کفن)، سعادت حسن منٹو (ہتک)، کرشن چندر (مہالکشمی کا پل)، خواجہ احمد عباس (کہتے ہیں جس کو عشق)، راجندر سنگھ بیدی (گرم کوٹ، متھن)، عزیز احمد (جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں)۔

مظفر حنفی: اگر ہم بے جا احساسِ کم تری کا شکار نہ ہوں تو پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی، ندیم، عصمت، قرۃ العین، شوکت صدیقی، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، قاضی عبدالستار، رام لعل وغیرہ کی بعض کہانیاں دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے سامنے فخر کے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ ایسی دس کہانیوں کے انتخاب کا عمل آموختہ دُہرانے کے مترادف ہوگا جس کے لئے خاصہ وقت درکار ہے اور آپ فوری جواب چاہتے ہیں لہٰذا معذرت۔

ہربنس لال ساہنی: اس سوال کے جواب میں منشی پریم چند، بیدی، منٹو، کرشن چنر، قرۃ العین حیدر وغیرہ کا نام لینے میں مجھے پریشانی نہیں۔ کیونکہ ان کی بعض تخلیقات بلاشبہ بین الاقوامی افسانوی ادب کے مقابلے میں پیش جاسکتی ہیں۔ ان کے یہاں دس سے زیادہ معیاری افسانے مل سکتے ہیں۔ البتہ میرے لئے پریشانی ہوتی اگر آپ تجریدیت نواز فن کاروں کے ایسے پانچ افسانے بھی مجھ سے چاہتے۔ جو عصریت کے معیار پر پورے اُتر سکتے۔ محولا بالا افسانہ نگاروں کے معروف افسانے ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں گنوائے جائیں۔ اور پھر ''مزاج اپنا اپنا، پسند اپنی اپنی۔''

مسیح الحسن رضوی: اس میں بہت سے نام لئے جاسکتے ہیں۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری اور سب کے باوا آدم منشی پریم چند۔ منٹو کی متعدد کہانیاں غیر ملکی کہانیوں سے آنکھیں ملاتی ہیں۔ اس کی گمبھیرتا اور افسانوی زبان کو کوئی نہیں پہنچتا۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت، ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل، ہتک، آخری کوشش، آنندی، بالکونی، لاجونتی، کفن، سیکنڈ راؤنڈ وغیرہ۔

اکرام جاوید: سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور رام لعل کی منتخب تخلیقات کو دنیا کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ مجھے اس وقت ایسی کہانیوں کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔ معذرت خواہ ہوں کہ ایسی دس کہانیوں کے نام نہیں لے سکوں گا۔!

خموش سرحدی: اس سوال کا وہ 'حصہ' جس میں آپ مخاطب سے دس منتخب کہانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قطعی بے جا معلوم ہوتا ہے۔۔ کیونکہ عالمی معیار کے تخلیق نگار مثلاً منشی پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر کے یہاں افسانوی ادب کے نمائندہ شاہکار اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی معروف تخلیقات، شائقین افسانہ سے پوشیدہ نہیں۔ بلاشبہہ محولا بالا مشاہیر ادب کی کچھ تخلیقات بین الاقوامی معیار کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر کے شاہکار تسلیم کی گئی ہیں اور جن کے تراجم مختلف زبانوں میں قبول عام کی سند بھی حاصل کر چکے ہیں۔ جہاں ''علاج تنگی داماں'' کے وافر سامان مل سکتے ہوں، وہاں ''چند کلیوں'' کی طلب وقناعت کے کیا معنی؟

●●●

بشکریہ ''ماہنامہ کتاب''، لکھنو
افسانہ نمبر ۱۹۷۰

☆.....سلام بن رزاق

انجام کار

آج شام کو آفس سے گھر لوٹتے وقت تک بھی میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ حالات مجھے اس طرح پیس کر رکھ دیں گے۔ میں چاہتا تو اس سانحے کو ٹال بھی سکتا تھا مگر آدمی کے لیے ایسا کرنا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ کچھ باتیں ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے کی حدود سے پرے ہوتی ہیں اور شاید ایسے غیر متوقع سانحات ہی کو دوسرے الفاظ میں ''حادثہ'' کہتے ہیں۔ جو بھی ہو۔ میں حالات کے غیر مرئی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور اب اس سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

آج گھر لوٹنے میں مجھے دیر ہوگئی تھی اس لیے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے بیوی کی پریشانی کا بھی خیال تھا۔ وہ یقیناً کھڑکی کی جھری سے آنکھ لگائے میری راہ دیکھ رہی ہوگی اور ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی ہوگی۔ سانجھ کی پرچھائیاں گھر آئی تھیں۔ میں جیسے ہی گلی میں داخل ہوا، اس جانے پہچانے ماحول نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ٹین کی کھولیوں کے چھجوں سے نکلتا ہوا دھواں ادھر ادھر بہتی نالیوں کی بدبو اور ادھ ننگے بھاگتے دوڑتے بچوں کا شور، کتوں کے پلے، مرغیاں اور بطخیں، دو ایک کھولیوں سے عورتوں کی گالیاں بھی سنائی دیں جو شاید اپنے بچوں یا پھر بچوں کے بہانے پڑوسیوں کو دی جا رہی تھیں۔

میں جب اپنی کھولی کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ میرے دروازے کے

سامنے گندے پانی کی نکاسی کے لیے جو نالی بنی تھی، اس میں شامو دادا کا ایک چھوکرا دیسی شراب کی کھن بوتلیں چھپا رہا ہے۔ مجھے اپنے سر پر دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ بوکھلایا۔ پھر سنبھل کر قدرے مسکرا دیا۔ دیسی شراب کی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ اطمینان سے مسکراتا ہوا بولا، ''دادا نے یہ چھے بوتلیں یہاں چھپانے کو بولا ہے۔''

گلی کی گندگی جب تک گلی میں تھی تو کوئی بات نہیں تھی۔ مگر اب وہ گندگی میرے دروازے تک پھیل آئی تھی اور یہ بات کسی بھی شریف آدمی کے لیے ایک چیلنج تھی۔ لہٰذا میں چپ نہ رہ سکا۔ میں نے اسی تیز لہجے میں کہا، ''یہ بوتلیں یہاں سے ہٹاؤ۔ یہ گٹر تمہاری بوتلیں چھپانے کے لیے نہیں بنی ہے۔''

لڑکا تھوڑی دیر تک مجھے گورتا رہا۔ پھر بولا، ''اپن کو نہیں معلوم، دادا نے یہاں چھپانے کو بولا تھا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ چلو اٹھاؤ یہاں سے۔''

لڑکے نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے بوتلیں واپس اپنے میلے جھولے میں رکھ لیں۔ پھر جاتے جاتے مڑ کر بولا، ''ساب! جاستی (زیادہ) ہو ساری دکھائیگا تو بھاری پڑیگا۔ یہ نہرونگر ہے۔''

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اس آوارہ چھوکرے کے منہ لگنا بیکار تھا۔ وہ بوتلیں لے کر چلا گیا۔ یہی غنیمت تھا۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا، میری اور لڑکے کی گفتگو سن کر ارد گرد کی کھولیوں کے دروازے کھلے اور کچھ عورتیں باہر جھانکتی ہوئی، دلچسپی اور تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بیوی بھی شاید میری آواز سن چکی تھی۔ وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے قدرے گھبراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ بیوی نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے۔

''کم بختوں کو دوسروں کی تکلیف یا عزت کا ذرا خیال نہیں۔'' میں جوتے کی لیس کھولتے ہوئے بڑبڑایا۔

''کیا ہوا؟'' بیوی کا لہجہ گھبرایا ہوا ہی تھا۔

''ارے وہ شامو دادا کا چھوکرا اپنے گھر کے سامنے والی نالی میں شراب کی بوتلیں چھپا رہا تھا۔''

بیوی تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی، ''میں کہتی ہوں خدا کے لیے کوئی دوسری جگہ ڈھونڈ لیجیے۔ آج نل پر چھے نمبر والی آنٹی بھی خواہ مخواہ مجھ سے الجھ پڑی تھی۔''

میں نے بش شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے پوچھا، ''کیا ہوا تھا؟''

''ہوتا کیا، یہ لوگ تو جھگڑے کے لیے بہانہ تلاشتے رہتے ہیں۔ سب کو نمبر سے تین تین ہنڈے پانی ملتا ہے۔ میں نے صرف دو ہنڈے لیے تھے۔ وہ کہنے لگی، تمہارے گھر میں زیادہ ممبر نہیں ہیں، تم صرف دو ہنڈے لو۔ میں نے کہا سب کو تین ملتے ہیں تو میں بھی تین ہی لوں گی۔ دو کیوں لوں؟ بس اسی پر بات بڑھ گئی۔''

میں کھاٹ پر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا کیا جائے۔ ابھی تین چار ماہ تک کھولی بدلنے جیسی میری حالت نہیں تھی اور یہاں ایک ایک دن گزارنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف تین مہینے ہوئے تھے۔ بیوی یہاں کے ماحول سے اس قدر پریشان ہو چکی تھی کہ روز رات کو سونے سے پہلے وہ ادھر ادھر کی باتوں کے درمیان گھر بدلنے کی بات ضرور کرتی۔ میں کبھی سمجھا کر، کبھی

ڈانٹ کر اسے ٹال دیتا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ میری مالی حالت سے واقف نہیں تھی۔ مگر وہ بھی ایک عام گھریلو عورت کی طرح ایک اچھے گھر کی خواہش کو اپنے دل سے کسی طرح بھی الگ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی یہ خواہش اس وقت مزید شدت اختیار کر جاتی جب گلی میں کوئی لڑائی جھگڑا یا دنگا فساد ہو جاتا۔ اس قسم کے دنگے یہاں تقریباً روز ہی ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو معمولی جھگڑے سے بھی خون خرابے تک نوبت آ جاتی۔ اتوار کے روز یہاں کے ہنگاموں میں خصوصیت سے اضافہ ہو جاتا۔ ہفتے کے چھے دن تو زیادہ تر عورتیں آپس میں لڑتی رہتیں۔ کبھی کبھی نل یا سنڈاس کی لائن میں دو چار عورتیں ایک دوسرے سے الجھ پڑتیں۔ جھونٹے پکڑ کر بھی کھینچے جاتے۔ مگر یہ جھگڑے گالی گلوچ یا معمولی نوچ کھسوٹ سے آگے نہ بڑھ پاتے۔ مگر اتوار کا دن ہفتے بھر کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کا فیصلہ کن دن ہوتا کیوں کہ اس دن ان عورتوں کے شوہروں، بیٹوں اور دوسرے عزیز رشتے داروں کی چھٹی کا دن ہوتا جو موٹر ورک شاپوں، ملوں اور دیگر چھوٹے موٹے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اس دن شنکر پاٹل کا مٹکے کا کاروبار بھی کلوز رہتا۔ البتہ شامو دادا کے اڈے پر خاص رونق ہوتی صبح ہی سے پینے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اور لوگ ''نوٹانک'' پاوسیر، پی پی کر گلی میں اس سرے سے اس سرے تک لڑکھڑاتے گالیاں دیتے اور ہنستے قہقہے لگاتے گھومتے رہتے۔ ہفتے بھر عورتیں انھیں اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی جو رپورٹیں دیتی تھیں وہ انھیں رپورٹوں کی بنیاد پر کسی نہ کسی بہانے لڑائی چھیڑ دیتے۔ ہفتے بھر کا حساب چکانے کے لیے مرد اپنے اپنے ٹین اور لکڑیوں کے ناپہتک جھونپڑوں سے نکل آتے۔ دن بھر خوب جم کر لڑائی ہوتی۔ دو چار کا سر پھٹتا اور دو چار کو پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ یہ ہر اتوار کا معمول تھا۔

یہاں کے ماحول سے میں بھی کافی پریشان تھا۔ مگر صرف پریشانی سے کب

کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ شہروں میں ایک صاف ستھرے ماحول میں، مناسب مکان کا حاصل کرنا مجھ جیسے معمولی کلرک کے لیے کتنا مشکل ہے، اس کا صحیح اندازہ بیوی کو نہیں ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ وہ گاوں سے پہلی دفعہ شہر آئی تھی۔

اتنے میں بیوی چائے کا پیالہ لے کر ساڑی کے پلو سے منہ پونچھتی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی، ''لیجیے چائے پی لیجیے۔''

میں نے چائے کا پیالہ اٹھالیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''پرسوں تین نمبر والی زلیخا آئی تھی اس نے مجھ سے ادھار آٹا مانگا۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ گیہوں ابھی پسائے نہیں گئے ہیں۔ اس وقت وہ چپ چاپ چلی گئی۔ مگر تب سے سنڈاس کی لائن میں، نل پر مجھے دیکھتے ہی ناک چڑھا کر آنکھیں مچکاتی ہے اور میری طرف منہ کر کے تھوکتی ہے۔ کتیا کہیں کی۔''

بیوی نے منہ بناتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ میری نظریں بیوی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھی۔ میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، ''تھوڑا سا آٹا دے دینا تھا۔''

''کیا دے دیتی؟'' اس کی آواز مزید تیکھی ہوگئی۔ ''آپ نہیں جانتے، ان لوگوں کی نہ دوستی اچھی، نہ دشمنی۔ اسی لین دین پر تو آئے دن یہاں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔'' بیوی نے جیسے کسی بہت بڑے راز کا انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ میں چپ تھا، وہ کہہ رہی تھی۔

''آج آپ نے دیر کر دی۔ خدا کے لیے آپ آفس سے جلد آیا کیجیے۔ آپ کے آفس سے لوٹنے تک میری جان سوکھتی رہتی ہے۔ یہاں پل، پل ایک جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے لوٹنے سے پہلے سامنے والی سکینہ اور رابوں میں خوب گالی گلوج

ہوئی۔''

''کیوں؟''

''کچھ نہیں، سکینہ کے بچے نے رابو کی بطخ کو کنکر مارا تھا۔ بس اسی پر دونوں میں خوب جم کر لڑائی ہوئی وہ تو سکھو تائی نے دونوں کو سمجھا بجھا کر چپ کرایا۔ ورنہ نوچ کھسوٹ تک کی نوبت آ گئی تھی۔''

میں سننے کو تو بیوی کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر میرا ذہن شامو دادا کے چھوکرے کے ساتھ ہوئی گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ کمبخت ایک تو غلط کام کرتے ہیں اور ٹوکو تو دھمکیاں دیتے ہیں۔ دادا گری دھری کی دھری رہ جائیگی۔ اچانک بیوی بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ آوازیں میرے دروازے پر آ کر رک گئیں۔ میں نے شامو دادا کی آواز سنی، وہ کہہ رہا تھا۔

''چل بے لالو! رکھ اس میں بوتلیں۔ دیکھتا ہوں کون سالا روکتا ہے۔''

ایک لمحے کو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا جس سے میں اب تک بچتا آیا تھا۔ میں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، ''جانے دیجیے، رکھ لینے دیجیے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔''

پیالے میں تھوڑی سی چائے بچی تھی۔ میں نے پیالہ اسی طرح فرش پر رکھ دیا۔ پھر اس سے اپنا ہاتھ دھیرے سے چھڑاتا ہوا بولا۔

''تم چپ بیٹھی رہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اس طرح ان کی ہر بات برداشت کر لیں گے تو یہ لوگ ہمارے سر پر سوار ہو جائیں گے۔'' میں کھاٹ پر سے اٹھ گیا۔

بیوی گھگھیائی۔ ''نہیں خدا کے لیے آپ باہر مت جایئے۔ آپ اکیلے کیا کر سکیں گے۔ وہ بدمعاش لوگ ہیں۔''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، ''پاگل ہوئی ہو۔ میں کیا جھگڑا کرنے جا رہا ہوں۔ آخر بات کرنے میں کیا حرج ہے۔''

میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ شامو دادا کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کھڑا تھا۔ اس کے پاس اور دو چھوکرے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ وہی چھوکرا جو پہلے بھی آیا تھا، جھولے سے بوتلیں نکال نکال کر گٹر میں دبا رہا تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ چاروں میری طرف دیکھنے لگے۔ شامو ایک لمحے تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر چھوکرے سے مخاطب ہوا۔ ''اے سالے! سنبھال کر رکھ، کوئی بوتل پھوٹ ووٹ گئی تو تیری بہن کی۔۔۔ ایسی تیسی کر ڈالوں گا۔''

میں اپنے چبوترے کے کنارے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لوگ میری طرف مڑے۔ ان کی آنکھوں میں غصہ، نفرت اور حقارت کے بھاؤ اتر آئے۔ میں نے قریب پہنچ کر نہایت نرم لہجے میں شامو سے کہا۔

''آپ ہی شامو دادا ہیں؟''

''ہاں کیوں؟'' شامو کسی کٹکھنے کتے کی طرح غرایا۔

''دیکھیے یہاں ان بوتلوں کو مت رکھیے ہمیں تکلیف ہوگی۔''

''تکلیف ہوگی تو کوئی دوسری جگہ ڈھنڈو۔ اس جھونپڑ پٹی میں کیوں چلے آئے۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ یہ چیزیں ہمیں پسند نہیں ہیں۔ کسی دوسری جگہ کیوں نہیں رکھتے انھیں۔''

''یہ بوتلیں یہیں رہیں گی، تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔''

اس کے باقی دونوں ساتھی میری طرف بڑھتے ہوئے بولے، ''یہ تمہارے باپ کی گٹر ہے کیا؟''

اس وقت اندر ہی اندر ابلتے غصے کی وجہ سے میری جو حالت ہو رہی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ جی میں آ رہا تھا کہ ان تینوں کم بختوں کی ایک سرے سے لاشیں گرادوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ ایسی جگہوں پر اپنا ذہنی توازن کھونے کا مطلب سوائے پٹنے کے اور کچھ بھی نہیں۔ میں نے لہجے کو ذرا بھاری بناتے ہوئے کہا۔

''دیکھو باپ دادا کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ میں اب تک شرافت سے آپ لوگوں کو سمجھا رہا ہوں۔''

''ارے تو، تو کیا کر لیگا ہمارا۔ تیری ماں کی۔۔۔ مادر۔۔۔ سالا۔۔۔ ایک جھاپڑ میں مٹی چاٹنے لگیگا اور ہم سے ہوشیاری کرتا ہے۔'' شامو نے دو قدم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

گالی سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''دیکھو شامو! اپنی حد سے آگے مت بڑھو۔ ایک تو غیر قانونی کام کرتے ہو اور اوپر سے سینہ زوری کرتے ہو۔''

''ارے تیرے قانون کی بھی ماں کی۔۔۔'' شامو میری طرف لپکتا ہوا بولا۔ اس کے ایک ساتھی نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا، ''ٹھہرو دادا، اس سالے کو میں ٹھیک کرتا ہوں۔''

اس نے جیب سے ایک لمبا سا چاقو نکال لیا۔ کڑ، ڑ، کڑ، ڑکڑ، ڑ، چاقو کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے جسم میں سر سے پیر تک چیونٹیاں رینگ گئیں۔ میری انتہائی کوشش کے باوجود حالات میرے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کو میں سر سے پیر تک کانپ گیا۔ اردگرد کے جھونپڑوں سے عورتیں، مرد اور بوڑھے سب نکل آئے تھے۔ سب کے سب اس جھگڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ شامو کے ساتھی کے چاقو نکالتے ہی دو تین عورتوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور ان چیخوں نے

میری نس نس میں ایک کپکپاہٹ سی بھر دی۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ اس قسم کی سچویشن سے دو چار ہوا تھا۔ میرا سارا غصہ ایک خوف زدہ بچے کی طرح سہم کر میرے اندر ہی دب گیا۔ میں اب صرف ایک گھبراہٹ بھرے پچھتاوے کے ساتھ اس غنڈے کے چمچماتے چاقو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اس وقت بھاگ کر اپنے کمرے میں چھپ سکتا تھا۔ مگر اب بھاگنا بھی اتنا آسان نہیں رہ گیا تھا۔ کیوں کہ بیسیوں آنکھیں مجھے اپنی نظر کے ترازو میں تول رہی تھیں۔ بھاگنے کا مطلب تھا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان نگاہوں میں مر جاتا۔

وہ غنڈا چاقو لیے میری طرف بڑھا اور میں بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس وقت میں بہت بہادری سے کھڑا تھا۔ بلکہ اس وقت اپنے پیروں کو اس جگہ جمائے رکھنے میں مجھے جس کش مکش اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ میں اپنے کمرے کے چبوترے پر کھڑا تھا۔ وہ غنڈا بالکل میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ قریب پہنچ کر وہ بھی ایک لمحے کو ٹھٹکا شاید اسے بھی توقع تھی کہ میں بھاگ کر کمرے میں گھس جاؤں گا۔ مگر جب خلاف توقع اس نے مجھے اسی طرح کھڑا پایا تو بجائے مجھ پر چاقو کا وار کرنے کے میری ٹانگ پکڑ کر مجھے نیچے کھینچ لینا چاہا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میری ٹانگ اس کے ہاتھ نہ آسکی۔ اتنے میں پیچھے سے ایک چیخ سنائی دی اور کوئی آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، میری بیوی میری کمر پکڑے مجھے اندر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''چلیے آپ اندر چلیے۔ خدا کے لیے آپ اندر چلیے۔'' اس نے مجھے کمرے کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ بیوی میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مجھے اندر گھسیٹ لے جاتی۔ مگر میرا شعور بھی شاید اسی میں اپنی عافیت سمجھ رہا تھا۔ بیوی نے مجھے کمرے میں دھکیل کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک

لمحے تک باہر سناٹا چھایا رہا۔صرف میری بیوی کی زور زور سے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر باہر سے مغلظات کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ وہ سب مجھے بے تحاشا گالیاں دے رہے تھے۔ پھر ایسا بھی سنائی دیا جیسے کچھ لوگ انھیں سمجھا رہے ہوں۔مگر دو تین منٹ تک گالیوں کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔ بیوی دونوں پیر پکڑے میرے گھٹنوں پر سر ٹکائے بری طرح رو رہی تھی۔ میں کھاٹ پر کسی بت کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر مغلظات کا طوفان رکا اور پھر ایسا لگنے لگا جیسے بھیڑ چھٹ رہی ہو۔تھوڑی دیر بعد باہر مکمل سناٹا چھا گیا۔صرف رہ رہ کر کسی کھولی سے کسی عورت کی کوئی تیکھی گالی اڑتی ہوئی آتی اور ایک طمانچے کی طرح کان پر لگتی۔ میں پتہ نہیں کتنی دیر تک اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بیوی پتہ نہیں کب تک گود میں سر ڈالے روتی رہی۔اس وقت ندامت غصہ اور خوف سے میری عجیب کیفیت تھی۔ ذہن گویا ہوا میں اڑا جا رہا تھا اور دل تھا کہ سینے میں سنبھلتا ہی نہیں تھا۔ میری ساری کوششوں کے باوجود معاملہ کسی کانچ کے برتن کی طرح میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور اب اس کی کرچیں میرے جسم میں اس طرح گڑ گئی تھیں کہ میرا سارا وجود لہولہان ہو گیا تھا۔ میری ساری تدبیریں ناکام ہو گئی تھیں اور اب میں بہت بلندی سے گرنے والے کسی بدنصیب شخص کی طرح ہوا میں معلق ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ کسی کگار کو چھو سکنے یا کسی ٹھوس جگہ پر پاؤں جمانے کی بے نتیجہ کوشش۔۔۔آخر میں نے طے کر لیا کہ میں جلد ہی یہ کھولی چھوڑ دوں گا۔مگر کھولی چھوڑنے سے پہلے اپنی توہین کا بدلا بھی لینا تھا۔مگر میں اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ میں بہت دیر تک اسی پیچ وتاب میں بیٹھا رہا۔آج میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا تھا۔ رہ رہ کر غنڈوں کی گالیاں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور میری بے بسی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور اس بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی میرا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بیوی کی سسکیاں اب تھم چکی تھیں مگر اس کا سر میری گود میں اسی طرح رکھا تھا۔ میں نے

آہستہ سے اس کا سر اٹھاتے ہوئے کہا، ''اٹھو چارپائی پر لیٹ جاؤ۔''

بیوی اسی طرح فرش پر بیٹھی ساڑی کے پلو سے اپنی ناک سر کنے لگی۔ میں اٹھ کر بس شرٹ پہننے لگا۔ بیوی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے کہا، ''تم آرام کرو۔ میں ابھی پولیس اسٹیشن سے ہو آتا ہوں۔''

''نہیں آپ کہیں نہ جائیے۔''

''گھبراؤ نہیں۔'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا، ''ابھی دس منٹ میں آ جاؤں گا۔''

''نہیں خدا کے لیے آپ ان لوگوں سے نہ الجھیے۔ وہ لوگ بہت بدمعاش ہیں۔''

''تم خوامخواہ گھبرا رہی ہو۔ یہ لوگ سیدھے سادے لوگوں پر اسی طرح دھونس جماتے ہیں۔ کسی کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تم دیکھنا دس منٹ بعد پولیس ان سب کے ہتھکڑیاں لگا کے لے جائیگی۔ کسی شریف آدمی کو اس طرح پریشان کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

''مگر آپ اکیلے ہیں اور وہ بہت سارے ہیں۔ آپ اکیلے کتنوں سے لڑیں گے۔''

''ارے میں لڑنے کہاں جا رہا ہوں۔ پولیس شکایت درج کراؤں گا۔ پولیس خود آ کر ان سے سمجھ لے گی۔ ہم اس طرح ان کی بدمعاشی کو سہتے رہیں تو جینا دو بھر ہو جائیگا۔ انھیں ان کی بدمعاشی کی آخر کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔''

بیوی کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ ''جب ہمیں یہاں رہنا ہی نہیں ہے تو پھر خوامخواہ ان کے منہ لگنے کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے ذرا کڑے لہجے میں کہا، ''تم اندر سے کنڈی لگا لو۔ تم ان باتوں کو

نہیں سمجھتیں۔ وہ لوگ ہمارے دروازے پر آ کر ہمیں یوں ذلیل کر جائیں اور ہم پولیس میں شکایت تک نہ کریں۔ اس سے بڑی بزدلی اور کیا ہوسکتی ہے۔ آج انھوں نے دروازے پر گڑبڑ کی، کل گھر میں گھس سکتے ہیں۔'' پھر لہجے کو تھوڑا نرم بناتے ہوئے کہا، ''تم سمجھ دار ہو۔ ہمت سے کام لو۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔ چلو اٹھو دروازہ اندر سے بند کرو۔''

یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔ بیوی مرے قدموں سے چلتی میرے پیچھے آئی۔ میں نے دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز بھی سنی۔ گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ پاس کی کھولیوں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ چاروں طرف ایک ناخوشگوار قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں گلی کو پار کر کے سڑک کے کنارے آ گیا۔ یہاں لیمپ پوسٹ کی ملگجی روشنی اونگھ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دائیں طرف نظر دوڑائی جہاں شاموکا شراب کا اڈہ تھا۔ چاروں طرف ٹاٹ سے گھرے اس اڈے میں کافی روشنی ہو رہی تھی۔ باہر بینچوں پر کچھ لوگ بیٹھے پیتے دکھائی دیے۔ پاس ہی سیخ کباب والا اپنی انگیٹھی دہکائے بیٹھا تھا۔ اڈے سے رہ رہ کر ہلکے ہلکے قہقہوں اور گلاسوں کے کھنکنے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ پولیس اسٹیشن جانے کا راستہ اسی طرف سے تھا۔ مگر میں اس طرف جانے کے بجائے دوسری طرف مڑ گیا اور ریل کی پٹری کراس کر کے بڑی سڑک پر نکل آیا۔ میں دل ہی دل میں پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر کے سامنے کی جانے والی شکایت کا خاکہ ترتیب دینے لگا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔ دل میں ایک طرح کی گھبراہٹ بھی تھی۔ مگر ان بدمعاشوں کو مزہ چکھانے کا جذبہ اس گھبراہٹ پر کچھ ایسا حاوی تھا کہ پیر پولیس اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہاں شریف آدمیوں سے کوئی سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔ میں ذہن میں ایسے جملوں کو ترتیب دینے لگا جن کے ذریعے پولیس انچارج کے

سامنے اپنی بے بسی اور پریشانی کا واضح نقشہ کھینچ سکوں اور وہ فوراً متاثر ہو جائے۔ پولیس اسٹیشن کی عمارت آ گئی تھی۔ گیٹ میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر میرا دل زور سے دھڑکا۔

میں عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر ورانڈے میں پہنچا۔ پاس ہی بچھی بینچ پر ایک کانسٹیبل بیٹھا ہتھیلی پر تمباکو اور چونا مسلتا نظر آیا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کر پر بینچ رکھ لی تھی اور اس کی گنجی کھوپڑی بلب کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر ایک وقفے کے لیے رکا۔ پھر بولا، ''مجھے ایک کمپلین لکھوانی ہے۔''

''کہاں سے آئے ہو؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''نہرونگر سے۔''

''کیا ہوا؟'' اس کی نظریں سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

''وہاں کچھ غنڈوں نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تھا۔''

''ہم۔'' اس نے تمباکو کو اپنے نچلے ہونٹ کے نیچے دباتے ہوئے زور سے ہنکاری بھری۔ پھر ہاتھ جھاڑتا ہوا بولا، ''جاؤ ادھر جاؤ۔'' اس نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اس طرف مڑ گیا جدھر کانسٹیبل نے اشارہ کیا تھا۔ کچھ قدم چلنے کے بعد ایک کھلا دروازہ دکھائی دیا۔ میں دروازے میں ٹھٹک گیا اور سامنے کرسی پر بیٹھے ایک موٹے حوالدار کو دیکھنے لگا۔ وہ شاید ہیڈ کانسٹیبل تھا اور گردن جھکائے ہوئے کوئی فائل الٹ پلٹ رہا تھا۔ پاس ہی ایک دوسری میز پر کوئی کلرک کچھ ٹائپ کر رہا تھا اور ایک دوسرا کانسٹیبل ایک طرف کرسی پر بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے توقف کے بعد کھنکار کر کہا، ''مے آئی، کم ان؟'' ہیڈ کانسٹیبل نے فائل سے گردن اٹھائی جماہی لینے والا کانسٹیبل چندھائی

آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے گردن ہلا کر مجھے اندر آنے کی جازت دی۔ میں اندر داخل ہوا اور میز کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔

''کیا ہے؟'' ہیڈ کانسٹیبل نے فائل پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔۔۔جی۔۔۔ مجھے ایک کمپلین لکھوانی ہے۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''نہر ونگر میں۔''

''کیا ہوا، جلدی بولو۔'' اس کا لہجہ بڑا اہانت آمیز تھا۔

میں نے دل میں الفاظ تولتے ہوئے کہا، ''جی بات یہ ہے کہ میں نہر ونگر میں پانچ نمبر بلاک میں رہتا ہوں۔ وہاں شامو دادا کا شراب کا اڈہ ہے۔ اس کے چھوکروں نے آج مجھ پر چاقو سے حملہ کرنا چاہا تھا۔''

''کیوں؟ تم نے اسے چھیڑا ہوگا۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

میں اس ریمارک پر بوکھلا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا شراب کے اڈے کا ذکر آتے ہی یہ لوگ ان غنڈوں کی غنڈا گردی کو سمجھ جائیں گے۔ کیوں کہ شامو ناجائز شراب کا کاروبار کرتا تھا۔ مگر اب حوالدار کے تیور دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے مسمی صورت بنا کر کہا۔ ''جی میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''پھر کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا جو خوامخواہ تم سے جھگڑا کرنے آ گیا۔''

اس کے درشت لہجے نے میرے رہے سہے حواس بھی غائب کر دیے تھے۔ پھر بھی میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''جی بات یہ تھی کہ وہ ہمارے گھر کے سامنے والی نالی میں شراب کی بوتلیں چھپا رہا تھا۔ میں نے منع کیا۔ بس اسی پر بگڑ گیا۔''

''ہم، یہ بات ہے۔ یہ بتاؤ تم نے منع کیوں کیا؟''

''جی!'' میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''صاحب وہ میرے گھر کے سامنے شراب چھپا رہا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ کیا مجھے اس پر اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں۔''

ہیڈ کانسٹیبل نے ایک بار مجھے گھور کر دیکھا اور بولا، ''ارے شراب کی بوتلیں نالی میں چھپا رہا تھا نا، تمھارا کیا بگڑتا تھا اس سے۔''

مجھے اب سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس موٹے حوالدار کو ایک موٹی سی گالی دی مگر بہ ظاہر اپنے لہجے کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے کہا، ''مگر حوالدار صاحب (حرامی صاحب) وہ غنڈہ آدمی ہے۔ اگر میں اس وقت اعتراض نہ کرتا تو وہ کل میرے گھر میں گھس سکتا تھا اور پھر اس کا دھندا بھی تو قانوناً ناجائز ہے۔''

''بس بس ہم کو معلوم ہے۔ یہاں قانون مت بگھارو۔ ادھر جاؤ پہلے صاحب سے شکایت کرو۔ وہ کہے گا تو ہم کمپلین لکھ لیگا۔'' اس نے بائیں طرف ایک کیبن کے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کرسی میں پڑے جماہی لیتے سپاہی سے مخاطب ہوا، ''بھالے راؤ اس آدمی کو صاحب کے پاس لے جاؤ۔''

بھالے راؤ نے ایک بار پھر منہ پھاڑ کر جماہی لی اور کچھ بڑبڑاتا ہوا ناگواری سے بولا۔ ''چلو۔''

وہ کرسی سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا کیبن کی چق ہٹا کر اندر چلا گیا۔ پھر چند سیکنڈ بعد ہی باہر نکلا اور میری طرف دیکھے بغیر بولا، ''جاؤ'' اور خود دوبارہ اسی کرسی کی طرف مڑ گیا جہاں پہلے بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔ میں چق ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک سخت چہرے اور بڑی بڑی مونچھوں والا شخص مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا اور اس کے سامنے جا

کھڑا ہوا (میرے دونوں ہاتھ نمسکار کی شکل میں اب بھی جڑے ہوئے تھے) سامنے دو خالی کرسیاں پڑی تھیں۔ مگر میں اس قدر نروس ہو گیا تھا کہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے، میز کے کونے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس سخت چہرے والے پولیس انسپکٹر نے (ہاں وہ صورت سے پولیس انسپکٹر لگتا تھا) اپنی موٹی آواز میں پوچھا۔

میں نے پھر اپنے خشک ہوتے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''صاحب میں ایک کمپلین لکھوانے آیا ہوں۔''

''کہاں رہتے ہو؟'' اس نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہرو نگر میں۔'' میں نے انتہائی نرم اور ملتجی آواز میں جواب دیا۔

''بیٹھو۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور شام کے جھگڑے کی تفصیلات سنانے لگا۔ میری گفتگو کے دوران وہ سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ وہ میری باتیں اتنی بے دلی سے سن رہا تھا جیسے کوئی گھسا پٹا ریکارڈ سن رہا ہو۔ بس وہ سننے کے لیے سن رہا تھا۔ جب میں چپ ہوا تو ایک لمحے کو اس کی تیز نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ پھر اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''اچھا تو اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''جی!'' میں اس کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس لیے جی کر کے رہ گیا۔ انسپکٹر نے شاید میرے لہجے میں چھپے استعجاب کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے فوراً دوسرا سوال کیا۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''جی صاحب میں ''سی'' وارڈ میں کلرک ہوں۔''

''گھر میں کون کون ہے؟''

''جی، میں اور میری بیوی۔''

''شاید نئے آئے ہو؟''

''جی ہاں، چھے ساتھ مہینے ہوئے ہیں۔''

''اچھا دیکھو واقعی تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور مجھے اس کا بڑا افسوس ہے مگر۔۔۔''

انسپکٹر کے ان جملوں سے میری ڈھارس بندھی اور میرا حوصلہ بھی بڑھا۔ میں نے درمیان میں جلدی سے کہا، ''سر! اگر آپ چاہیں تو۔۔۔''

انسپکٹر کو شاید میرا اس طرح درمیان میں ٹوکنا برا لگا۔ اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''پہلے ہماری بات سنو!''

''جی سر!'' میں سہم کر ایک دم سے چپ ہو گیا۔

''دیکھو! ہم ابھی تمہارے ساتھ دو چار سپاہی روانہ کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے آدمیوں کی مشکیں کسوا کر یہاں بلا سکتے ہیں۔ مگر سوچو اس سے کیا ہوگا۔ وہ دوسرے ہی دن ضمانت پر چھوٹ جائیگا اور پھر تمہیں وہی رہنا ہے اور وہ ہے غنڈا آدمی۔ چھوٹنے کے بعد وہ انتقاماً کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کیا تم میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے ٹکرا سکو؟''

''مگر سر! قانون۔۔۔''

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کرا دیا اور سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا ہوا بولا۔

''قانون کی بات مت کرو۔ قانون ہم کو بھی معلوم ہے۔ پولیس تمھاری

کمپلین پر ایکشن لے سکتی ہے۔ مگر چوبیس گھنٹے تمہاری حفاظت کی گارنٹی نہیں دے سکتی۔''

میں گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ انسپکٹر نے دوسری سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! تم سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ہو سکے تو وہ جگہ چھوڑ دو اور اگر وہیں رہنا چاہتے ہو تو پھر ان غنڈوں سے مل کر رہو۔''

''مگر سر! وہ ناجائز شراب کا دھندا کرتا ہے کیا پولیس اس کا دھندا بند نہیں کرا سکتی؟'' (مجھے فوراً احساس ہوا کہ مجھے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا) ایک پل کے لیے انسپکٹر کی آنکھوں میں غصہ اتر آیا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر گمبھیر آواز میں بولا، ''پولیس خوب جانتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ شاموکا دھندا بند ہونے سے سارے کالے دھندے بند ہو جائیں گے، ایسا نہیں ہے۔''

جی میں آیا کہہ دوں۔ کالے دھندے تو بند نہیں ہوں گے۔ مگر شاموسے ملنے والا ہفتہ ضرور بند ہو جائیگا اور تم یہی نہیں چاہتے۔ مگر ایسا کچھ کہنا اپنے آپ کو اندھے کنویں میں گرانے جیسا ہی تھا۔ کیوں کہ اگر یہ سامنے بیٹھا ہوا انسپکٹر ناراض ہو جائے تو الٹا مجھے اندر کرا سکتا ہے۔ میں نے کتنی ہی دفعہ شاموکے اڈے پر پولیس والوں کو کوکا کولا پیتے اور سیخ کباب اڑاتے دیکھا تھا۔ ایک دو دفعہ تو وہ باہر بیٹھا ہوا ہیڈ کانسٹیبل بھی دکھائی دیا تھا۔ یہ میری ہی بھول تھی کہ میں یہاں دوڑا چلا آیا تھا۔ مجھے سچ مچ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ان حرام خوروں سے منصفی کی توقع رکھنا، کنجوس سے سخاوت کی امید رکھنے جیسا ہی تھا۔ مجھے یوں گم سم بیٹھا دیکھ کر انسپکٹر نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں رگڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! اب بھی کمپلین لکھوانا چاہتے ہو تو باہر جا کر لکھوا دینا۔ ایک کانسٹیبل

تمہارے ساتھ جائیگا اور شاموکو یہاں بلا لائیگا۔اب تم جاسکتے ہو۔'' اتنا کہہ کر اس نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی۔جھٹ ایک حوالدار اندر داخل ہوا۔انسپکٹر نے رعب دار آواز میں کہا۔

''دیکھو یہ کوئی کمپلین لاج کرانا چاہتے ہیں۔ پانڈے سے کہو ان کی کمپلین لکھ لے اور بھالے راؤ کو ان کے ساتھ بھیج دے۔''

''یس۔۔۔سر۔۔۔!'' حوالدار نے سر جھکا کر کہا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔''چلو۔''

میں حولدار کے پیچھے باہر نکل آیا۔حولدار نے اسی موٹے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''پانڈے صاحب! بڑے صاحب نے اس آدمی کی کمپلینٹ لاج کرنے کو کہا ہے۔''

پانڈے نے خشونت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ چڑچڑاہٹ اور بیزاری اس کے چہرے سے صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی اور میری نظریں ملیں۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''نہیں مجھے کوئی کمپلین نہیں لکھوانی ہے۔''

اتنا کہہ کر میں تیزی سے دروازے کے باہر نکل گیا۔اپنے پیچھے میں نے پانڈے کی آواز سنی جو شاید بھالے راؤ سے کہہ رہا تھا۔

''ذرا ان کا حلیہ تو دیکھو۔دم تو کچھ بھی نہیں اور چلے ہیں دادا لوگوں سے ٹکر لینے۔''

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پولیس اسٹیشن کے باہر نکل آیا۔کلائی کی گھڑی دیکھی، دس بج رہے تھے۔دکانیں قریب قریب بند ہوچکی تھیں۔صرف، نیو اسٹار، ہوٹل

کھلا تھا اور پان والے کی دکان پر کچھ لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ میں جیب سے دس پیسے کا ایک سکہ نکالا اور پان والے سے ایک پنامہ سگریٹ خرید کر پاس ہی جلتے ہوئے چراغ سے اسے سلگایا۔

میرے قدم پھر اپنے محلے کی طرف اٹھ گئے۔ میں اس وقت بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ نہ مجھے شامو پر غصے آ رہا تھا نہ پانڈے حوالدار پر نہ پولیس انسپکٹر پر۔ مجھے وہ تینوں ایک جیسے ہی لگے۔ انسپکٹر کی باتوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا، سچائی، انصاف اور شرافت سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقی زندگی سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس دنیا میں شریف اور ایمان دار آدمی کو لوگ اسی طرح نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس طرح کسی زمانے میں برہمن، شدر لوگوں کو دیکھتے تھے۔ میں ریلوے پٹری کراس کر کے پتلی سڑک پر آ گیا تھا۔ نالیوں سے اٹھنے والے بدبو کے بھبکوں نے میرا استقبال کیا۔ میں پھر اپنے محلے میں داخل ہو چکا تھا۔ سامنے شامو کے اڈے پر ویسی ہی چہل پہل تھی۔ سیخ کباب والے کی انگیٹھی برابر دہک رہی تھی اور گلاسوں کی کھنک اور پینے والوں کی بہکی بہکی گالیاں فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔

میں ایک پل کے لیے ٹھٹکا۔ پھر اپنے گھر کی طرف مڑنے کے بجائے شامو کے اڈے کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے اڈے کا جائزہ لیا۔ پانچ دس آدمی بنچوں پر بیٹھے، سیخ کباب چکھتے، شراب کے گھونٹ لے رہے تھے۔ سوڈا واٹر کی بوتلیں اور شراب کے گلاس ان کے سامنے رکھے تھے۔ دیسی شراب کی تیز بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ دو چھوکرے پینے والوں کو سرو کر رہے تھے۔ ان میں ایک وہی تھا، جس نے مجھ پر چاقو اٹھایا تھا۔ میں جیسے ہی روشنی میں آیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے وہ چونکا پھر اپنے ہاتھ میں دبی سوڈے کی بوتل دوسرے چھوکرے کے ہاتھ

میں تھماتا ہوا دھیمی آواز میں کچھ بولا۔ اس چھوکرے نے بھی پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر لپک کر اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ مجھ پر چاقو اٹھانے والا اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اسی طرح کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا قریب کی ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں شامو لنگی اور بنیان پہنے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ دو چھوکرے اور بھی تھے۔ شامو کے تیور اچھے نہیں تھے۔

''کون ہے رے!'' اس نے تیکھے لہجے میں مجھ پر چاقو اٹھانے والے چھوکرے سے پوچھا۔ پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ بھی ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ان چھوکروں سے کچھ کہا۔ جسے میں نہیں سن سکا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے چھوکرے چند قدم کے فاصلے سے مجھے نیم دائرے کی شکل میں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ شراب پینے والے دوسرے گاہک بھی اب بہکی بہکی باتیں کرنے کی بجائے ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ شاید وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اب یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ میں اسی طرح بینچ پر بیٹھا شامو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شامو نے اپنی لنگی اوپر چڑھاتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''اب کیا ہے؟''

معاً اس کی اور میری نظریں ملیں۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں نے نہایت پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''پاؤ سیر موسمبی اور ایک سادا سوڈا۔''

شامو کے ہاتھ سے لنگی کے چھور چھوٹ گئے اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

نیم دائرے کی شکل میں کھڑے اس کے چھوکرے بھی حیران نظروں سے

ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ان کے لیے میرا یہ رویہ شاید قطعی غیر متوقع تھا۔وہ سب پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس وحرکت کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت ایک عجیب قسم کی پریشانی جھلک رہی تھی۔چند ثانیوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو،اس وقت وہ مجھے بہت بے بس نظر آئے اور ان کی اس بے بسی کو دیکھ کر مجھے اندر سے بڑی راحت کا احساس ہوا۔چند سیکنڈ تک کوئی کچھ نہ بولا۔میں نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں آگے کہا،

''اور ایک پلیٹ بھنی ہوئی کلیجی بھی دینا۔''

●●●

☆.....سید محمد اشرف

لکڑ بگھا چپ ہو گیا

اسٹیشن سے گاڑی نکلے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ سینکڑوں فولادی قینچیوں پہ چلتی ریل گاڑی نے سیٹی بجائی۔ انجن سے گارڈ کے ڈبے تک تمام ڈبوں کے بریک چرچرائے اور شروع ہوتی برساتی رات تلے روشن اور نیم روشن کوپے چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ ریل کے شور میں دبی مسافروں کی آوازیں بلند اور واضح ہو گئی تھیں۔

کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ ماہوٹ کی بارش کا پانی ڈبے کی چھت سے بہہ کر شیشوں تک آتا، بوند بوند کر کے آہستہ آہستہ نیچے سرکتا اور جب کئی بوندیں کسی جگہ مل جاتیں تو ایک بڑی بوند بن کر نم لکیر بناتا کھڑکی کے نچلے حصے کی طرف بہتا چلا جاتا۔ اسے یہ کھیل دیکھنے میں مزہ آ رہا تھا۔

''کیوں رک گئی؟'' نانا نے برابر والے سے پوچھا۔ وہ نانا کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا، کسمسایا اور پھر بوندوں کا کھیل دیکھنے لگا۔

''کیا معلوم۔۔۔ کالج کے لونڈوں نے زنجیر کھینچ دی ہوگی۔'' سامنے بیٹھا مونچھوں والا مسافر بولا۔

''آج تو اتوار تھا۔ کوئی اور بات ہے۔ ذرا دیکھنا بھائی۔ کیا چکر ہے؟''

''باہر بہت بارش ہے بڑے میاں۔'' کھچا کھچ بھرے ڈبے میں وہ جگہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

نانا نے کھڑکی اوپر سرکائی ہی تھی کہ ٹھنڈی ہوا اور تیز بوچھار اندر گھس آئی۔ کئی مسافروں نے احتجاج کیا لیکن نانا نے کھڑکی کے باہر سر نکال کر دیکھ ہی لیا۔ نانا کی گردن کے نیچے سے سر نکال کر اس نے بھی دیکھا۔ خاموش برساتی رات میں دور والے سگنل کی سرخ آنکھ روشن تھی۔ وہ ڈر گیا اور سر اندر کر کے چپ چاپ بیٹھ گیا۔ نانا نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ ان کے اور قریب سرک آیا۔ ایک دم کالی رات میں لال لال روشنی! سامنے بیٹھی اس سے ذرا بڑی عمر کی لڑکی اسکارف میں چپکے سے مسکرائی۔ وہ اس کی طرف بہت دیر سے دیکھ رہی تھی اور اس کا ڈر محسوس کر رہی تھی۔ لڑکی کو مسکراتا دیکھ کر اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔

''ڈبل لائن ہوتی تو گاڑی ایسے ہی تھوڑے رک جاتی۔'' نانا نے چہرے کا پانی رومال سے خشک کرتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ گاڑی کی لائن تو ڈبل ہی ہوتی ہے۔ اکیلی پٹری پر گاڑی کے دونوں طرف کے پہیے کیسے چل سکتے ہیں بھلا۔ نانا کی طرف اس نے پوچھنے والے انداز سے دیکھا۔ مونچھوں والا اس کا سوال سمجھ گیا۔

''ایسا ہوتا ہے بیٹے کہ اگر ایک ہی پٹری پر آنے جانے والی دونوں طرف کی گاڑیاں چلتی ہیں تو اگلے اسٹیشن پر ادھر سے آنے والی گاڑی روک دیتے ہیں۔ جب ایک طرف کی گاڑی پاس ہو جاتی ہے تو دوسری طرف کی گاڑی چھوڑتے ہیں۔''

''تو ہماری گاڑی کیوں روک دی۔ ہماری گاڑی نے تو ابھی ابھی چلنا شروع کیا تھا۔'' اس نے مونچھوں والے کے بجائے نانا سے سوال کیا۔ یہ بات اسکارف والی لڑکی کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ بھی بڑے میاں کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''دراصل ادھر والی گاڑی ابھی اسٹیشن پر آئی نہیں ہوگی۔'' نانا نے بتایا۔ جو

شخص بہت دیر سے اوپر کی برتھ پر لیٹا ایک موٹی سی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا، بولا، ''پٹری ایک ہے اور گاڑیاں بہت اور کوئی گاڑی ابھی اسٹیشن پر نہیں پہنچی ہے۔ سب بیچ میں ہیں۔ اسی لیے گاڑی روک دی۔۔۔'' پھر وہی آدمی زور سے چلایا، ''کون ہے جو روکتا ہے گاڑیاں؟'' اتنے حصے کے سارے مسافر منھ اٹھائے، بے تکے جملے بولنے والے اس شخص کو دیکھ رہے تھے لیکن پھر کتاب والا آدمی کچھ نہیں بولا۔ تب اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس نے نانا کا کاندھا پکڑ کر بہت یقینی انداز میں کہا، ''ہیں نانا۔ اسٹیشن بابو روکتے ہوں گے گاڑیاں؟''

''ہاں بیٹا۔''

وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ جو بات موٹی کتاب والا نہیں جانتا وہ اسے معلوم تھی۔ اس نے بہت فخر کے ساتھ اسکارف والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اپنی چھوٹی بہن کے لیے بسکٹ کا ڈبہ کھول رہی تھی۔ معلوم نہیں اس نے سنا کہ نہیں، ''چلتی ہوئی گاڑیاں اسٹیشن بابو روکتے ہیں۔'' اس نے چلا کر کہا۔ نانا، مونچھوں والا، وہ لڑکی اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی آواز زور سے نکل گئی تھی۔ وہ جھینپ مٹانے کے لیے نانا کے رومال کا چوہا بنانے لگا۔ اور تب اس نے دیکھا کہ اسکارف والی لڑکی نے اپنی بہن کی آنکھ بچا کر آدھے سے زیادہ بسکٹ اپنی فراک کی جیب میں رکھ لیے ہیں۔ یہ دیکھ کر اسے ایک انجانا سا دکھ ہوا۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ دور بستی کی روشنیاں بارش کے پس منظر میں آڑی ترچھی متحرک کرنیں بنا بنا کر چمک رہی تھیں۔ اچانک گاڑی سے تھوڑی دور چار دیواری میں بنے مکان میں بلب روشن ہوا۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ بڑے سے مکان کے بڑے سے برآمدے میں ایک بڑی سی میز پر ایک بڑا سا کتا بڑا سا منھ پھاڑے کھڑا ہے۔

''نانا۔نانا۔دیکھیے میز پر کتا کھڑا ہے۔''اس نے نانا کا کندھا ہلا کر کہا۔نانا نے ادھر منھ کیا اور آنکھیں چندھی کر کے اس طرف دیکھا اور مسکرائے۔

''نہیں بیٹے، یہ کتاب نہیں لکڑ بگھا ہے۔ایس۔پی صاحب نے اس خونی لکڑ بگھے کو اکیلے مارا تھا۔میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔اس کی کھال میں بھوسہ بھروا کر برآمدے میں سجاوٹ کے لیے لگا رکھا ہے۔''

''لکڑ بگھا کون ہوتا ہے نانا؟''اس نے ڈر محسوس کیا۔تب اسکارف والی لڑکی نے جلدی سے کہا،''لکڑ بگھا اصل میں بھیڑیا ہوتا ہے۔''

''بھیڑیا کون ہوتا ہے؟''اس نے پوچھا۔

''بھیڑیا! بھیڑیا!''وہ رک گئی۔سوچنے لگی پھر بولی،''بھیڑیا اور لکڑ بگھا سب ایک جیسے جانور ہوتے ہیں۔''تب مونچھوں والے نے کہا،''مگر یہ لکڑ بگھا ذرا الگ تھا۔یہ ہنستا بھی تھا اور مرتے دم رویا بھی تھا۔''

''ارے!''اس کے منھ سے بس اتنا ہی نکلا۔اس نے نانا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔تب مونچھوں والا بولا،''اسی لیے جب اس کی ٹرافی بنی تو کاریگر نے کمال ہی کر دیا۔اس کا منھ پھیلا کر جبڑوں میں ایک تنکا ایسے پھنسا دیا کہ منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔کبھی لگتا ہے یہ ہنس رہا ہے۔کبھی لگتا ہے منھ پھاڑے رو رہا ہے۔''یہ سب سن کر اس کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔تب اوپر سے کتاب والے نے بھاری آواز میں کہا،''یہ ہمیشہ ہنستا ہی رہتا ہے۔یہ ہمیشہ روتا ہی رہتا ہے۔''

اس نے پہلے تو اسکارف والی لڑکی کی طرف دیکھا۔پھر ہمت کر کے آہستہ آہستہ نظریں ادھر کیں اور کھڑکی کے باہر چار دیواری میں بنے مکان کے برآمدے میں میز پہ کھڑے اس لکڑ بگھے کو دیکھا۔اسے لگا جیسے وہ ہنس رہا ہے۔اسے لگا جیسے وہ رو رہا ہے۔اچانک کسی نے کھڑکی کے باہر سے چلا کر کہا،''دروازہ کھلوا دو بھائی

صاحب۔آخری گاڑی ہے۔میرا جانا بہت ضروری ہے۔میری مدد کرو خدا کے لیے۔''
نانا نے کھڑکی کے شیشے پہ ہاتھ رکھے رکھے باہر کھڑے شخص کو دیکھا جو دھیمی روشنی کے باوجود بہت بیتاب نظر آ رہا تھا۔اس نے ہنستے روتے لکڑ بگھے کی جانب سے نگاہیں واپس کھینچیں اور دیکھا کہ دھندلے شیشوں کے پیچھے وہ آدمی بارش میں بالکل شرابور ہو چکا ہے۔اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک تھیلا جیسا تھا جسے بچانے کے لیے وہ جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

''دروازہ نہیں کھلے گا۔اسٹیشن پر کیوں نہیں بیٹھ گیا تھا۔''مونچھوں والا گرجا۔
باہر والے نے منھ پھلا کر سانس کے زور سے پھونک مار کر بالوں اور چہرے سے بہتی پانی کی بوندوں کو دھکیلا اور ایسے چلایا جیسے ڈوبتا ہوا آدمی چلاتا ہے،''دروازہ کھلوا دو میں سب بتا دوں گا۔جلدی کرو بھائی صاحب جلدی۔گاڑی چل دیگی۔''

''آج کل کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔معلوم نہیں کوئی چورا چکا ہو۔دروازہ مت کھلنے دینا۔''ڈبے کے اندر کوئی مسافر بولا تھا۔اس نے دیکھا کہ نانا شش و پنج میں تھے۔اب باہر والے نے تھیلا ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے کھڑکی کا شیشہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

''یہ مت کرو جی۔صبح والی گاڑی سے چلے آنا۔ڈبے میں ویسے ہی جگہ نہیں ہے۔''نانا نے چلا کر کہا۔

''دروازے میں بیٹھ جاؤں گا۔بھائی کے لیے خون کی بوتل لے کر جا رہا ہوں۔صبح اس کا آپریشن ہے۔نہیں پہنچا تو وہ مر جائیگا۔جلدی کرو بابا۔گاڑی چلنے ہی والی ہے۔''وہ رحم طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بہروپیا ہے۔جھوٹا ہے۔''مونچھوں والا پھر گرج کر بولا۔اپنی گرج سے وہ باہر والے کو کم،اندر والوں کو زیادہ ڈرانا چاہتا تھا۔دراصل ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

گیلری تک میں آدمی بھرے پڑے تھے۔ دروازے کا شیشہ اور شٹر سب بند تھے۔ اسی لیے وہ دروازے سے ملی کھڑکی میں بیٹھے بڑے میاں سے رحم طلب کر رہا تھا۔ اسکارف والی لڑکی کی ماں اپنے پچھلے سفر میں ملے کسی چور کا ذکر بلند آواز میں کرنے لگی تھی۔

''میں چور نہیں ہوں۔ قسم سے میں چور نہیں ہوں۔'' بارش کے شور میں اس کی آواز دب رہی تھی، ابھر رہی تھی۔ نانا کے پہلو سے لگے لگے اس نے محسوس کیا کہ اس کی رگیں کھنچ رہی ہیں اور کوئی چیز سینے میں بری طرح گھٹ رہی ہے۔

''نانا۔ نانا۔ دروازہ کھلوا دو۔ دیکھو اس کا بھائی مر جائیگا۔ نانا۔ میں کھول آؤں؟''

''بیٹھے رہو تم۔'' نانا کے بولنے سے پہلے مونچھوں والے نے ڈپٹ کر کہا۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے مونچھوں والے کی طرف دیکھا، پھر نانا کی طرف دیکھا جو خاموش تھے۔ پھر اسکارف والی کو دیکھا جو سب کچھ سن رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد کھڑکی کے باہر چار دیواری میں بنے مکان کے برآمدے میں میز پر کھڑے منہ پھاڑے لکڑ بگھے کو دیکھ لیتی تھی۔ اس کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کر کے اسکارف والی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ مسکرائی نہیں تھی۔

اسکارف والی کی سوچ کو محسوس کر کے اس نے اپنے اندر ہمت محسوس کی اور سوچا کہ یہ مونچھوں والا شخص بڑا کمینہ ہے۔ یہ تو خود چور جیسا لگتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب نانا نے گاڑی رکنے کی وجہ جاننے کو کہا تھا تو کیسا بہانہ ملا رہا تھا کہ باہر بارش ہے۔ کوئی نیچے تھوڑے ہی اتر کر دیکھنا تھا۔ اس کو ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی اس کے اٹھتے ہی اس کی جگہ پر نہ بیٹھ جائے۔ کمینہ۔۔۔ مونچھیں ہونے پر بھی ڈرتا ہے کہ باہر والا آئیگا اور چور بن کر اسے کھا جائے گا۔ اصل میں ڈرتا ہے نا، باہر والا آئیگا تو تھوڑی جگہ گھیر لیگا

اوراپنے بھیگے کپڑوں سے اسے بھگادیگا۔جھوٹا۔۔۔مکار۔۔۔

نانا جو کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے، اب کھڑکی کے شیشے سے رستے پانی میں آہستہ آہستہ بھیگنے لگے تھے۔کھڑکی کے شیشوں پراب باہر والے نے جنونی انداز میں ہاتھ مارنا شروع کردیا تھا۔اس کے ہاتھ کی ضرب کی دھمک سے شیشوں پر چپکا پانی بار بار نانا کے کپڑوں پر چھلک آتا تھا۔اچانک اس کے ننھے سے ذہن میں ایک بجلی سی کوندی،''نانا۔اسے دروازہ کھول کراندر کرلو۔اس کا بھائی مرگیا تو سب پر گناہ پڑیگا۔ اسے کھڑکی کے پاس بٹھادینا،توتم بھی پانی سے بچ جاؤ گے۔ہیں نانا؟''

نانا نے مونچھوں والے کا تاثر جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔مونچھوں والے کی ماتھے کی رگیں اس تجویز پر کھلنے لگی تھیں اور چڑھی ہوئی آنکھ کے انگارے ماند پڑنے لگے تھے اور آہستہ آہستہ چہرے کی سختی دور ہورہی تھی۔ننھے سے بچے کے مدد کے جذبے کو دیکھ کر اور اپنی اپنی سیٹ محفوظ خیال کر کے سب مطمئن نظر آرہے تھے۔اسکارف والی کی ماں نے بھی پچھلے سفر کے چور کا قصہ درمیان میں چھوڑ دیا تھا اور نظریں نیچے کیے چھوٹی بچی کو کمبل میں لپیٹنے لگی تھی۔باہر والا زور سے گھگھیا کر چیخا،''تم سب کو اپنے اپنے بھائیوں کا واسطہ۔دروازہ کھلوادو۔بتی ہری ہو گئی ہے۔گاڑی چلنے ہی والی ہے۔''

اس نے نانا کی طرف دیکھا، تیزی سے اٹھا، مسافروں کی ٹانگوں سے الجھتا، ٹکراتا گھوم کر دروازے پر پہنچا۔مسافر ہاں ہاں کرتے ہی رہ گئے، اس نے دروازہ کھول دیا۔باہر والا بجلی کی طرح اندر آیا اور دروازہ بند کر کے زور زور سے ہانپنے لگا۔وہ نیلے رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھا جو بدن پر چپک کر رہ گئی تھی۔

''میں نے دروازہ کھولا ہے۔''اس نے نیلی قمیص والے کی طرف دادطلب نظروں سے دیکھ کر کہا۔نیلی قمیص والے نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ ایک ننھا

سا فرشتہ ہو جو اپنے پنکھ گھر کی الماری میں بند کر آیا ہو۔

''ہمارے نانا کے پاس کھڑکی کی طرف بیٹھ جانا۔ نانا پر پانی آنے لگا ہے۔''
اس نے کہا۔ نیلی قمیص والے نے تھیلا احتیاط سے رکھ کر اپنے کپڑے اتارے۔ سردی میں تھرتھراتے کانپتے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو کھڑکی کھول کر باہر نکال کر نچوڑا، پانی جھٹکا اور مونچھوں والے نے ترچھی نظر کر کے مشکوک انداز سے اس کے تھیلے کی طرف دیکھا۔ پلاسٹک کے تھیلے میں خون کی بوتلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسے مایوسی ہوئی۔ وہ بڑبڑایا، ''آخر جب سگنل ہو گئے تو گاڑی چلتی کیوں نہیں؟'' اس کا دل چاہا کہ ابھی گاڑی کچھ دیر اور کھڑی رہے۔ وہ لکڑ بگھے کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسکارف والی اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی کہ اگر منھ میں پھنسا تنکا گر جائے تو کیا پھر بھی لکڑ بگھے کا منھ ایسے ہی کھلا رہیگا۔

''معلوم نہیں۔ گاڑی کیوں رکی کھڑی ہے کم بخت۔'' اس کی ماں نے اونگھتے اونگھتے آنکھیں کھول کر کہا۔ نانا نے اسے بتانا شروع کیا، ''یہ تو نہیں معلوم کہ یہ ہنسا کیوں تھا اور رویا کیوں تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب بھی جب تیز ہوائیں چلتی ہیں اور اس کے کھلے ہوئے منھ سے ہو کر گزرتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ زور زور سے ہنس رہا ہے یا جیسے زور زور سے رو رہا ہے۔ پر بیٹا یہ ہے بڑا منحوس جانور۔ یہ جس دن مرا تھا اس کے دوسرے ہی دن کپتان پولیس نے اپنا تبادلہ کرا لیا تھا۔ یہ ٹرافی تو اگلے ایس پی صاحب نے بنوائی تھی۔''

اچانک نانا نے نیلی قمیص والے کی طرف دیکھ کر کہا، ''ذرا کھڑکی گھیر کر بیٹھو جی۔ پانی مجھے بھگوئے دے رہا ہے۔'' نانا کی اس بات نے اسے دکھ دیا۔ اچانک پوری گاڑی کی بجلی چلی گئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اس نے سہم کر نانا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ مسافروں نے ریل کی بدانتظامیوں پر گفتگو کرنا شروع کر دی۔ نانا نے

کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا۔ گارڈ چھتری لگائے گزر رہا تھا۔

''کیا ہوا گارڈ صاحب اندھیرا کیوں ہو گیا۔'' نانا نے زور سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بیٹھے رہو۔ ڈائنا کا تار نکل گیا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیگا۔''

ڈبے میں بالکل تاریکی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک دوسرے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ تاریکی کے ساتھ خاموشی بھی کہیں سے در آئی تھی۔ سکوت اور اندھیرا۔ اسی لیے باہر کا منظر کچھ اور روشن اور با آواز ہو گیا تھا۔ باہر بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا لیکن ہوا تیز ہو گئی تھی۔ نیلی قمیص والے نے کھڑکی آدھی کھول لی تھی۔ اب بوچھار نہیں آ رہی تھی۔ باہر کوئی بھاگتا ہوا آیا اور نیلی قمیص والے کا بازو پکڑ کر بولا، ''دروازہ کھول دو بھیا۔ اسٹیشن سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے مل پائی ہے۔'' اس نے نانا کا ہاتھ پکڑے پکڑے مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی سیٹ پر خود کو محفوظ سوچے مطمئن تھا اور اونگھ رہا تھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا ڈبے پر سے ہوتا ہوا چار دیواری میں بنے مکان کے برآمدے کی طرف گیا اور خاموش تاریک رات میں ایک ہولناک آواز ابھری۔ وہ کانپ گیا۔ نانا نے اسے لپٹاتے ہوئے سرگوشی کی، ''دیکھو لکڑ بگھا ایسے ہنستا ہے۔ اس طرح روتا ہے۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ لکڑ بگھا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ ہنس رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ برآمدے کی روشنی میں اس کے جبڑے صاف نظر آ رہے تھے جن میں نوکیلے دانت چمک رہے تھے۔ اسے اپنے اندر سنسنی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اسکارف والی بھی اپنی ماں سے چمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ڈبے میں سب خاموش تھے۔ باہر کھڑے آدمی نے نیلی قمیص والے کا شانہ زور زور سے ہلایا، ''بھائی صاحب میری مدد کرو۔ میرے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اسپتال میں دم توڑ رہا ہے۔''

نیلی قمیص والے نے اپنے تھیلے کو مضبوطی سے سنبھالا۔ باہر کھڑے گھگھیاتے خوشامد کرتے آدمی کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹایا، کھڑکی کا شیشہ گرایا اور اونگھنے لگا۔ اسکارف والی زور سے چلائی، ''امی۔ امی۔ دیکھو۔ لکڑ بگھا اب نہ ہنس رہا ہے، نہ رو رہا ہے۔ ہوا کے زور سے وہ تنکا گر گیا۔ لکڑ بگھا چپ ہو گیا امی۔''

جو اتنی دیر سے سب کچھ سن رہا تھا، سب کچھ دیکھ رہا تھا، اس نے اپنی نانا کی کمر مضبوطی سے پکڑ کر نیلی قمیص والے کی آنکھوں میں دیکھا۔ نیلی قمیص والے کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے چار ہوئیں اور ڈبے کے نیم تاریک سناٹے میں اس نے بہت واضح محسوس کیا کہ نیلی قمیص والے کی آنکھیں پہلے سے چھوٹی ہو گئی ہیں اور جبڑے آپس میں بھنچ گئے ہیں۔

●●●

☆.....نورشاہ

آواز کی کہانی

ریڈیو کے ایک پروگرام کے لئے میری کہانی کی ریکاڈنگ تھی اس لئے ریڈیواسٹیشن جانا پڑا اس کام سے فارغ ہونے کے بعد شاہد نے کنٹین میں گرم گرم چائے پینے کی دعوت دی میں انکار نہ کرسکا۔کنٹین جاتے جاتے کئی نئے پرانے چہرے دکھائی دیئے۔

''یہ نازیہ ہے آپ کی فرمائش کا پروگرام پیش کرتی ہیں''۔

''ارے بھائی ان کی آواز سے کون واقف نہیں۔۔جادوائی آواز ہے ان کی۔۔۔ اور پھر ان کا انداز بیان۔۔بہت خوب۔۔

''بہت بہتر۔۔آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''شکریہ۔۔جلدی میں ہوں اسٹوڈیو میں میرا انتظار ہو رہا ہے''

ابھی ہم دو ہی قدم آگے آئے تھے کہ ایک اور سندر سندر سا سراپا سامنے کھڑا ہوگیا۔

''شاہد کیا حال ہے۔کنٹین جارہے ہو۔''

''ہاں ہاں آپ بھی چلئے نا۔۔یہ فلک ہے فلک ملک۔۔ان کی آواز سے بھی آپ واقف ہوں گے۔''

''کمال کرتے ہو۔بخوبی واقف ہوں ان کی آواز سے۔۔بہت میٹھا س ان کی آواز میں اور اگر یہ کہہ دوں کو جب بھی ان کی آواز سنتا ہوں تو لگتا ہے کہ کانوں میں

جیسے قطرہ قطرہ شہد ٹپک رہا ہے اور پھر ان کا تلفظ۔۔جملوں کی ادائیگی۔۔۔!''

شاہد نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔فلک چائے پیوگی ہمارے ساتھ۔

''اس وقت ممکن نہیں ہے پھر کبھی۔۔۔''

اب ہم کنٹین کے قریب پہنچ چکے تھے کہ ایک اور خوبصورت سا ہنستا مسکراتا سراپا آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''یہ ہے زلیخا۔''

''اچھا تو آپ ہی زلیخا ہیں۔جانتا ہوں زلیخا جی کو ان کی آواز کی بدولت۔سنطور کی تہہ سے ابھرتی ہوئی آواز۔۔۔''

''آپ ان کو بھی جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔۔شاہد نے پوچھا۔۔

جانتا اور پہچانتا بھی ہوں صورت سے نہ سہی لیکن ان کی آواز ہی میری پہچان کی بنیاد ہے۔ان کی آواز کا شیدائی ہوں' آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں حالانکہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتی اور میں آپ کی تعریف کے قابل بھی نہیں۔کیونکہ مجھ میں ایسی کوئی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے''

زلیخا نے شرماتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے کہنے دیجئے۔۔شاہد جب بھی ان کی آواز۔۔۔مدھر مدھر سی آواز میرے ریڈیو سٹ سے ابھرتی ہے تو۔۔تو۔۔اب کیا کہوں۔

اپنے آپ میں کھو جاتا ہوں۔''

''میں چلتی ہوں اور وہ میری پوری بات سنے بغیر ہی چلی گئی۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں؟۔''

''کیا کمال۔۔''

''آپ کا کمال یہ ہے۔۔۔بلکہ جادوائی کمال کہ زلیخا کو ٹیبل سے اٹھا کر

مائک کے سامنے کھڑا کیا۔دفتر سے اسٹوڈیو میں منتقل کیا اور ان کے تعلق سے کچھ نہ جانتے ہوئے بھی آواز کے شیدائی بن گئے۔''

''کیا مطلب۔۔؟''

''میرے بھائی کہانی کا ردوست۔۔زلیخا کا نہ تو پرواگرموں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی مائک سے۔۔دفتر میں کام کرتی ہیں،قلم چلاتی ہیں اور فائلوں میں سر کھپاتی ہیں پھر بھی آپ ان کی آواز کے شیدائی ہیں۔۔اب جانے بھی دیجئے بہت ہو چکا۔کنٹین آچکا ہے اور یہاں جانے کتنے اور چہرے نظر آئے گے جن کی آواز کے شیدائی بننے میں آپ کو دیر نہیں لگے گی۔اس لئے خاموشی سے چائے پیتے ہیں اور آپ کی آواز کی کہانی کو کسی اور ریکاڈنگ کے لئے ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔۔۔!''

●●●

☆.....نورالحسنین

19 مارچ 2350ء

خضر میاں نے بٹن دبایا اور اسکرین پر 19 مارچ 2350ء کی تاریخ منہ چڑھانے لگی، اُنھوں نے گردن اونچی کی اور ۵۷۷ منزلہ عمارت کے فلیٹ نمبر ایک کی کھڑکی میں سے نیچے دیکھنے کو کوشش کی لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دیا، اُنھوں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا، آج میری ۱۶۶ ویں سالگرہ ہے لیکن اسے منانے کے لیے اس وقت کوئی بھی میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں مبارکبادیوں کے پیغامات خوب مل رہے ہیں۔ اُنھوں نے البم کو کلک کیا اور اُن کے سامنے اُن کی بیوی کی تصویر آ گئی اور اُن کے منہ سے نکلا، ''کیا یہ ضروری تھا کہ تم بھی مجھے چھوڑ کر پلوٹو کے شہر زم زم زاں میں ڈاکٹری کرو؟ اور وہ نالائق بھی میری مرضی کے خلاف مریخ کے کسی دور افتادہ بستی میں اپنی بیوی کے ساتھ آباد ہو گیا۔ پورے پندرہ برس ہو گئے اور میں یہاں اکیلا ۔۔۔۔ ابھی اگلا جملہ اُن کے دماغ میں آنے ہی والا تھا کہ سامنے کی دیوار میں کچھ چنگاریوں کے مانند تنکے گردش کرنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھندلے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ عکس دو خوبصورت بچوں میں تبدیل ہو گیا اور اُن کی معصوم آوازیں بلند ہوئیں، ''دادا جان سالگرہ مبارک ہو!''

''تم۔۔۔؟'' انھوں نے اپنی باہیں پھیلا دیں، اور دونوں بچے اُن کے سینے سے لگ گئے، ''تم دونوں اچانک کیسے یہاں پہنچ گئے۔؟''

''دادا جان ہم تو چاند پر کھیل رہے تھے کہ دادی امّاں کا Massage ملا

کہ آج تمہارے دادا جان کی سالگرہ ہے۔'' بارہ برس کے روشن نے دادا کو چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بتایا اور آٹھ برس کی روشنی نے دادا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''دادی امّاں کا حکم تھا کہ تمہارے دادا اکیلے ہیں۔ سالگرہ کے دن اکیلا رہنا اُنھیں بالکل پسند نہیں ہے۔ جاؤ اور جا کر اُن کی سالگرہ سلیبریٹ کرو۔۔۔۔ اور بس ہم آ گئے۔''

''لیکن تم لوگ تو مریخ۔۔۔!''

''دادا جان چاند پر نیا اسکول قائم ہوا ہے۔ ہم نے وہیں پر ایڈمیشن لیا ہے۔''

''اوہ۔۔۔۔!'' خضر میاں نے حیرت سے بچوں کی جانب دیکھا۔

''دادا جان آپ ہمارے ساتھ مریخ پر کیوں نہیں رہتے؟'' روشنی نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''بھائی یہ Exit ہونے میں ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے، خدانخواستہ ہمارے بدن کے ذرات ایک جگہ جمع نہ ہوئے تو۔۔۔؟''

''دادا جان! اِدھر سے اُدھر Exit ہونے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی بس ایک بار اس کے پروسیس سے گزرنا پڑتا ہے۔'' روشن اپنے دادا کو سمجھانے لگا، ''یہ ایک بٹن آپ کی کلائی میں لگا دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھیے۔۔۔'' اُس نے اپنی کلائی دادا کے سامنے کر دی، ''اس کے بعد ایک برقی غلاف آپ کے پورے بدن کے اطراف پھیل جاتا ہے، جو Exit کے دوران آپ کے بدن کے ذرات کو ادھر اُدھر ہونے نہیں دیتا۔ بس جب بھی آپ کسی مقام پر جانا چاہیں، اُس شہر کا نام اور کوڈ نمبر کے ساتھ ہی ساتھ پتہ بھی اس بٹن میں سیٹ کر دیں وہ آپ کو وہاں تک پہنچا دے گا۔''

دادا، پوتے کی ان باتوں کو سُن کر فرط جذبات سے بے قابو ہو گیا اور دیوانہ وار اُسے لپٹانے لگا۔ روشن کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی، ''کہیے اب تو آپ

چلیں گے نا ہمارے ساتھ اوپر کی دنیا میں؟''

''نہیں بیٹے ہم تو اسی دنیا میں بھلے۔تم لوگوں کی محبت میں اگر یہ رِسک لے بھی لیں تو ہمارا دل اسی زمین میں لگا رہے گا۔''

''دل۔۔۔؟'' روشنی نے حیرت سے دادا کی طرف دیکھا،'' داداجان یہ دل کیا ہوتا ہے؟''

''اری بے وقوف !تمھیں دل نہیں معلوم؟ '' روشن سمجھانے لگا،'' دل ہمارے بدن میں وہ عضو ہے جس کے چار چیمبر ہوتے ہیں ۔اوپر کے دو چیمبر Auricle (آری کل) اور نیچے کے دونوں چیمبرز Ventricle (وینٹری کل) کہلاتے ہیں۔'' پھر اُس نے اپنے دادا کی جانب دیکھا،'' داداجان دل کے پہلے چیمبر میں سارے بدن کا خون آتا ہے اور وہاں سے دل کے تیسرے چیمبر میں پھیپھڑوں کی مدد سے آکسیجن کو شامل کرتا ہے ۔پھر وہ خون دوسرے چیمبر میں آتا ہے جو اُسے چوتھے چیمبر میں بھیجتا ہے اور چوتھا چیمبر اُسے سارے بدن میں دوڑاتا ہے۔''

''بیٹے میں اُس دل کی بات نہیں کر رہا تھا جو ایک لوتھڑے کی مانند ہمارے جسم میں ہوتا ہے۔''

''پھر۔۔۔ اور دل کیا ہوتا ہے؟'' روشن بھی حیرت سے خضر میاں کی طرف دیکھنے لگا۔

خضر میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے، مالک ان بچوں کو کیسے سمجھاؤں کہ دل کیا ہوتا ہے۔ان بچوں کا جنم تو ماں کی کوکھ میں نہیں سائنسی آلات میں ہوا ہے۔یہ کیا جانے محبت کیا ہوتی ہے۔اُف زمانہ کتنا بدل گیا، ایک وقت وہ بھی تھا جب ہر عورت ماں بننے پر فخر کرتی تھی۔ پہلے دن سے نو ماہ تک جانے کیا کیا خواب دیکھتی تھی کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھاتی تھی۔تب کہیں جا کر اولاد کی

صورت نظر آتی تھی لیکن آج ۔۔۔آج تو مشین ہی کو ماں کی کوکھ بنا دیا گیا ہے۔اب کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ماں بننے کی لذّت سے لطف اُٹھا سکے۔

''داداجان کہاں کھو گئے آپ؟'' روشن نے اُنھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ہوں۔۔۔!'' وہ ایک دم چونک اُٹھے

''دادی اماں نے سالگرہ سلیبریٹ کرنے کو کہا ہے۔ہم اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر آئے ہیں۔بس ذرا لگیج کا بٹن دبا دیں تو۔۔''

''ارے ٹھہرو بچو! اس بار وہ سب رہنے دو۔آج ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ اس زمین پر بیسویں صدی میں سالگرہ کس طرح منائی جاتی تھی۔''

دونوں بہن بھائی حیرت سے داداجان کی طرف دیکھنے لگے۔

اور خضر میاں اُنھیں بتانے لگے،''بیٹا اُن دنوں جس کی بھی سالگرہ ہوتی اُسے سب سے پہلے صبح صبح گرم گرم پانی سے خوب نہلایا جاتا۔''

''پانی سے نہلایا جاتا تھا؟'' روشن نے دادا کی بات کاٹی،''وہ اسٹیم باتھ کیوں نہیں کرتا تھا داداجان؟ اُف کتنا زیادہ پانی ویسٹ ہوتا ہوگا؟''

''اُن دنوں زمین پر بہت پانی تھا بیٹے۔ ہر گاؤں اور شہر میں ندّیاں بہتی تھیں۔''

''پانی کی ندّیاں۔؟'' روشنی نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور خضر میاں سوچنے لگے، بیٹے تم کیا جانوں، سنتے ہیں کہ کبھی اس زمین پر تو دودھ کی ندّیاں بھی بہتی تھیں۔

''اور کیا کیا ہوتا تھا داداجان؟''

''ایک بڑا سا کیک لایا جاتا اُس پر عمر کے مطابق موم بتیاں لگائی جاتیں۔ سارا خاندان دوست احباب جمع ہوتے تھے۔تالیوں کی گونج اور سالگرہ مبارک کے شور میں، کیک کاٹا جاتا اور پھر سب پلیٹوں میں اُسے لے کر چمچے سے کھاتے۔''

دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

''پلیٹوں میں لے کر چمچے سے کھاتے تھے ؟ ''

''ہاں اس کے بعد دسترخوان لگتا اور سب مزے مزے کے کھانے کھاتے۔''

''تو آج آپ بھی اپنی سالگرہ اِسی طرح منائیں نا دادا جان۔۔۔!' روشن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''اب تو یہ سب کچھ ممکن نہیں ہے بیٹے۔''

'' کیوں۔۔۔؟''

خضر میاں نے ایک لمبی سانس لی،'' اس لیے کہ اُس زمانے میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔اناج پیدا ہوتا تھا اور اسی اناج سے قسم قسم کے پکوان پکائے جاتے تھے۔''

''دادا جان آپ کتنی حیرت انگیز باتیں ہمیں بتا رہے ہیں۔ یہ کھیتی باڑی کیا ہوتی تھی؟'' روشنی کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں

'' کھیتی ؟۔۔۔ بیٹے زمین کا ایک بڑا حصّہ ہوتا تھا۔اُس پر کسان ہل چلاتا، میرا مطلب پوری زمین کو ایک ڈیڑھ فٹ تک کھودتا تھا پھر زمین کو برابر کرتا۔آسمان سے برسات ہوتی۔کسان زمین میں بیج بوتا۔اُس سے پودے اُگتے۔پھر اُن میں بالیاں لگتیں۔وہ پکتیں۔پھر کسان اُنھیں ایک جگہ جمع کرتا اُن بالیوں سے اناج نکالتا، اُسے صاف کرتا اور بوروں میں بھر بھر کر بازار لے آتا۔لوگ اُنھیں خریدتے۔گھروں میں چولہے سُلگتے اُن پر مزے مزے کے کھانے پکتے اور پھر سب پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ ''

'' تب کتنا مزا آتا ہوگا۔۔۔ ہے نا دادا جان ؟''

'' میرے لال ہم نے بھی یہ سب کچھ بس کتابوں ہی میں پڑا ہے۔'' خضر میاں بتانے لگے،'' کہتے ہیں کہ اُس وقت آدمی اس طرح فلیٹوں میں مقید نہیں ہوتا تھا ۔

ہر فرقہ اپنا ایک مذہب بھی رکھتا تھا اور ہر مذہب نے اپنے ماننے والوں کو خوشیوں کے نام پر کچھ تہوار بھی بخشے تھے۔ جب بھی یہ تہوار آتے پورے ملک میں چھٹی منائی جاتی۔ لوگ ایک دوسرے کے گھر جاتے ایک دوسرے کو تہوار کی مبارک باد پیش کرتے اور ساتھ مل بیٹھ کر کھانے کھاتے۔ خوشیاں مناتے تھے۔''

''دادا جان یہ مذہب کیا چیز تھا؟''

'' آہ۔۔۔ مذہب ایک مکمل ضابطہ حیات۔۔۔۔۔''

''تو کیا ہماری حیات اب کسی ضابطے کی پابند نہیں ہے؟''

دادا جان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے۔ اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ گویا وہ اُن ضابطوں کو ڈھونڈھ رہے تھے لیکن کوئی سرا اُن کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ ہر سمت اُنھیں نفسا نفسی ہی نظر آ رہی تھی۔ دنیا پورے نظامِ شمسی میں پھیل چکی تھی۔ اب نہ کسی کے پیدا ہونے کی خوشی تھی نہ مرنے کا غم تھا بس تعلقات ایک دوسرے تک پیغاموں میں محصور ہو گئے تھے۔ اُنھیں یاد آیا، اُن کی بیوی نے بھی پلوٹو جانے کی اجازت نہیں بلکہ اطلاع دی تھی اور جب اُنھوں نے کہا تھا کہ تم چلی جاؤ گی تو ہمارے جنسی تعلقات کا کیا ہوگا؟ ہماری باہم رفاقتوں اور محبتوں کا خاتمہ نہیں ہو جائے گا؟ تو اُس نے جواب دیا تھا، کیا یہ آپ کے لیے اور میرے لیے کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟ لطف تو کہیں بھی کسی سے بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سائنسی اور تکنالوجی کے دور میں دائمی رفاقتیں اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔ رہی بات محبتوں کی تو ہم دونوں اِسے یہاں وہاں بیٹھ کر بھی نبھا سکتے ہیں۔ البتہ ضروریات اہم ہیں اور وہ اپنے راستے کسی نہ کسی طرح بنا ہی لیتے ہیں۔۔۔ شاید اسی لیے اس کے بعد وہ آج تک لوٹ کر نہیں آئی، لیکن سوچو تو کونسا کام رُکا ہے؛ کوئی بھی تو نہیں۔ اُس کی محبت اُسی طرح قائم ہے اور اُس کے محبت بھرے پیغامات آتے رہتے ہیں۔ لڑکے نے بھی مریخ جانے کی اطلاع پہلے سے نہیں

وہاں پہنچ کر ہی دیا تھا۔ بیٹی نے اپنے لیے کوئی ساتھی منتخب کر لیا تھا خدا جانے وہ کس سیارے پر زندگی گزار رہی ہے۔ کوئی غیبی طاقت پورے عالم پر حکومت کر رہی ہے۔ ورنہ کوئی قانون ہے نہ کوئی گرفت، اچھائی اور بُرائی کی تمیز مٹ چکی ہے۔ جرم اور سزا کا تصور عنقا ہو چکا ہے۔ رشتوں سے نمک اور خلوص سے مٹھاس غائب ہو چکی ہے۔ شاید میں بھی اب وہ نہیں رہا، مجھ میں بھی کہیں ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے اور کیا پتہ۔۔۔۔

'' دادا جان۔۔۔!'' آواز پر اُنھوں نے آنکھیں کھولیں۔ دونوں کی طرف غور سے دیکھا اور پھر اُن کی زبان سے نکلا، ''بیٹا اب کوئی مشترکہ ضابطہ حیات نہیں ہے آج ہر شخص کے نزدیک اُس کا اپنا ضابطہ حیات ہے۔''

روشن کے دماغ میں اچانک اُس کا اپنا گھر آ گیا، پاپا مریخ میں، ممّی ذحل میں، ہم دونوں بہن بھائی دن بھر چاند پر، کیا ربط ہے ہماری زندگیوں میں۔ سوائے اس کے کہ ایک چھت کے نیچے آباد ہیں۔ پاپا کا اپنا فرینڈ سرکل ہے، ممّی کے اپنے دوست ہیں، دونوں اپنے اپنے فرینڈ سرکل کے ساتھ دو دو چار چار دن گھر سے باہر رہتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے دونوں کے اپنے اپنے انداز ہیں۔ کیا کل ہماری اپنی زندگی بھی اسی محور پر گردش کرے گی؟ اُس کی گردن جھک گئی اور وہ پتہ نہیں خلاء کے کن حصّوں کی طرف نکل گیا تھا۔ ماحول پر سکوت چھا گیا، شاید وہاں پر موجود ہر ذی نفس اپنی سوچوں میں کہیں گُم ہو گیا تھا۔

ٹھیک اُسی وقت مانیٹر نے دو بجنے کا اعلان کیا اور خضر میاں کو جیسے ایک دم یاد آ گیا اور اُنھوں نے بچوں سے کہا، '' بچوں تم جب سے آئے ہو کچھ نہیں لیا، جاؤ۔۔۔ دوسرے کمرے میں کولڈ ریج رکھا ہوا ہے۔ اُس میں مختلف کھانوں کے Tablets رکھے ہوئے ہیں۔ تمھیں جو بھی پسند ہو، لے لو اور کھا لو۔''

'' دادا جان آج ہم نے بھی طے کیا ہے کہ بھوک مٹانے کی خاطر ہم کوئی

Tablet نہیں کھائیں گے۔'' دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

'' پھر۔۔۔؟'' خضر میاں نے حیرت کے ساتھ دونوں کی طرف دیکھا۔

''آج آپ ہمیں بیسویں صدی کا کوئی کھانا پکا کر کھلائیں۔''

خضر میاں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی،'' میرے بچوں یہ تو اب بہت مشکل ہے۔'' اُنھوں نے ۵۷۷۱ منزلہ عمارت سے نیچے کی طرف دیکھا،'' ماضی بہت خوشگوار ہوتا ہے لیکن اُسے دوبارہ واپس نہیں لایا جاسکتا۔ یہاں تمہاری سائنس اور تکنالوجی بھی فیل ہو جاتی ہے۔''

دونوں بھائی بہن اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے ۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں روشن ہونے لگیں اور روشنی نے کہنا شروع کیا،'' داداجان ہم ماضی کو واپس نہیں لا سکتے لیکن اُس کے تصور میں تو جی سکتے ہیں۔''

خضر میاں حیرت سے بچوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''داداجان آپ ہمیں آپ کا اسٹور روم دکھایئے تو سہی۔''

خضر میاں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بچوں کے ساتھ اپنے اسٹور روم میں پہنچے اور مختلف ڈبوں اور برتنوں کو کھنگالنے لگے۔ ایک کے بعد ایک ڈبہ کھلتا جا رہا تھا اور برسوں پرانی اشیا ماضی کے کواڑ کھول رہی تھی۔ آخر وہ کسی طرح کچھ مُٹھی چاول، مسور کی دال اور کچھ کھانا پکانے کے مسالوں کو ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو گئے۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں کھچڑی پک گئی اور اُس کی سوندھی سوندھی خوشبو مہکنے لگی۔ خضر میاں نے فرش پر دسترخوان بچھایا، پلیٹوں میں کھچڑی نکالی اور تینوں اُسے کھانے لگے۔ کھچڑی کا مزہ اُن کے چہروں سے عیاں ہو رہا تھا۔ کھاتے کھاتے روشن نے دادا سے پوچھا،'' داداجان کیا ہم دوبارہ سے اس طرح کھانے پکا کر نہیں کھا سکتے؟''

خضر میاں نے محبت بھری نظروں سے اپنے پوتے کی طرف دیکھا،'' بیٹے کھا

تو سکتے ہیں لیکن اب کھتی باڑی کون کرے گا؟''

''تو کیا اب کھیتی باڑی نہیں ہوسکتی؟''

''ہو بھی سکتی ہے لیکن یہ پہاڑ کون اپنے سر لے گا؟''

روشن نے دادا کی طرف دیکھا اور پھر پورے اعتماد کے ساتھ کہا،''دادا جان یہ کام میں کروں گا۔''

خضر میاں نے محبت بھری نظروں سے روشن کی طرف دیکھا، عظیم ترین ترقی یافتہ دور کا آدمِ ثانی اُن کی نظروں کے سامنے تھا اور اُس کے پُر اعتماد لہجے میں اُنھیں ترقی کی ہزاروں منزلیں آسان سی محسوس ہونے لگیں اور وہ اُسے سمجھانے لگے،

''میرے لال آج دنیا ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ساری کائنات میں پھیل گئی ہے۔تمہاری منزل کا راستہ مراجعت میں نہیں بلکہ اُس کہکشاں میں ہے جس کے راستے تمھیں خود ہی تلاش کرنا ہے۔''

روشنی نے آسمان کی طرف دیکھا تو خضر میاں کو ایک دم خیال آیا کہ بچوں کو واپس بھی جانا ہے۔اُنھوں نے فوراً کہا،''بیٹے اب واپسی کا قصد کرو، تمہارے ماں باپ پریشان ہورہے ہونگے؟''

''دادا جان یہ پریشانی کیا ہوتی ہے؟

''بیٹے یہ بھی میرے دل کی طرح کوئی چیز ہے جسے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔''

دونوں بہن بھائی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کلائی پر لگے ہوئے بٹنوں کو سیٹ کرنے لگے، اور پھر پل بھر میں اُن کا وجود بے شمار چنگاریوں میں تبدیل ہوگیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔

۵۷۷۱ منزلہ عمارت کے فلیٹ کی کھڑکی سے لگے خضر میاں آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

●●●

☆.....ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

آدھے ادھورے

پنواڑی کی دوکان پر فرمائشی فلمی گانوں کے پروگرام کے دوران صبح سے چوتھی دفعہ ریڈیو پر یہ اعلان ہوا تھا کہ لوگ کل ہونے والے سورج گرہن کو ننگی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔اس سے آنکھوں کی روشنی چلے جانے کا خطرہ ہے،اور صبح سے چوتھی بار ہی اس نے اپنے اس ارادے کی تجدید کی تھی کہ وہ سورج گرہن کو ضرور دیکھے گا۔اندھا ہوجائے گا تو کون سی آفت ہوجائے گی! کم سے کم اس مستقل عذاب سے تو نجات مل جائے گی جو وہ پچھلے پندرہ برسوں سے جھیلتا آرہا تھا۔اس نے بارہا دیکھا تھا کہ لوگ اندھوں کے ساتھ کتنی ہمدردی کرتے ہیں اور ترس کھا کر فوراً ان کی مدد کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔سرکار نے بھی اندھوں کو اسپیشل سہولتیں دے رکھی ہیں۔خود اس کے ابا آنکھوں سے محروم تھے اور سارا محلّہ انہیں حافظ جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا حالانکہ انھوں نے کبھی قرآن پڑھا تک نہیں۔سب ان کی عزت کرتے تھے۔اس نے کبھی کسی کو ان پر ہنستے یا ان کا مذاق اڑاتے نہیں دیکھا تھا۔ان کے مقابلے میں وہ خود رحیم الدین، جس پر کسی نے رحم نہیں کیا، جو پندرہ سال سے لوگوں کی ہنسی،حقارت آمیز برتاؤ،مضحکہ خیز جملوں اور دل کو چھلنی کردینے والے طعنوں کا نشانہ بنتا آرہا تھا۔

اسے یاد نہیں یہ سب کب اور کیسے ہوا۔البتہ اس کی اماں بتاتی تھی کہ جب وہ سال بھر کا تھا تو شہر میں چیچک (چکن پاکس) کی وبا پھیلی تھی۔اور بہن بھائیوں کے تو جسم پر تھوڑے بہت دانے نکل کر رہ گئے تھے،لیکن اس کے چہرے پر بھی کئی دانے تھے

اور ایک دانہ تو آنکھ میں بھی نکل آیا تھا۔ حالت اتنی خراب تھی کہ بچنے کی بھی امید نہیں رہی تھی۔ اماں نے برچھی بابا کے مزار پر جا کر منت کا دھاگا باندھا، تب کہیں جا کر زندہ بچ سکا لیکن ایک آنکھ ضائع ہونے سے کوئی نہیں بچا سکا۔ اس نے دل ہی دل اماں کو بھی بھلا برا کہہ سنایا تھا۔ بھلا برچھی بابا کی منت چڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک آنکھ کا ہو کر زندہ رہنے سے تو مر جانا بہتر تھا۔ لیکن مائیں یہ سب نہیں سوچتیں۔ وہ تو اولاد کو اندھا، کانا، لولا، لنگڑا، ہر حال میں زندہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن وہ نفرت و حقارت کے کھولتے سمندروں سے گزرتا چلا آ رہا تھا۔ جب چھوٹا تھا تب ہی سے محلے والے اس بات کا خاص اہتمام رکھتے تھے کہ صبح صبح اس کی صورت نظر نہ آ جائے۔ اماں بھی اس کے باہر جانے پر پابندی رکھتی تھی لیکن کب تک ایک کمرے کے مکان میں قید کر کے رکھ سکتی تھی۔ جیوں جیوں بڑا ہوتا گیا، وہ پابندیوں کی دیوار ڈھاتا گیا۔ نادان، ناسمجھ بچہ ان مصلحتوں کو کیا جان سکتا تھا۔ پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ محلے میں کسی کا کسی سے جھگڑا ہوتا، ساس بہو سے جھگڑتی، بیوی شوہر کے ہاتھوں پٹتی، بھائی بھائی کا منہ کھسوٹتا، پڑوسی پڑوسی سے لڑتا، کسی کا بچہ سیڑھیوں سے گر جاتا، کوئی بیمار ہو جاتا، کوئی موت ہو جاتی، لیکن بعد میں سب آئی گئی اسی کے سر آتی۔

''صبح صبح اس سالے کانٹرے کا منہ دیکھ لیا تھا۔ مر بھی تو نہیں چکتا حرامی''۔

پڑوسن آ کر اماں کو تنبیہ کرتی ''کہے دیتی ہوں اللہ رکھی، اپنے اس جنم جلے بیٹے کو باندھ کر بٹھایا کر۔ سبیرے سبیرے اس کلموہے کا منہ دیکھ لو تو سارا دن لڑتے جھگڑتے گزرے ہے۔ کوئی کام کل کا نہیں ہوتا۔''

شروع شروع میں تو اماں ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہو جاتی تھی، لیکن دھیرے دھیرے وہ بھی لڑ جھگڑ کر تھک گئی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ اس طرح سارے پڑوسیوں سے دشمنی مول لے کر تو محلے میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ پھر تو وہ ایک ایک کی خوشامد ہی کیا کرتی۔

''کیا کروں بہن! موئے کو باندھ کر بھی تو نہیں ڈال سکتی۔ بچہ ہی تو ہے۔ بہتیرا منع کروں ہوں، ماروں ہوں پر نکل ہی جاوے ہے مٹا۔''

پھر اماں نے یہ کرنا شروع کیا کہ صبح کھلا پلا کر ایک روپیہ کا سکہ ہاتھ میں تھما کر گلی کے نکڑ والے بازار میں چھوڑ آتی۔ اس سے محلے میں تو امن رہنے لگا، لیکن دوکانداروں نے طمانچے مار مار کر اس کے چیچک زدہ گالوں کو اور داغدار کر دیا۔ پیسے لے کر وہ جس دکان پر جاتا، دوکاندار مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا۔

''بونی کے ٹائم پر آ جاتا ہے بے۔ سالے دن میں دھندا مندا ہوا تو دوسری بھی پھوڑ دوں گا۔''

روتا ہوا گھر پہنچتا جہاں کوئی نہ کوئی اپنی نوکری یا پھیری پر جانے کو تیار ہوتا اور اس کے سامنے پڑنے کو بدشگونی سمجھ کر گالیوں کے ساتھ دو چار دھمو کے جڑ دیتا۔ اس کے بڑے اور چھوٹے بہن بھائی آرام سے کھیلتے پھرتے، شرارتیں کرتے، انہیں کوئی کچھ نہ کہتا۔ چڑ کر وہ ان کو مارتا اور ان کی بھی ایک آنکھ پھوٹنے کی چپکے چپکے دعا کرتا۔ تنگ آ کر اماں نے بڑے بھائی کے ساتھ اس کا نام بھی مسجد کے مدرسے میں لکھوا دیا۔ پڑھائی میں وہ دوسرے بچوں سے تیز نکلا۔ سب سے پہلے گنتی یاد کر لی۔ حروف تہجی پہچاننے اور لکھنے لگا۔ لیکن وہاں بھی بدقسمتی نے ساتھ نہیں چھوڑا۔ ساتھ کے شریر اور کند ذہن بچے اس کی ذہانت اور مولوی صاحب کی تعریف سن کر جل جاتے اور اسے ''کانڑا کانڑا'' کہہ کر چڑاتے۔ وہ پتھر لے کر مارنے دوڑتا۔ ایک دن کسی بچے کے سر پر پتھر لگ گیا۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ بچے کے ماں باپ شکایت لے کر آئے تو مولوی صاحب نے رحیم الدین کو مدرسے سے نکال دیا۔ اسی طرح گالیاں اور طمانچے کھاتے اور چھوٹا موٹا کام کرتے وہ پندرہ سال کا شریر، ضدی، لیکن حساس لڑکا بن گیا، لیکن ماحول جو بچپن سے چلا آ رہا تھا، اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اسی دوران داروغہ جی کا بیٹا جو دہلی میں بڑا افسر تھا، اس کی شادی ہوئی۔ اپنی بیوی کو لے کر جانے لگا تو اسے ایک نوکر چھوکرے کی ضرورت پیش آئی۔ رحیم الدین کی اماں ان کے ہاں جھاڑو برتن کرنے جاتی تھی۔ داروغہ جی کے اس کے اندھے باپ پر بہت احسان تھے۔ یوں بھی اماں روز روز کی بک بک جھک جھک سے تنگ آچکی تھی۔ اس طرح وہ دہلی آ گیا۔ یہاں تو دنیا ہی یک لخت بدلی ہوئی تھی۔ سرکاری افسروں کی کالونی میں رہنے والے بڑے آدمیوں کے بچوں کو ان کے والدین آئے دن کی وارداتوں سے ڈر کر کوٹھی سے باہر ہی نہیں نکلنے دیتے تھے۔ سر شام وہ اپنے لان میں بھائی بہن یا کتوں کے ساتھ کھیلتے اور اندھیرا ہوتے ہی گھروں میں گھس جاتے۔ اگر کوئی بچہ اپنی بال لینے اس کی طرف جانے کا ارادہ بھی کرتا تو اس کی مما انگریزی میں ڈانٹ کر واپس بلا لیتی اور آیا آ کر گیند لے جاتی۔

یہاں آ کر رحیم الدین کو لگا جیسے تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر سکون کی ٹھنڈی چھاؤں میں آ گیا ہو۔ یہاں اس کی اکیلی دوست سونی تھی جو پیچھے کواٹر میں رہنے والے چپراسی کی بارہ سالہ بیٹی تھی، جو مخمل کی طرح ملائم اور پھولوں کی طرح کھلی کھلی سی تھی اور جس نے اس کے کانے پن کا کبھی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اب وہ اتنا بچہ بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے جذبات سے یکسر نا آشنا ہوتا۔ نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ رہ کر اور پابندی سے ٹی وی پر فلمیں دیکھ کر کچھ زیادہ ہی سمجھنے اور محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب کوئی کسی کو اچھا لگنے لگتا ہے تو اسے کیا نام دیا جاتا ہے۔ اس نے اردو کی پہلی کتاب سے جوڑ جوڑ کر سب سے پہلے جو لفظ لکھنا سیکھا وہ ''سونی'' تھا۔

وہ جاتی سردی آتی گرمی کی ایک خنک سی سہ پہر تھی۔ بہت تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سورج اپنے سفر کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ وہ کسی کام سے بالکونی میں گیا تو اس نے دیکھا صاحب میم صاحب کے کندھے پر سر ٹکائے

بیٹھے تھے۔ میم صاحب کے ترشے ہوئے بے حد سیاہ بال ہوا سے اڑتے اور صاحب کے چہرے پر بکھر جاتے۔ میم صاحب بال ہٹاتیں تو صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیتے۔ وہ کونے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ کان کی لوئن گرم ہوگئیں۔ اتنے میں صاحب کی نظر اس پر پڑی تو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ ایک عجیب سی بے نام کسک لیے وہ باہر آیا۔ احاطے کی دیوار پر سونی بیٹھی تھی۔ شاید نہا کر اٹھی تھی اور بال سکھا رہی تھی۔ اس کے بے حساب لمبے سنہرے بال ہوا میں بکھرے ہوئے تھے۔ جب تیز جھونکا آتا تو اس کے بال ایسے اڑتے کہ اس کے گرد ہالہ سا بن جاتا۔ ڈوبتے سورج کی سرخ کرنوں میں سونی کا چہرہ واقعی سونے سے بنا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''سونی تم تو پوری سونے کی بنی ہو۔''

اور سونی زور سے ہنس دی۔ ''ہٹ پاگل! میں سونے کی کہاں سے آئی۔ میں تو گوشت پوست کی بنی ہوں۔ یہ دیکھ۔'' اس نے اپنی کلائی کو انگلی سے دبایا تو ایک سرخ گڈھا پڑ کر فوراً مٹ گیا اور اسے چھونے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اتنے میں سونی کے بال پھر ہوا کے تیز جھونکے سے اڑے۔ اس کا دل چاہا سونی کے کندھے پر سر رکھ دے اور وہ ملائم لمبے سنہری بال اس کے چہرے پر بکھر جائیں۔ یہ خواہش اتنی شدت سے ابھری کہ اگر دل کی شدید خواہشات مجسم ہوسکتیں اور سونی اسے دیکھ پاتی تو وہ بارہ سال کی چھوٹی سی لڑکی شاید موم کی طرح پگھل جاتی، لیکن چونے، گارے اور پتھروں کی اس دنیا میں ایسے نازک جذبات کے لیے کوئی جسم نہیں بنایا جاسکا ہے۔ ایک اور خواہش نے دم توڑ دیا۔ اچانک ہی ہمت کر کے اس نے پوچھ لیا۔

''سونی مجھ سے شادی کروگی'' جیسے کائنات کی نبض رک گئی ہو۔

''شادی تم سے!'' اس نے حیرت اور معصومیت سے سر اٹھا کر پوچھا۔

''نہیں رے۔ میں تم سے شادی کیسے کرسکتی ہوں۔ تم تو کانے ہو۔''

☆.....ڈاکٹر صادقہ نواب سحر

تحفوں کی تھیلی

نیشنل ہائی وے ۴۸ مہاراشٹر کی بھاری بھرکم ٹریفک سے باہر نکل کر جیسے ہی کرناٹک کی سرحد میں داخل ہوئے، بارش کے موٹے موٹے چھم چھم چھینٹوں نے ہمارا سواگت کیا۔ نپّانی کے ایک بڑے احاطے والے ریستراں کی پارکنگ کی چھت کے نیچے گاڑی رکا لی گئی۔ دیکھا، تیز ہواؤں نے کیریئر پر رکھے ہوئے سامان کو ڈھانکنے والی تاڑ پتری کو دو جگہوں سے پھاڑ دیا تھا۔ اتر کر دیکھا تاڑ پتری اوپری حصے میں بھی پھٹ چکی تھی۔ اسے کھول کر اِنووا کار کی پچھلی سیٹ فولڈ کر کے سامان اندر رکھ لیا۔ دوبارہ اسے بہتر طریقے سے باندھ کر چائے پینے لگے تھے کہ گھر سے فون آ گیا۔

''تمہاری بھابی کو چکر آ رہے تھے۔ قے بھی ہو رہی تھی۔ اِس وقت آئی سی یو میں ہیں۔ اینجیوگرافی کروانے کے لیے کہا گیا ہے۔'' بھائی بتا رہے تھے۔

''کیا پریشانی ہے بھائی جان! کاش صبح گیارہ بجے تک پتہ چل گیا ہوتا تو شاید ہم بنگلور کے لیے نکلتے ہی نہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی تو ضروری ہے۔ تم لوگ بنگلور چلے جاؤ۔'' بھائی نے کہا۔

''بھائی جان، ہم کل نکاح میں شریک ہوئے ہی تھے۔ کاش ہم اتنی دور نکل نہ آتے۔''

''اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ تم لوگ چلے جاؤ۔ بس دعا کرو۔ میں خود شہر میں نہیں

ہوں۔''

''ہم ممبئی سے بہت دور آ گئے ہیں۔ دعا ہی کر سکتے ہیں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہوگا۔ اپ ڈیٹ لیتی رہوں گی۔''

.....

ہوا یوں تھا کہ جب ایک گھنٹے تک زوردار چکر آتے رہے اور تین چار بار کی قے نے رات کے کھانے سے پیٹ کو خالی کر دیا تو بیٹا بھابی کو لے کر سیدھے علاقے کے بڑے اسپتال کے کیجوالٹی پہنچ گیا۔

''گھنٹہ بھر پہلے پریشانی تھی۔''، رہائشی ڈاکٹر بلڈ پریشر چیک کرنے لگا تو بھابی نے ڈاکٹر کو بتایا، ''اب مجھے بالکل چکر نہیں آ رہے ہیں۔ اب ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' پھر ڈاکٹر نے پاس کھڑے بیٹے سے کہا، ''سب او کے ہے۔ آبزرویشن کے لیے ایک رات وارڈ میں رکھ لیتے ہیں۔''

بیٹے نے کاؤنٹر پر چیک کیا۔ روم خالی نہیں تھے لیکن عورتوں کے جنرل وارڈ میں جگہ تھی۔ اس نے پیپر بنوا لیے۔ ایڈوانس رقم بھر دی۔ لوٹ کر ڈاکٹر سے ملا۔

''ہم نے سینئر ڈاکٹر کو بلا لیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ لڑکے کو سینئر ڈاکٹر کے کیبن میں لے گیا۔

''پیشینٹ کے ہسبینڈ کہاں ہیں؟''

''ڈیڈی ٹور پر ہیں۔ کل آ جائیں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟''

''ای سی جی میں نیچے کا پی. ایچ. نارمل نہیں ہے۔ کل ٹو ڈی ایکو کروائیں گے۔ بارڈر لائن ہائر کیوں ہے، جانچ کریں گے۔ میں نے مریض کی رپورٹ دیکھی۔ ہارٹ اینزائم نارمل سے تھوڑا زیادہ ہے۔ ہم انہیں آئی سی یو میں رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔''

''جیسے آپ کہیں۔'' بیٹے نے دھیمی آواز میں کہا۔

''آپ آئی سی یو کی فائل بنوا لیجئے۔''

رات میں دوبارہ ای سی جی کروایا گیا۔ اب بھی پی .ایچ. ہلکا سا بڑھا ہوا تھا۔ اگلی صبح ساڑھے گیارہ بجے بھابی کو ٹو ڈی ایکو کے لیے لے جایا گیا۔ شام کو سینئر ڈاکٹر وِزٹ کے لیے آئی سی .یو. میں آیا اور لڑکے کو اپنے کیبن میں لے جا کر بولا۔

''چکر کا جو ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اچانک گردن گھمانے سے بھی ہوسکتا ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ اِن دنوں میں بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ مجھے تو ہارٹ کا پرابلم دکھائی نہیں دیتا۔''

لڑکے نے سکون کی سانس لی۔ مسکرا دیا۔

''مگر کیا ہے کہ ٹو ڈی ایکو میں ہارٹ کا ایک حصہ اسٹرین میں موو کرتا ہے۔ دراصل ٹو ڈی ایکو میں پورا پکچر کلئیر نہیں ہوتا۔ ضرورت پڑی تو اینجیو گرافی کر لیں گے۔ اوکے!''

اگلے دن جس وقت بھائی دورے سے لوٹے، اینجیو گرافی سیکشن کے باہر خاندان کے کئی افراد بیٹھے نتیجے کے منتظر تھے۔

''ہارٹ تو بالکل کلئیر آیا ہے۔ نو بلاکس۔'' سینئر ڈاکٹر کی کیبن میں بیٹھے ہوئے باپ بیٹے نے سکون کی سانس لی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

''لیکن.....شاید ایک اور ٹیسٹ کروانا ہوگا۔''

''اب ڈسچارج دے دیجئے ڈاکٹر۔ بھائی نے نرمی سے کہا۔

''ہاں ہاں، اِس وقت آپ ڈسچارج لے لیجئے۔ انشیورینس کے پیپرس داخل کروا لیجئے۔ اگلے ہفتے مجھے ملئے۔ ویسے میں چاہتا تھا ایک دن اور آبزرو کر لیتے! کہئے کیا کہتے ہیں؟''

.....

وہ بنگلور کی ہماری پہلی صبح تھی۔ بنگلور کے مضافات میں کورا منگل کی نیشنل گیمس وِلیج کے 'بلڈرس کلب پارٹی ہال' میں ولیمہ تھا۔ ہم اُسی عمارت کی پہلی منزل پر بنے کشادہ کمروں میں ٹھہرائے گئے تھے۔ صبح صبح بچے کلب کے گارڈن میں کھیلنے چلے گئے۔ دوپہر تک ان کے خوب مزے رہے۔ ہمیں بھی کچھ سکون میسر آیا۔ دوپہر میں بھائی سے فون پر بات ہوئی۔ حالانکہ ابھی کئی ٹیسٹ کئے جانے تھے پھر بھی ایجیوگرافی کا نارمل نتیجہ آنے کی خبر ملی تو ہم سب نے سکون کی سانس لی۔ اور ہم سب کچھ بھول بھال کر شادی کی تقریبوں کے مزے لینے لگے۔

''امی یہ جھمکے بہت بھاری ہیں۔'' شام کو ولیمہ کی تیاری ہو رہی تھی۔

''تھوڑی دیر بعد جھمکے ہاتھ میں پکڑا مت دینا۔ ہال میں کہاں لیے لیے پھروں گی! نہ چاہو تو یہیں چھوڑ دو۔ وہی چھوٹے بوندے پہن لو، جو پہنے ہوئے تھیں۔'' میں بیٹی کی عادت سے واقف تھی۔

''زیور کے بغیر شادی میں شرکت ہوسکتی ہے۔''، میں مسکائی، ''بس تیار ہو جاؤ بیٹا۔'' تبھی فون کی گھنٹی بجی۔

''میں ملیحہ ہوں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ آنے کی پوری کوشش کر رہی ہوں۔ آپ اکادمی کی نیشنل کمیٹی میں ہیں۔ زبانوں کا تو یہ حال ہے کہ اپنے پیسوں سے کتابیں چھپواؤ، تحفے میں دو۔ پھر بھی لوگ پڑھتے نہیں۔... میری شاعری کی کتاب ہے، 'سُر خاب'۔ نیشنل اکادمی میں بھجوا دی ہے۔ اگر چھپائی کے لیے مالی تعاون مل جائے تو بڑی آسانی ہوگی۔''

پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں بھی اکادمی کی نیشنل کمیٹی کی ممبر ہوں۔

ولیمے کی تقریب سیدھی سادی لیکن کافی باوقار تھی۔ شان و شوکت تازہ پھولوں اور ہلکی بتّیوں سے تھی۔ شادی میں کچھ علمی ادبی شخصیتوں سے بھی ملاقاتیں

رہیں۔ہم انھیں کے درمیان ایک گول میز پر بیٹھے ادب اور سیاست پر ہلکی پھلکی گفتگو میں مشغول تھے کہ ایک لڑکی میرے قریب آئی اور بولی،''میں ملیحہ کی بیٹی ہوں۔میری چھوٹی بہن کی ڈیلیوری ہوئی ہے۔امی نہیں آ پائیں۔وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' مجھ سے بات کرتے کرتے اس نے فوراً ماں کوفون ملالیا اور مجھ سے بات کروادی۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔لیکن یہاں ذرا پرابلم تھی۔کل آپ کتنے بجے تک ہیں؟ کہاں ٹھہرے ہیں۔میں ملنے آجاؤں گی۔''

''یہیں شادی ہال کے اوپر کے منزلے میں۔لیکن ہمیں صبح ناشتے کے بعد نکلنا ہے۔ناشتے کا وقت ساڑھے آٹھ بجے کا ہے۔مشکل ہے۔''

''میں آٹھ بجے آجاؤں گی۔''

''آپ فون کرکے آیئے گا۔''

شادی کے ہنگاموں کے درمیان کسی نے مجھے آواز دی اور میں نے خدا حافظ کہہ کر ملیحہ کی بیٹی کوفون لوٹا دیا۔

.....

رات کافی دیر تک کمرے میں بچے ہنگامہ کرتے رہے۔ہمارے تابع میں دو کمرے تھے۔کبھی وہ اِس کمرے میں گھنٹی بجا کر آجاتے،کبھی اُس کمرے میں چلے جاتے۔دیر سے سوئے۔صبح الارم سے اٹھ کر نماز ادا کرکے دوبارہ لیٹی کہ آنکھ لگ گئی۔ صبح آٹھ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ملیحہ ہوں۔ساری! شاید آپ سو رہی تھیں، جگا دیا۔'' خاتون نے کہا۔

''نہیں ٹھیک ہے ملیحہ صاحبہ! لیکن ساڑھے آٹھ بجے ناشتے کے بعد ہمیں روم چھوڑنا ہوگا۔''

''نہیں نہیں۔آپ یہاں شام چار بجے تک رہ سکتی ہیں۔''

''آپ کو کیسے پتہ!''

''میں نیچے ریسیپشن میں بیٹھی ہوں۔''

''اچھا! تو آپ آ چکی ہیں!!''

''جی''میں حیرت میں تھی۔کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے۔

''آپ مجھے پانچ منٹ کا وقت دیجئے، میں نیچے رِسپشن میں آتی ہوں۔''

میں نے بادلِ ناخواستہ کہا اور بستر سے نکل گئی۔

دس منٹ بعد جب میں کپڑے تبدیل کر کے نیچے رسپشن میں اتری، میرے سامنے ایک فربہ مائل جسم، معمولی نین نقش والی، کم قد کی خاتون کھڑی تھیں۔نیوی بلیو کرتے اور سفید شلوار دوپٹے میں اسے دیکھ کر ایک خیال ذہن سے گزر گیا، 'نوجوانی میں ضرور پرکشش رہی ہوگی۔اب بھی باوقار ہے۔'وہ بڑے تپاک سے مجھ سے ملیں۔صوفے پر بیٹھتے ہی مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ، مٹھائی کا ایک چھوٹا سا ڈبہ اور ایک ساڑی تحفتاً پیش کر دی۔

''آپ کو بھی جلدی ہے۔میں چلتی ہوں۔''اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تبھی ویٹر ناشتے کی پلیٹیں لے کر کینٹین سے نکلے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

''لیجئے، ابھی آٹھ بج کر بیس منٹ ہی ہوئے ہیں، ناشتہ شروع بھی ہو گیا۔''

میں نے کہا،''آپ ناشتہ کریں گی؟''

''مجھے خوشی ہوگی اگر آپ میرے گھر آئیں۔''ملیحہ نے کہا،''چار بجے تک تو وقت ہے آپ کے پاس!''

''نہیں نہیں! سترہ سے رمضان شروع ہوگا۔آج تیرہ ہے۔بس آج اور کل

دو ہی دن تو ہیں ہمارے پاس۔ پندرہ کو تو گھر کے لیے نکلنا ہی ہوگا۔میسور سے ممبئی اٹھارہ گھنٹوں کا سفر ہے۔ بچوں کو کم سے کم میسور دکھایا جائے۔ورنہ ہنگامہ کریں گے۔ہم کسی رشتہ دار کے گھر بھی نہیں جائیں گے۔''

میں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

''کچھ دیر بیٹھئے۔''میں نے ملیحہ سے کہا۔ تحفے قبول کرنے کے بعد فوراً خدا حافظ کہنا مجھے ٹھیک نہیں لگا۔اس نے تحفے کی مٹھائی، کتابیں اور ساڑی ایک خوبصورت سی کیری بیگ میں ڈال کر بیگ کو تپائی پر پڑے کنڑا اخبار پر رکھ دیا۔

''آپ کا ناشتہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔''ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔

''میں ڈگری کالج میں پرنسپل کے عہدے سے تین سال ہوئے ریٹائر ہوئی ہوں۔دو بیٹیاں ہیں۔دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔بیٹا ائیر فورس میں ہے۔''

''اور آپ کے شوہر؟''

''وہ جنرل میڈیسن میں ایم ڈی فزیشین ہیں۔تیس سال گورنمینٹ سروس میں کام کرتے ہوئے سول سرجن کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔کولار گولڈ فیلڈ میں تھے۔''

''اچھا!''

''ڈاکٹر صاحب کو ریٹائر ہو کر گھر بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ڈیوٹی پر تھے تو ہر تین سال پر کرناٹک کے مختلف علاقوں میں تبادلے ہوتے رہتے تھے۔اب یہیں بنگلور میں ایک بڑے نامی اسپتال 'سووی نیئر' میں سروس مل گئی۔''

''اچھی بات ہے نا! زندگی بھر جدوجہد رہی ہوگی!''

''ہاں، بہت۔ وہ ہفتے میں ایک بار گھر آتے تھے اور میں چھٹیوں میں ان

کے علاقے میں جاتی اور وہ گھر بھی سنبھالتی۔''

''اور اب ساتھ ساتھ...!...سکون؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں ساتھ رہنے کے الگ مسائل!'' وہ بھی مسکرادی۔

''اچھا!! وہ کیا!!''

''جی....پھر کبھی بتاؤں گی۔''، وہ مسکرائی اور بات گول کر گئی، ''آپ میسور جا رہے ہیں نا! کل میری جس بیٹی سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی، وہ بایولوجی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ وہ میسور اور اُوٹی کے قریب گُنڈل پیٹھ میں رہتی ہے۔ آپ میسور سے پندرہ کلومیٹر پہلے سری رنگ پٹنا کا ٹیپو سلطان کا محل ضرور دیکھئے۔ آج ہماری یہ بیٹی بھی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ وہیں گھومنے گئی ہے۔''

''ہم آج دیر شام میسور پہنچ پائیں گے۔ ٹیپو سلطان کا محل تو بند ہو چکا ہوگا۔ آج تو بس برندابن گارڈن میں روشنی اور آوازوں کا فوارں کا شو دیکھ پائیں گے۔ کل راجہ وڈیار کا 'اَمباوِلاس محل' اور زُو...اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو پائے گا۔''

''چڑیا گھر تو دیکھنے کے لائق ہے۔ صحتمند، خوبصورت پرندے، جانور...آج کل ان کے گود لینے کا رجحان زوروں پر جو ہے۔ ضرور دیکھئے گا۔'' ملیحہ کی آنکھوں میں اپنے علاقے کے شاندار قابلِ دید جگہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے چمک آ گئی تھی۔

''جی ضرور... پرسوں سویرے ہوٹل چھوڑنا ہی ہوگا۔ رمضان سے ایک روز پہلے پہنچ جائیں تو آرام ملے گا۔ ورنہ مارے تھکن کے پہلا روزہ بھاری پڑے گا۔ اگلے دن کی سحری کی تیاری بھی تو کرنی ہوگی۔''

''ملیحہ صاحبہ، ہماری ایک دوست کو لیبلے کی تکلیف ہے۔''، اچانک مجھے اپنی سہیلی یاد آ گئی، ''حال ہی میں ان کا ٹرانسفر بنگلور ہوا ہے۔ یہاں علاج چل

رہا ہے۔ میں نے انھیں رائے دے دوں کہ 'سووی نیئر اسپتال' چلی جائیں؟ ڈاکٹر صاحب صحیح رہنمائی کرسکیں گے؟''

''نہیں۔'' ملیحہ کی 'نہیں' نے ایک اداس خاموش فضا کو جنم دیا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''دراصل پرسوں اسپتال کے ڈائریکٹر نے انھیں بلا کر پوچھا تھا،'' لگتا ہے آپ کو اس جاب میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

''کیوں! کسی مریض نے شکایت کی!'' میرے شوہر کو تعجب ہوا تھا۔

''نہیں۔''

''پھر آپ کو کس بات سے لگا کہ مجھے دلچسپی نہیں ہے؟''

''آپ نے شاید دھیان سے نہیں پڑھا تھا۔ کانٹریکٹ لیٹر میں سیلیری ڈیڑھ لاکھ ہے۔''

''جانتا ہوں۔''

''لیکن آپ زبانی کانٹریکٹ کو بھول گئے!! آپ سے ایچ.آر. والوں نے کہا تو تھا، اسپتال کا ساڑھے تین چار لاکھ روپئے مہینے کا فائدہ کروانا ہوگا۔ لیکن آپ تو کسی مریض کو کسی بڑے ٹیسٹ کے لئے بھیجتے ہی نہیں!''

''کسی کو ضرورت ہی نہیں پڑی۔ آسان سے کیس تھے۔ کچھ الجھے ہوئے بھی تھے۔ لیکن سلجھ گئے۔ بڑے ٹیسٹوں کی بالکل ضرورت ہی نہیں تھی۔''

''آپ جانتے ہی ہیں، کارپوریٹ اسپتالوں کا خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ اسپتال کی عمارت کا maintenance، زیادہ سہولتیں، آپ لوگوں کی بہت اچھی تنخواہ۔'' ایچ.آر. والے نے بات جاری رکھی، ''سی سیکشن اب عام ہوگیا ہے۔ ہمارے اسپتال میں نارمل ڈیلیوری کو پچاس ہزار لگتے ہیں اور سی سیکشن کے ڈیڑھ لاکھ۔ کل جو

ڈیلیوری نارمل ہوئی تھی، آپ کو آپریشن ضروری بتانا ضروری لگنا چاہئے تھا نا!''

''شاید دو نمبر والوں کو پیسہ خرچ کرنے میں مشکل نہ ہوتی ہو۔ بیچارا مڈل کلاس اور لوور مڈل کلاس آدمی کیا کرے گا!'' میرے شوہر نے سوال کیا۔

''سرکاری اسپتال جائے۔''

''مجھے ذرا جلدی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر اپنی جگہ بیٹھے سوچتے رہے۔

''جو گزر گیا سو گزر گیا...کوئی بات نہیں....آئندہ دھیان رکھیے۔ ٹرسٹیوں کے ساتھ میٹنگ ہے۔ میں آپ کے فیور میں بات کروں گا۔''

.....

''...لیکن ہم جیسے نوکری پیشہ لوگوں کو کتنا مشکل ہے! میری اپنی بیٹی کی ڈیلیوری ہے، میں کیا کروں گا!'' ڈاکٹر نے گھر پہنچ کر مجھ سے کہا، ''سرکاری اسپتال لے جائیں بیٹی کو؟''

''سرکاری؟'' مجھے تعجب ہوا۔

''ہاں سرکاری اسپتال بہتر ہیں۔ وہاں صحیح بیماری کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس طرح کی دھاندلی تو بالکل نہیں ہوتی۔''

''لیکن وہاں لمبی قطاریں ہوتی ہیں۔ بہت وقت لگتا ہے۔'' میں ان کی بات سے مایوس تھی۔

''وہاں مریض تھوڑی بے ایمانی کر لیتا ہے۔ واچ مین اور چپراسی کو سو پچاس روپئے تھما دئے۔ وہی اسے لیے لیے پھرتا ہے۔ تھوڑا مصلحت سے کام تو لینا ہی پڑتا ہے نا!''

.....

ملیحہ کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں بھابی کا چہرا آ گیا، 'کن پریشانیوں میں الجھ گئیں بیچاری!!''

''آپ نے اپنے شوہر کے 'سووی نیئر اسپتال' جوائن کرنے کی بات کی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ آپ کے شوہر وہیں ہیں۔اسی لیے سہیلی کا خیال آیا تھا'' میں نے معذرت چاہ لی۔

''انہوں نے پندرہ دنوں کی تنخواہ بھی نہیں لی۔'' ملیحہ نے گہری سانس لی۔ مجھے اس کے چہرے پر اطمینان اور فخر کے احساس ملے جلے سے نظر آئے۔ مجھے غور سے خود کو دیکھتے ہوئے دیکھ کر ملیحہ ہنس دی۔اس کے دانتوں کی پانتیں چمک گئیں۔ اس نے گھڑی دیکھی، مسکراتے ہوئے تپائی پر رکھی تحفوں کی تھیلی میرے ہاتھوں میں دھیرے سے رکھ دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔ میرے شوہر بھی گیٹ کے باہر منتظر ہیں۔خدا حافظ''۔

وہ دو قدم آگے بڑھ گئی۔ پھر پلٹ کر بولی۔

باجی! اگر نیشنل کمیٹی ڈیڑھ سو کتابیں خرید لے تو اچھا رہے گا۔''

میری نظر ملیحہ کے ملیح رنگ چہرے پر ٹنگی ہلکے سے مسکراتی آنکھوں سے اوپر اٹھ کر تحفوں کی تھیلی پر ٹھہر گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر ایک بار اور اس کی طرف دیکھا۔ مجھے عجیب طرح سے دیکھتے دیکھ کر اس کے دانتوں کی پانتیں دوبارہ چمک اٹھی تھیں۔

●●●

☆.....ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

تجزیات وتعبیرات: منتخب افسانے

افسانہ ''انجام کار'' سلام بن رزاق کے چند اہم افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ موضوعاتی سطح پر افسانہ ایک اہم سماجی ایشو کو پیش کر رہا ہے اور کہانی کی عصری مطابقت (Contemporary Compatibility) تازہ دم ہے کیونکہ اس قسم کی صورتحال کسی نہ کسی صورت میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ افسانے میں ایک جگہ کردار کی رہائش کی مدت تین مہینے اور پھر پولیس افسر کے پوچھنے پر سات مہینے بتایا گیا ہے خیر یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔

بنیادی طور پر اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار نے موضوع اور مرکزی خیال (Theme and content) کو پلاٹ میں ایک سبک رفتار ندی کی طرح انجام تک پہنچایا ہے اور اس کے لئے بیانیہ کا آسان اسلوب بھی کارآمد ثابت دکھائی دیتا ہے۔ معروف ناقد ٹیری ایگلٹن اپنی کتاب Criticism and ideology میں متن (Text) کے بنیادی سروکار سے متعلق لکھتا ہے کہ ''متن کو اپنی زبان بولنے کی اجازت دینی چاہے یا متن خود اپنا مقصد ظاہر کرتا ہے۔'' (The text to speak with its own voice) تو افسانہ ''انجام کار'' کی کہانی بھی خود ہی اپنا موضوع اور مقصد پیش کر رہی ہے کہیں پر بھی ابہام در نہیں آتا ہے یہ اس افسانے کی بڑی خوبی ہے۔

موضوعاتی سطح پر افسانہ سماج کی اندوہ ناک صورتحال پر فنی طنز (Artistic

irony) کی عمدہ مثال پیش کررہا ہے۔ ابتدا میں اگرچہ مرکزی کردار کی پریشانی کا اشارہ ملتا ہے تاہم کہانی سماج کے پچھڑے طبقے کی بستی سے شروع کی گئی ہے جہاں پر شور شرابہ 'لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ روز کا معمول ہوتا ہے۔ پھر مرکزی کردار ''کلرک'' اور ''شامو دادا'' کی کردار نگاری میں ایک شریف النفس انسان اور ایک غنڈے موالی جو کہ غیر قانونی طور پر شراب کا دھندا بھی کرتا ہے اور شریف لوگوں کو ستاتا بھی ہے' کے فکری و عملی تصادم کو سامنے لایا گیا ہے اور انجام کار یعنی آخری کار ایک شریف انسان کی بے بسی اور قانونی محافظوں کی فرض شناسی سے غفلت اور بالواسطہ یا بلاواسطہ مجرموں کی پشت پناہی کو ظاہر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے انصاف کا طالب انسان مجبور ہو کر مجرم کے در پر ہی جانا اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

افسانہ تھوڑا بہت علامتی اشارے بھی کررہا ہے یعنی نہرونگر۔۔۔ مطلب نہرو کے دیس کی یہ ابتر حالت ہے جہاں پر مجرم اور پولیس ملے ہوئے ہیں اور ایک امن پسند عام شہری کا جینا دوبھر کیا جاتا ہے۔ اور نفسیاتی پہلو بھی افسانے میں موجود ہے یعنی مرکزی کردار کا مشکلات میں پڑ کر نفسیاتی الجھنوں کی زد پر آنا اور اس کی شریف بیوی کا ہمسایوں اور پھر شامو دادا کے خوف سے نفسیاتی الجھن کا شکار ہونا۔ مجموعی طور پر یہ افسانہ فنکارانہ طنز کا عمدہ نمونہ پیش کررہا ہے۔ کہانی بنیادی طور پر ایک شریف النفس انسان اور سماج کے ایک غنڈے کے درمیان رسہ کشی پر مبنی ہے۔ غنڈہ اپنے غلط کاموں کو سرعام انجام دیتا رہتا ہے لیکن ایک دفعہ جب ایک شریف انسان اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے تو یہی مسئلہ شریف انسان کے لئے ذہنی تناؤ کا موجب بنتا ہے کیونکہ اس کی مدد کے لئے کوئی سامنے نہیں آتا ہے اور وہ آخر کار شامو دادا سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

افسانہ ''لکڑ بگھا چپ ہوگیا'' سید محمد اشرف کا ایک اہم علامتی افسانہ

ہے۔اصل میں یہ افسانہ لکڑ بگھے کی سیریز کا تیسرا اور آخری افسانہ ہے۔ پہلا ''لکڑ بگھا ہنسا'' دوسرا ''لکڑ بگھا رویا'' اور تیسرا ''لکڑ بگھا چپ ہوگیا'' ان تینوں میں لکڑ بگھے کی علامت میں سماج کے مختلف فکری وعملی رویوں کو پیش کیا گیا ہے۔ پیش نظر افسانے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں انسانی فطرت کے دو روپ ظاہر کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے انجام میں قاری ایک انسان کے اندر لکڑ بگھے کی خصلت کو بخوبی محسوس کرتا ہے۔لیکن لکڑ بگھا یہ سب کچھ دیکھ کر مایوس ہوکر چپ ہوجاتا ہے۔ موضوعاتی سطح پر دیکھیں تو یہ افسانہ ایک سماجی نوعیت کا افسانہ ہے جو کہ اسلوب میں نیم علامتی بھی ہے کیونکہ اس میں لکڑ بگھا کی کردار نگاری بنیادی طور پر عصری انسان کے بدلتے رویّوں/ برتاؤ (Changing behaviour) سے منسلک کر کے علامتی انداز میں اچھی ہنرمندی سے فکشنائز کیا گیا ہے۔نفسیاتی طور پر دیکھیں تو انسانی فطرت کا جائزہ لیتے ہوئے ارسطو نے کہا تھا کہ فطرت/ جبلت کے اعتبار سے انسان ایک سماجی جانور ہے:

"Man is by nature a social animal."

افسانے میں بھی انسان کی نفسیات کو بھیڑے کی نفسیات سے ملایا گیا ہے کہ کس طرح مجبوری کے وقت بے بسی کا اظہار کرتا ہے اور پھر دوسرے انسان کو مجبور دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے۔ دو کردار ایک ہی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔لیکن پہلے کردار کی پریشانی ٹرین میں جگہ ملنے پر ختم ہوجاتی ہے لیکن جب اسی قسم کی پریشانی میں مبتلا دوسرا انسان اسے مدد مانگتا ہے تو وہ اسے نظر انداز کر کے منہ موڑ لیتا ہے۔اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ پہلے وہ بھی اسی قسم کی پریشانی میں مبتلا تھا' بقول شاعر:

اب کے شہروں میں بھی جنگل کی ہوا ایسی چلی
مائیں بستر میں چھپیں بھیڑیا جب یاد آیا

اس افسانے کی کردار نگاری کا گراف بڑا ہے۔کہانی کی فضا بندی بھی عمدہ

ہے یعنی موضوع کے مطابق مختلف کردار مختلف مذاہب یا فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کہانی کا ماجرا بھی افسانوی بیانیہ کا حامل ہے۔

تکنیکی طور پر افسانہ واقعاتی اسلوب کا حامل ہے یعنی ٹرین کے ایک ڈبے میں پورا ماجرا سنایا گیا ہے اور موضوعاتی کینوس میں کہانی واقعہ سے نکل کر ایک سماج کی عکاسی کرتی ہے۔ ریل کی بات کریں تو یہ بھی ایک طرح سے سماج کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے یعنی اب ہمارے سماج میں کس طرح کا ماحول پروان چڑھ رہا ہے۔ جو انسانوں کے برعکس لکڑ بگھوں کی خصلت کی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو ''لکڑ بگھا'' کی سیریز کے افسانوں میں انسانوں کے حیوانی رویوں کو علامتی پیکر میں پیش کیا گیا ہے۔ اور ان حیوانی رویوں کو لکڑ بگھے کی علامت کے توسط سے فنکارانہ موازنے کی صورت دے کر کہانیوں کو انجام تک پہنچایا گیا ہے، جس سے انسانوں کی خودغرضی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری اور غیر انسانی فطرت واضح طور پر اجاگر ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ تخلیقی اسلوب میں پیش ہوا ہے نہ کہ ناصحانہ انداز بیان میں، جو کہ ایک فن پارے کا بنیادی فنی حسن ہوتا ہے۔

نورالحسنین کا تخلیق کردہ افسانہ '' 19 مارچ / 2350ء'' دیکھ کر مسرت ہوئی، کیونکہ یہ سائنس فکشن کے زمرے میں آتا ہے۔ اردو میں سائنس فکشن لکھنے والوں میں اظہار اثر کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ انہوں نے سائنس فکشن لکھنے پر بھرپور توجہ دی اور تین ناول لکھے، جن میں "بیس ہزار سال بعد" ایک دلچسپ سائنس فکشن کا حامل ناول ہے۔ جی۔ حسین کا ناول ''آدم ثانی'' بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ اور بھی لکھا گیا ہو۔ سائنس فکشن یا sci-fi فکشن کی ایک ایسی صنف ہے جو مستقبل کے موضوعات پر فرضی کہانیوں (Speculative stories) سے تعلق رکھتی ہے۔ سائنس فکشن کے تعلق سے سید تحسین گیلانی، ڈاکٹر

شفقت محمود، سیدہ آیت گیلانی اور راقم نے چند سال قبل ''انہاک انٹرنیشنل فورم'' (فیس بک) پر ایک مائیکرو فکشن ایونٹ بھی کروایا تھا جس میں دنیا بھر سے لوگوں نے تخلیقات بھیجی تھیں اور ان پر اچھی گفتگو بھی ہوئی تھی۔ اس فکشن میں تخیل کے توسط سے مستقبل میں پیش آنے والی امکانی زندگی یا واقعات (Futuristic Events) کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ جن کا موضوع، سائنس اور تیکنالوجی کی ترقی، وقت کے دورانیہ میں تبدیلی، زندگی میں سائنسی پیش رفت، سیاروں پر انسانی زندگی یا غیر ارضی یا ماورائے دنیا/ زندگی (Extra life terrestrial) جیسے موضوعات پر فکشن تخلیق کیا جاتا ہے۔ پیش نظر افسانہ '' 19 مارچ / 2350 '' کی موضوعاتی ساخت، بیانیہ اور کہانی پر فوکس کریں تو یہ افسانہ موضوعاتی سطح پر سائی فائی کی دلچسپ عکاسی کرتا ہے۔ مرکزی کردار خضر میاں اگر چہ ارضی دنیا کا باشندہ ہوتا ہے لیکن زمان ومکان (Time and Space) کے کینوس میں مستقبل کی دنیا کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کا پورا خاندان ایک روبوٹ کی ہیئت اختیار کر چکا ہوتا ہے اور افراد خانہ زمین کے بجائے سیاروں کے باشندے بن گئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی سالگرہ پر مشین کا بٹن دباتا ہے اور اسکرین پر 19 مارچ / 2350 تاریخ نمودار ہوجاتی ہے۔ وہ اس قسم کی مشینی زندگی سے غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ جب اس کا پوتا اور پوتی دادی اماں کے کہنے پر چاند سے اتر کر اس کی سالگرہ سلیبریٹ کرنے کے لئے حاضر ہوجاتے ہیں اور پھر دل، کھیت، مذہب اور ماضی یعنی بیسویں صدی کی خوشحال زندگی اور کھانے پینے کے چیزوں سے متعلق سنتے ہیں تو وہ بچے حیران ہوجاتے ہیں کہ کیا ایسی بھی زندگی ہوتی تھی۔

افسانے میں خضر میاں کی سوچ کے پیش نظر مشینی زندگی میں ناپید ہوئی انسان کی فطری خواہشوں، خوشی اور غم وغیرہ کا پہلو بھی سمویا گیا ہے۔ بچے بھی اس کی

باتیں سن کر کھانے کے ٹیبلٹس کے بجائے روایتی انداز کے کھانوں کی تمنا کرتے ہیں۔ افسانے کی تکنیک اور پیغام پسند آیا کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ مستقبل میں مشینوں اور آلات کے سہارے زندگی گزارنے والے انسانوں میں واقعی انسانی ہمدردی، احساسات وجذبات اور دل میں بسی محبت جیسی انسانی صفات ناپید ہی ہوں گیں۔ بقول علاّمہ اقبال:

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

نورشاہ کی تخلیق فنی چابکدستی سے مزین ہوتی ہے۔ وہ افسانہ ہی لکھتے ہیں نہ کہ واقعہ نگاری کرتے ہیں۔ پیش نظر افسانہ ''آواز کی کہانی'' میں ایک فن کار کی وہ آواز یا سوچ ڈرامائی انداز سے سامنے لائی گئی ہے جس کا ایک روپ منافقانہ فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ہر کسی عورت کی آواز کی تعریف کرتا ہے جو اس کے سامنے ہوتی ہے اور مبالغہ کرنے میں اتنے آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ صرف نام سن کر اس عورت کی آواز کی تعریف کرتا ہے جس کا آواز کی دنیا سے کوئی دور کا رشتہ تک نہیں ہوتا ہے:

''میرے بھائی کہانی کار دوست۔۔زلیخا کا نہ تو پروا گرموں سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی مائک سے۔۔دفتر میں کام کرتی ہیں، قلم چلاتی ہیں اور فائلوں میں سر کھپاتی ہیں پھر بھی آپ ان کی آواز کے شیدائی ہیں۔۔اب جانے بھی دیجئے بہت ہو چکا۔ کنٹین آچکا ہے اور یہاں جانے کتنے اور چہرے نظر آئے گے جن کی آواز کے شیدائی بننے میں آپ کو دیر نہیں لگے اس لئے خاموشی سے چائے پیتے ہیں اور آپ کی آواز کی کہانی کو کسی اور ریکاڈنگ کے لئے ذہن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔۔۔!''

اس طرح سے افسانہ فن کاروں کے دہرے معیار اور عصری دنیا کی میڈیائی لائف میں دولت وشہرت کے بھوکے لوگوں کے تاریک پہلو کو بھی سامنے لاتا ہے جو

میڈیائی اخلاقیات کی ختم ہورہی اہمیت کا بھی اشارہ کرتا ہے۔افسانہ دلچسپ طنزیہ شیڈز سامنے لاتا ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے افسانے کا عنوان'' آدھے ادھورے'' اور پھر اس کے دائرے میں تخلیق شدہ کہانی میں پیش ہوئے سماجی و اخلاقی مسائل (Social and Ethical issues) کی طرف توجہ دیں تو تجزیاتی نقطۂ نگاہ سے بظاہر افسانہ نگار نے افسانے کے مرکزی نوجوان کردار رحیم الدّین کی ہتک آمیز زندگی کو دلنشیں اسلوب میں فکشنائز کیا ہے تاہم بین المتن (Inter text) موضوعاتی جہات پر ارتکاز کریں تو عنوان'' آدھے ادھورے'' کی معنوی توسیع کا اطلاق سماج کے ان سبھی ناخیز افراد کی سماجی و شناختی محرومی(Social and Identical deprivation) پر ہوتا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں جسمانی طور پر کم یا زیادہ نقائص کے حامل ہوتے ہیں۔جیسے کانے'لنگڑے'بونے'بہرے وغیرہ۔ان افراد کے تئیں سماج کا کیا اخلاقی رویہ ہوتا ہے وہ اس افسانے میں کانے رحیم الدین کی کردار نگاری' نفسیاتی پیچیدگی اور احساس کمتری کی صورت میں بخوبی پیش ہوا ہے۔افسانے کا پلاٹ متعین بیانیہ(Definite Narrative) پر استوار ہوا ہے پورا قصہ رحیم الدین کی کردار نگاری کے اردگرد گھومتا ہے ۔پلاٹ کی ظاہری ساخت اگرچہ یک موضوعی نظر آتی ہے جس کو انجام تک پہنچانے میں افسانہ کامیاب رہا ہے' تاہم داخلی ساخت میں کلیدی طور پر تین مسائل سامنے آتے ہیں۔ایک تو سماج کے آدھے ادھورے لوگوں کی احساس کمتری' دوسرا ان کی نفسیاتی پیچیدگی اور تیسرا سماج کے جاہل افراد کی توہم پرستی (Superstition)۔ یہ تینوں موضوعات افسانے کے متن کی معنوی جہات(Semanitic Dimentions) کی عمدہ فنکارانہ عکاسی کرتے ہیں۔تنقید نگاری کا ایک اصول ہے کہ جو کچھ متن ظاہری ساخت اور داخلی معنوی

جہات کی فنی عکاسی کرتا ہے اسی کے دائرے میں اس تخلیقی متن(Creative text) کی تشریح، توضیح یا تجزیہ ہونا چاہیے۔نہیں تو تبصرہ یا تجزیہ ''سوال از آسمان جواب از ریسماں'' جیسا بن جاتا ہے۔جسمانی طور پر ناخیز کردار کی نفسیاتی الجھن اور احساس کمتری کو ابتدا میں تجسس آمیز انداز سے پیش کیا گیا ہے اور افسانہ قاری کے اندر افسانہ پڑھنے کا تجسس پیدا کرتا ہے:

> ''۔۔۔سورج گہن کے دوران سورج کی طرف نہ دیکھنے کی تنبیہ کے باوجود وہ سوچتا ہے کہ ''وہ سورج گہن کو ضرور دیکھے گا۔اندھا ہوجائے گا تو کون سی آفت ہوجائے گی !(میری رائے میں یہاں پر آفت پڑ جائے گی شاید زیادہ مناسب رہے گا۔کیونکہ آفت پڑنا محاورہ ہے۔)کم ازکم اس مستقل عذاب سے تو نجات مل جائے گی جو وہ پچھلے پندرہ برسوں سے جھیلتا آرہا تھا۔۔۔''

اس طرح دوسرے مسائل بھی افسانے میں شامل ہیں۔انجام تو موضوع کے عین مطابق ہے اور افسانے کی موضوعاتی پیش کش قاری اور مجموعی تاثر قاری کو متاثر کرتا ہے۔

افسانہ ''تحفوں کی تھیلی'' نگار: ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی تخلیق ہے۔راقم نے ان کے ایک اور عمدہ افسانے "سہمے کیوں ہوانکش" کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے جو رسائل میں چھپ بھی چکا ہے۔ان کے بیشتر افسانے سماجی مسائل کو بحث بناتے ہیں اور ان میں جزئیات نگاری کا اہم حصہ ہوتا ہے جس میں کہانی ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔پیش نظر افسانے میں بھی سماجی مسائل کا عکس ہی دکھائی دیتا ہے جن میں

پرائیوٹ اسپتالوں کی کارپوریٹ سوچ اور سرکاری اداروں میں ایوارڈ یا مراعات لینے کے لئے سلیکشن کمیٹیوں کو تحائف یا اثر رسوخ سے شیشے میں اتارنے کے ماحول کو دلچسپ انداز سے فکشنائز کیا گیا ہے۔افسانے کا متن نصف سے زیادہ روداد نما تکنیک کی غمازی کرتا ہے۔کہانی پھر بھی اچھے ڈھنگ سے آگے بڑھتی ہے البتہ افسانے کا دوسرا حصہ تکنیکی طور پر پلاٹ کی کمزوری کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ یہاں پر راوی بھابی کی بیماری اور اسپتال میں داخلے کی روداد خود بتا رہا ہے جبکہ وہ دوسرے شہر کی طرف سفر میں ہوتا ہے۔فنی طور پر یہ قصہ کسی اور کردار کی زبانی پیش ہونا چاہیے تھا یا اگر راوی یا مرکزی کردار اس کا شاہد ہوتا۔

مجموعی طور پر افسانہ اپنی تفہیم اور پیام میں کامیاب ہے کیونکہ عنوان " تحفوں کی تھیلی " کی سماجی بدعت اور اس کے اثرات چاہیے اسپتالوں میں ہو یا سرکاری دفتروں میں کو سنجیدہ انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔افسانے میں اگرچہ شہری زندگی کی عکاسی کی گئی ہے لیکن اب تحائف کی صورت میں رشوت خوری کا یہ چلن ہر جگہ عام ہوتا جا رہا ہے اور لوگ اپنا مقصد پورا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔اس طرح افسانہ ایک اہم سماجی مسئلے کو کہانی میں اچھی ہنرمندی سے پیش کرتا ہے۔

☆۔۔۔راجہ یوسف

پوش وَن کی کہانی

''نہیں۔۔۔تم ایسا نہیں کرسکتی۔ پہلے تو تم میرے گاؤں تک پہنچ ہی نہیں سکتی اور اگر کسی وجہ سے پہنچ بھی گئی تو وہاں تم زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''کون مارے گا، مجھے ۔۔۔تیرا دادا، تیری دادی یا تیری وہ۔۔۔''

''ٹھنڈ۔۔۔ٹھنڈ مارے گی تجھے وہاں کی۔ بہت ٹھنڈ رہتی ہے ہمارے گاؤں میں۔آٹھ مہینے تو برف ہی رہتی ہے۔

''وووو۔۔۔میں تو ڈوڑتی پھروں گی۔ ناچتی کودتی پھروں گی۔تم کو بھی نچاؤں گی، ھاھاھاااا۔۔۔''

''اری۔۔۔ پاگل۔۔۔''

''ہاں۔۔۔میں پاگل۔۔۔میں دیوانی۔مستانی۔۔۔ھاھاھاااا''

چھوٹے سے روزن سے چھن چھناتی دھوپ اندر آ گئی اور سیدھے عرفان کی آنکھوں پر پڑنے لگی۔وہ تھوڑی دیر کسمسا تا رہا اور اس کا سپنا ٹوٹ گیا۔ پر دھوپ میں تمازت اور بڑھ گئی تھی۔نیند کا چسکا اسے آنکھیں کھولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے نیند کے خمار میں ہی اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ دیئے لیکن جب دھوپ اس کی کلائیوں کو بھی جلانے لگی تو وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔اب دھوپ اس کی گردن پر زور آزمائی کر رہی تھی۔ وہ غصے میں کمرے کے دوسرے کونے

میں کھسک گیا۔ دراصل عرفان پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد آج آدھی رات کو گھر پہنچا تھا اور بہت زیادتھکاوٹ محسوس کر رہا تھا، اس لئے آتے ہی سو گیا۔ اب نہ جانے یہ دن کا کون سا پہر تھا جو سورج کی کرنیں اندر آ کر اس کی نیند میں مخل ہو رہی تھیں۔ وہ کمرے کے دوسرے کونے کی طرف کھسک تو گیا تھا لیکن نیند اب آنکھوں سے دور جا چکی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے بس لیٹا تھا۔

''عرفان بیٹا۔ اگر تم جاگ گئے ہو تو اٹھ جاؤ۔ چائے پی لو۔ میں نے تیرے لئے مکئی کی روٹیاں بنائی ہیں اور ستو میں مکھن ملا کر رکھ دیا ہے۔''

''ماں ہٹاؤ اسے۔۔۔ اوہ۔ پتہ نہیں یہ دھوپ کہاں سے اندر آ گئی ہے۔ سونے بھی نہیں دیتی۔''

''بیٹا عرفان۔ تم بہت سوتے رہے ہو۔ اب تو شام ہو رہی ہے۔''

''ارے ے ے کیا سچی۔۔۔ مجھے تو یہ صبح کی دھوپ لگی تھی۔''

وہ جلدی جلدی اٹھ بیٹھا۔

''پہلے ایک گلاس پانی پلا دیں ماں۔ بہت پیاس لگ رہی ہے۔''

اس نے آنکھیں ملتے سامنے دیکھا۔ چولہا جل رہا تھا۔ ایک طرف نون چائے ابل رہی تھی۔ اس کی ماں گھڑے سے پانی نکال رہی تھی۔ عرفان نے ماں کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور گٹ گٹ پی ڈالا۔ چولہے سے گرمی آ رہی تھی۔ وہ تھوڑا دور بیٹھ گیا۔ ماں نے اس کے سامنے چائے کا پیالہ رکھ دیا۔ روٹیوں سے بھرا ٹوکرا اور مکھن ملا یا ستو کا برتن رکھ دیا اور خود چولہے پر کوئی دوسرا برتن چڑھانے لگی۔ عرفان نے چائے کا ایک گھونٹ پی لیا۔ ماں کی طرف دیکھا۔ اسے لگا جیسے ماں کچھ کمزور لگ رہی ہے۔

''ماں کیا بات ہے۔ تم کچھ کمزور سی لگ رہی ہو۔''

''نہیں بیٹا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' ماں نے عرفان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ماں۔ کچھ تو ہے۔ جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ کوئی اور بات تو نہیں''۔ وہ مسلسل ماں کو دیکھے جا رہا تھا اور ماں اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

''نہیں بیٹا کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ خود کو چولہے پہ رکھے برتنوں کے ساتھ مصروف رکھتے ہوئی بول رہی تھی۔

''ارے ماں یہ۔۔۔ یہ دادی کہاں گئی ہے۔''

''وہ تیرے دادا کے لئے چائے لے کر گئی ہے۔''

''اچھا پن چکی پر ۔۔۔ میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ دادا کو دیکھنے۔ کل رات تو کسی سے بات بھی نہیں ہو پائی تھی۔''

''ہاں تم آتے ہی سو گئے تھے نا۔ تمہارے دادا بھی تاکید کر کے گئے تھے کہ تمہیں کوئی جلدی نہ اٹھائے۔ جب اٹھے تو اپنی مرضی سے اٹھے۔ تمہاری دادی نے بھی جرأت نہیں کی تمہیں اٹھانے کی۔ تمہارا دادا بار بار تمہیں دیکھنے آتا۔ یہاں تمہیں سوتا دیکھ کر پھر چلا جاتا۔ اور ہمیں پھر سے تاکید کر کے جاتا کہ عرفان کو نہ اٹھانا۔ یہ بہت تھکا ہوا ہے۔۔۔ لے ایک پیالہ اور پی لے''۔

''نہیں ماں ایک پیالہ یہاں تمہارے ساتھ پی لیا۔ اب دو پیالے دادا دادی کے ساتھ پن چکی پر پیوں گا۔ سماوار چائے۔''

''اچھا بیٹا جا۔ اللہ نگہبان۔۔۔'' عرفان جلدی جلدی گھر سے نکل آیا ۔

☆☆☆

یہ بوسیدہ لکڑی اور گھاس پھوس کی بنی پن چکی تھی۔ اس کے دروازے کے سامنے تھوڑی زمین تھی جو ڈھلوان سے کاٹ کر بنائی گئی تھی ۔ یہاں سے نیچے تک

اوبڑ کھابڑ پگڈنڈی جاتی تھی جو پوش وَن وادی میں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ پن چکی کے تھوڑے سے آنگن میں چکی کے دونوں ٹیڑھے میڑھے پاٹ کھلے پڑے تھے اور بابا نصیران کی سطح پر اپنا بائیاں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ بابا نصیر اچھا چکی بان رہا تھا اور چکی کے پاٹ تلنے میں بڑا ماہر تھا۔ چکی کے دونوں پاٹ گھستے گھستے چکنے ہو چکے تھے اور لوگوں کو شکایت تھی کہ بابا نصیر کی چکی اب آٹا اور ستوا چھے سے نہیں پیستی۔ کل کچھ لوگوں کی مدد سے اس نے چکی کے دونوں پاٹ کھول دیئے تھے اور اب وہ چھوٹی سی ہتھوڑی سے پتھروں پر ہلکے ہلکے چوٹ مار رہا تھا تا کہ ان پر کھردرا پن آ جائے۔ اس کی بیوی جان دید پاس ہی بیٹھی تھی اور وہ سماوار میں کوئلے ڈال رہی تھی۔

''ہے دادووو'' عرفان نے دادا دادی کو دیکھا تو دور سے ہی آواز لگا دی۔

''ارے ے ے۔۔۔وہ دیکھئے عرفان پتر آ گیا ہے''۔

دادی جو سماوار میں پھونک مار رہی تھی، نے عرفان کو دیکھ کر بابا نصیر سے کہا۔ دونوں اٹھ کر عرفان کی طرف بڑھنے لگے۔ عرفان دوڑ کے آ گیا اور دونوں دادا دادی کے گلے لگ گیا۔

''میرا پتر۔۔۔میرا جگر'' دونوں دادا دادی اس کی بلائیں لے رہے تھے۔

''دادی کیسی ہیں آپ۔'' عرفان نے دادی سے گلے ملتے کہا۔

''بس پتر تو آ گیا تو اب میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ دادی نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

'' آج پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد دادا دادی کے ساتھ سماوار والی چائے پیوں گا''۔

''ہاں پتر۔ بس چائے میں ابال آنے دے۔'' دادی پھر سے سماوار میں پھونکیں مارنے لگی۔

''آ پتر آ، بیٹھ میرے پاس ۔۔۔دیکھ بیٹا عرفان میں تیرے جانے سے بہت غصے میں تھا۔تم سامنے ہوتے تو شاید میں تم کو مارتا بھی بہت لیکن تیرے جانے کے بعد میں بہت پریشان رہا۔تم پر غصہ بھی آتا تھا اور پیار بھی آتا تھا۔''

''پریشان تو تیری ماں بھی بہت تھی۔'' دادی نے سماوار کا ڈھکن اٹھاتے ہوئے کہا۔چائے ابل رہی تھی۔اس نے پیالوں میں ستو ڈال کر چائے ڈالنی شروع کر دی۔

''تیری ماں کے ساتھ ساتھ تیری دادی بھی بہت پریشان تھی۔ان دونوں نے تو بہت دن کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔وہ میں نے ان پر اپنا غصہ نکالا تو مجبور ہو کر یہ کچھ زہر مار کرتی تھیں۔تب تک تو میرا غصہ بھی ختم ہو گیا تھا لیکن تم یاد بہت آ رہے تھے۔''

دادا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔عرفان جلدی سے اٹھا۔دادا کے ساتھ بیٹھا۔ان کے آنسو پونچھے۔دادا نے اس کو گلے لگایا۔اس کا ماتھا چوما۔

''آپ تو بڑی مردانگی دکھا رہے تھے۔ہم روتے تھے تو طعنے دیتے تھے۔اب اپنا حال دیکھو۔'' دادی نے لقمہ دے دیا۔

''اری پگلی۔یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔یہ عرفان کے آنے کی خوشی ہے جو من میں سما نہیں پا رہی ہے۔آنکھوں سے چھلک پڑتی ہے۔''

(اسی خوشی کے ماحول میں سب باتیں کرتے کرتے چائے پی رہے تھے،ہنس رہے تھے،قہقہے لگا رہے تھے)۔

پہلگام سے امرناتھ جانے والے راستے میں آٹھ ناڈین گاؤں آتا ہے جو پہلگام سے آٹھ دس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔اس خوبصورت گاؤں سے چندن واڑی تک سڑک جاتی ہے اور اس کے بعد پہاڑی راستہ شروع ہو جاتا ہے جو شیش ناگ سے ہوتے ہوئے امرناتھ گپھا تک جاتا ہے۔آٹھ ناڈین میں کئی چھوٹی بڑی

پہاڑیوں کا لمبا سلسلہ نکلتا ہے اور یہ پہاڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ انہی میں ایک چھوٹی پہاڑی تھی جس کی دوسری طرف پوش ون گاؤں آباد تھا۔ اس پہاڑی کے اوپر تک ایک ٹیڑھا میڑھا راستہ جاتا تھا جو قدرتی پتھروں پر لوگوں کے چلنے سے بنا تھا اور کچھ کانٹ چھانٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس راستے پر سفر کرنا مشکل تھا اور اوپر تک پہنچنے میں وقت بھی لگتا تھا۔ خواتین یا بزرگ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے تھے۔ پہاڑی کی دوسری طرف ایک چھوٹی لیکن خوبصورت وادی تھی جسے پوش ون گام (گاؤں) کہتے تھے۔ اس وادی میں برف ہٹتے ہی پھول کھلنا شروع ہو جاتے تھے اور یہ پھول تب تک نہیں مرجھا جاتے جب تک نئی برف نہیں گرتی تھی۔ اصل میں یہاں پھول کبھی ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ بس برف گرنے سے برف پگھلنے تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ورنہ سال بھر کھلتے ہی رہتے تھے اور اپنے اردگرد کو مہکاتے رہتے تھے۔ اگر کبھی کسی سال مارچ کے مہینے میں کھل کر دھوپ نکل آتی تھی تو نرگس کے پھول برف سے بھی پھوٹ کر نکل آتے تھے۔ اوپر سے دیکھیں تو پوش ون وادی اونچی اونچی برف سے ڈھکی پہاڑیوں کے بیچ سرسبز گوہر کی طرح گول مٹول جیسی لگتی تھی۔ پہاڑیوں سے چھن چھن گرتے جھرنے وادی کے مختلف اطراف سے بہتے ہوئے چھوٹے چھوٹے نالے اور ندیاں بناتے تھے اور پھر ان کا سارا پانی ایک چھوٹی سی جھیل میں جمع ہو جاتا تھا اور یہاں سے پانی ایک پہاڑی درّے سے باہر نکل جاتا تھا۔ وادی کے ایک طرف جہاں بابا نصیر کی پن چکی تھی، اسی کے اردگرد یہ چھوٹا سا گاؤں بھی آباد تھا۔ پوش ون وادی کی وجہ سے اس گاؤں کا نام بھی پوش ون گام پڑا تھا۔ پوش ون گام میں دس پندرہ ہی گھر رہتے تھے۔ گھر کیا لکڑی اور مٹی سے بنی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں جن میں ایک طرف گائے، بیل اور بھیڑ بکریاں پل رہی تھیں اور دوسری طرف یہاں کے لوگ بستے تھے۔ کسی گھر کے پاس اپنا گھوڑا یا خچر بھی تھا۔ گرمی کے دنوں میں یہاں مرد

نام کا بس بابا نصیر ہی رہتا تھا اور اس کے ساتھ گاؤں کے بچے اور عورتیں ہی ہوتی تھیں۔ باقی مرد تو سارے پہلگام اور چندن واڑی میں مزدوری کرنے جاتے تھے، جن لوگوں کے پاس گھوڑے یا خچر ہوتے تھے وہ ان کو لے کر امرناتھ گھپا تک بھی جاتے تھے۔ امرناتھ گپھا تک تو یہاں کے سارے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ چاہئے مزدوروں کے ساتھ یا چاہے گھوڑوں کے ساتھ لیکن جاتے سب لوگ تھے۔ چندن واڑی سے گپھا تک جانے والے سبھی راستے ان کے لئے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے بھی زیادہ جانے پہچانے تھے۔ چندن واڑی سے پشوٹاپ، زاج پل، شیش ناگ، مہاگنس ٹاپ، پوش پتھری، یہاں سے پنج ترنی، سم سنگ اور پھر امرناتھ گپھا۔۔۔ کہاں کیا مشکلیں آسکتی ہیں، ان کو سب پتہ ہوتا ہے۔

یہاں چونکہ ہر گھر میں بھیڑ بکریاں پالی جاتی تھیں اس لئے سردیوں میں جب برف گرتی تھی اور لوگ گھروں میں بند ہو جاتے تھے تو بھیڑوں سے لیا گیا اون کاتنے کا موسم شروع ہو جاتا۔ یہاں اون کاتنے والے چرخے اور کپڑا بننے کی کھڈیاں ہر گھر میں موجود رہتی تھیں۔ چھوٹی بڑی لڑکیاں ماؤں کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھیں۔ بچے روز شام کے وقت ماؤں کے ساتھ چپک کے بیٹھ جاتے تھے۔ برفیلے موسم میں مائیں دن بھر کے سارے کام کاج نپٹا کر جب شام کو چرخہ کاتنا شروع کرتی تو بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر انہیں کہانیاں سنایا کرتیں۔ باہر کڑاکے کی سردی، اندر کمرے میں دیئے کی ٹمٹماتی روشنی اور ماں چولہے سے دہکتے انگارے نکال نکال کر ٹھنڈے کوئلوں کے ساتھ ''سماوار'' میں ڈالتی۔ بیٹیاں سماوار کو سامنے رکھتی، اس میں پھونکیں مار مار کر کوئلوں کو انگارہ بنا دیتی۔ سماوار میں نون چائے ابلنے لگتی۔۔۔ کبھی کبھی شوق میں نون چائے کے بدلے قہوہ بھی بنا لیتے۔ بادام، زعفران، دارچینی اور سبز الائچی سے گرما گرم قہوہ پورے گھر کو معطر کر جاتا۔۔۔ قہوہ بنتا یا نون چائے، اس کے ساتھ مکئی کا پراٹھا یا مکئی

کا ستو لازم وملزوم تھا۔ستو کے بغیر چائے یا قہوے کا مزا کہاں۔

باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوجاتی تو اندر عرفان کی ماں زلیخا اون کو دھنکنے کا کام شروع کرتی اور اپنی ساس جان دید کو پونیاں بنا کر دیتی۔جان دید چرخے پر بیٹھ جاتی۔تکلے کی چمڑی میں انگلیوں سے تھوڑا سا سرسوں کا تیل لگاتی۔ایک ہاتھ سے پہیئے کی ہتھی کو گھمانا شروع کرتی۔تکلا بنا آواز کئے آہستہ آہستہ گھومنے لگتا۔دوسرے ہاتھ میں پونی کا ایک سرا پکڑ کر اس کو گھومتے ہوئے تکلے کی نوک کے ساتھ لگاتی اور پونی کو ہلکی رفتار کے ساتھ بل کھاتے تکلے سے دُور لے کر جاتی تا کہ دھاگا ٹوٹنے نا پائے اور بل کھانے سے سُوت بھی بنتا جائے۔مناسب دوری پر ہاتھ لے جا کر پہیہ روک کر پونی سے بٹے ہوئے سُوت کو تکلے پر لپیٹ دیا جاتا اور تند ڈالنے کا یہ عمل بار بار دہرایا جاتا۔گھروں کے بزرگ لوگ جیسے بابا نصیر جلاہا کا کام بھی جانتے۔اون کے تکلے کھڈیوں پر چڑھاتے اور قسم قسم کے کپڑے بنا کر رکھ دیتے۔فرن،ٹوپی،مفلر،پاپوش، عورتوں اور بچوں کے لئے اون کے کپڑے اور خاص کر اونی شال،دوپٹے اور سوٹ بنائے جاتے۔ان اون سے بنی چیزوں کو رنگا بھی جاتا اور بغیر رنگے سادہ بھی رکھا جاتا۔پھر ان پر رنگ برنگی سوزنی کا کام کیا جاتا۔اس طرح کے کپڑے موسم بہار اور امرناتھ یاترا کے دنوں کشمیر کی دکانوں اور پھیری والوں کے پاس مل جاتے ہیں۔ پہلگام اور دوسری جگہوں پر یہ دلکش کپڑے سیاحوں اور یاتریوں کو بیچے جاتے ہیں جو کشمیری آرٹ کے دلدادہ سیاح ہوتے ہیں وہ خوشی خوشی ان چیزوں کو خریدتے ہیں اور شوق سے پہنتے بھی ہیں۔لیکن یہاں کے مزدور کو دہاڑی کے نام پر بس چند ٹکے ہی مل جاتے ہیں جو اسے غربت کی دلدل سے نکال نہیں پاتے ہیں۔

پوش ون گام چھوٹا سا گاؤں ہے اور یہاں کے لوگ بھی بہت غریب ہیں۔ اس لئے سڑک اور بجلی کے بارے میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں۔اوبڑ کھابڑ اور مشکل

پہاڑی راستے سے یہاں کوئی آتا جاتا بھی نہیں تھا۔بس الیکشن کے دنوں کے آس پاس کے گاؤں سے کوئی سرکاری کارندہ یا ووٹ مانگنے والا کوئی ایجنٹ یا کسی قانونی مجبوری کے سبب پاس کے گاؤں سے نمبردار یا پٹواری کا کوئی آدمی آجاتا تھا۔ایک دو بار کچھ این۔جی۔اوورکرس بھی آئے تھے۔انہوں نے کوشش کی تھی کہ یہاں کے بچوں کو تھوڑا بہت تعلیم سے روشناس کرائیں لیکن انہیں دور دراز سے علاقوں سے آنا پڑتا تھا اور یہاں آس پڑوس کے گاؤں میں ایسا کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نہیں تھا جو ایک رضا کار کے طور یہاں آجاتا اور یہاں کے بچوں کو تعلیم سے روشناس کراتا۔ یہاں کوئی کھیل تماشہ بھی نہیں ہوتا تھا۔لے دے کے بابا نصیر کی پن چکی تھی جہاں فرصت کے دنوں مرد لوگ بیٹھنے آتے تھے اور گاؤں کے اکلوتے حقے سے لطف اٹھاتے رہتے تھے جو بابا نصیر کی ملکیت تھا۔ہاں اتنا خیال سب رکھتے تھے کہ جو بھی کام سے گاؤں کے باہر جاتا تھا وہ اپنی ضرویات کے ساتھ ساتھ ایک دو روپئے کا تمبا کو بھی لے کر آتا تھا۔تمبا کو کے لئے بابا نصیر کو بس ان دنوں پریشانی ہوجاتی تھی جب گرمیوں میں گاؤں کے سبھی مرد لوگ کئی مہینوں کے لئے پہلگام یا امرناتھ یاترا کے دنوں مزدوری کرنے جاتے تھے۔کبھی کبھی تو مہینوں بعد ہی کسی اجنبی مرد کی شکل دکھائی دیتی تھی۔گاؤں میں کھیتی باڑی کے علاوہ کام بس اتنا تھا کہ صبح سویرے لوگ گھروں سے بھیڑ بکریاں اور گائے، بیل کھول دیتے تھے جو خود ہی نیچے پوش ون وادی میں پہنچ جاتے تھے۔گاؤں کی عورتیں، چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں اپنی گائیں اور بیلوں کو خود چراتے رہتے تھے۔جبکہ بھیڑ بکریوں کی دیکھ بھال بابا نصیر کے پوتے عرفان کی ذمہ داری تھی، جو اکثر بھیڑ بکریوں کو لے کر پہاڑی کے اوپر تک چلا جاتا تھا۔یہاں وہ کسی جھرنے کے پاس کسی پتھر پر بیٹھ کر تھیلے سے بانسری نکالتا تھا۔بانسری کو اپنی قمیض سے رگڑ رگڑ کر خوب چمکاتا اور پھونک مار کر ہونٹوں سے لگا کے کوئی مدھر دھن چھیڑ دیتا۔اس کی دھن میں اتنی

مٹھاس ہوتی تھی کہ جو بھی سن لیتا اسے لگتا تھا کہ اس کے کانوں میں کوئی میٹھا رس گھول رہا ہے۔ جیسے آس پاس کہیں ہزاروں جھرنے جاگ اٹھے ہوں اور بانسری کی دھن کے ساتھ ساز بجانا شروع کر دیا ہو۔ جیسے اونچے دیودار ہوا کی تال پر جھومنے لگ گئے ہوں۔ عرفان کا باپ نہیں تھا۔ اس کا باپ احمد خان کسی بیماری کی وجہ سے عرفان کے پیدا ہوتے ہی مر چکا تھا۔ بابا نصیر اور اس کی بیوی جان دید نے عرفان کی ماں زلیخا کو بیٹی کی طرح رکھا اور وہ بھی اپنے بیٹے عرفان کی پرورش کے ساتھ ساتھ ساس سسر کی خدمت میں جٹ گئی تھی۔ عرفان اب سترہ سال کا ہو چکا تھا اور خوبصورت گبرو جوان لگ رہا تھا۔ گاؤں میں ایسے کئی گھر تھے جو اپنی بیٹی کی شادی عرفان کے ساتھ کرانا چاہتے تھے۔ لیکن بابا نصیر عرفان کے ماما حفیظ خان سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ عرفان کی شادی اس کی بیٹی سارہ سے ہی کرے گا جب کہ عرفان خود حنا کا دیوانہ تھا اور حنا عرفان سے دور بھاگتی تھی۔ یہ معاملہ ایسا کوئی معاملہ بھی نہیں تھا کہ گاؤں میں اس سے کوئی کھلبلی مچ جاتی۔۔۔ کھلبلی تو سارے گاؤں میں اب مچ گئی تھی اور یہ معاملہ اب واقعی بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ جب سارہ، حنا کے علاوہ ایک تیسری لڑکی عرفان کی زندگی میں کود پڑی تھی جو گاؤں کی تو تھی نہیں لیکن گاؤں میں پہنچ چکی تھی۔ یہ تیسری لڑکی تھی ممبئے کی انجلی۔۔۔ انجلی کی وجہ سے یہ عشقیہ معاملہ اب تکونی بن چکا تھا۔ تکونی کیا، یوں کہئے کہ عرفان کو ملا کر چکور ہو چکا تھا۔ اب یہ اس چھوٹے سے گاؤں کا بڑا اور سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ عرفان نے بابا نصیر سے کہا کہ وہ اب گاؤں والوں کی بھیڑ بکریاں چرانے نہیں لے جائے گا۔ وہ بھی دوسرے مرد لوگوں کے ساتھ پہلگام یا چندن واڑی جائے گا۔ جہاں وہ اور لوگوں کے ساتھ مزدوری کرے گا اور اپنے گھر کے لئے پیسے کما کر لائے گا۔ لیکن بابا نے سختی کے ساتھ منع کیا۔ کیونکہ بابا نصیر جانتا تھا

کہ ان کے پاس تو کوئی گھوڑا یا خچر ہے نہیں، جسے لے کر عرفان مزدوری کرنے جاتا یا گھوڑا لے جا کر امرناتھ گپھا ہی چلا جاتا اور کچھ پیسے کما کر لاتا۔ بنا گھوڑے کے اس طرح سے عرفان کو خود مزدوری کرنا پڑتی۔ کہیں کہیں پر خود ہی گھوڑا بننا پڑتا۔ چندن واڑی سے گپھا تک سامان ڈھونا اور کہیں پر کسی بزرگ یا بیمار یاتری کو کندھے پر لے جا کر یاترا کرانا آسان کام نہیں ہوتا۔ اس لئے بابا نصیر چاہتا تھا کہ کسی طرح انہیں کچھ پیسے مل جائیں اور ایک گھوڑا یا خچر خرید لیں تو وہ عرفان کو کام پر بھیج دیتا۔ اس طرح خالی ہاتھ جانا اور وہاں بس مزدور بن کے رہنا بابا نصیر کو گوارہ نہیں تھا۔ عرفان نے (ضد میں) کئی بار کھانا بھی نہیں کھایا اور ایک صبح وہ سویرے گھر سے نکل آیا۔ سب کے گھروں سے بھیڑ بکریاں نکالیں (جو ہمیشہ کرتا تھا) اور سیدھا پوش ون وادی میں جانے کی بجائے بھیڑ بکریاں لے کر اس راستے پہ چل نکلا جو آٹھ ناڈین کی طرف جاتا تھا۔ یہ راستہ اگر چہ بڑا کٹھن تھا لیکن یہاں کے لوگوں کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ عرفان جب بھیڑ بکریوں کا ریوڈ لے کر وادی کی دوسری طرف آٹھ ناڑین پہنچ گیا تو وہ بہت خوش تھا۔ وہاں ایک طرف مست مست لیدر بہہ رہی تھی، دوسری طرف خوبصورت اور رنگ برنگے ہوٹل تھے اور ان کے ساتھ ساتھ چندن واڈی کی طرف جانے والی بڑی سڑک پر اکا دکا گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ بھیڑ بکریوں کو ہانکتے ہوئے ہوٹلوں کے پیچھے لیدر کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں لیدر کے کنارے بہت گھاس تھی۔ اس نے بھیڑ بکریوں کو یہاں کی گھاس چرنے دی اور خود لیدر کے کنارے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ تھیلے سے بانسری نکالی۔ اسے اپنے رنگین کرتے سے اچھی طرح سے چمکایا۔ ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک خوبصورت دھن فضا کو مسحور کرنے لگی۔

☆☆☆

انجلی کو لگا کہ یہاں ساری رات رم جھم کرتی بارش برستی رہی لیکن صبح جب اس نے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا تو باہر کھلی دھوپ دیکھی۔ اسے لگا باہر سب دھلا دھلایا ہے۔ وہ ہوٹل کی بالکونی میں آ گئی تو باہر کا ماحول اسے بڑا خوشگوار لگا۔ اس کی نظریں لیدر کے اس پار سرسبز پہاڑی کی طرف لگی تھیں جس پر سورج کی سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ پہاڑی دیودار کے لمبے لمبے پیڑوں سے گھری تھی۔ اس کی نگاہیں لوٹ آئیں تو لیدر کا کنارہ بھی گھنے پیڑ پودوں سے بھرا تھا لیکن ان کے بیچ لیدر کا بہتا شفاف پانی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ انجلی کل ہی یہاں اپنے ممی ڈیڈی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ ان لوگوں نے گھر (ممبئی) سے نکلتے ہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ سری نگر کے بعد سب سے پہلے پہلگام جائیں گے۔ انجلی اور اس کی فیملی آج دوسری بار کشمیر گھومنے آئی تھی۔ پچھلی بار وہ صرف ایک دن کے لئے ہی پہلگام میں رکے تھے۔ یہاں پہنچ کر ان کے دل بہت چاہ رہے تھے کہ ایک دو دن اور پہلگام میں گزار دیں لیکن ان کے ٹراوَل ایجنٹ نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شیڈول کے مطابق انہیں پہلگام میں ایک ہی دن رکنا ہے، جس کا انہیں بڑا افسوس ہوا تھا۔ اس لئے اب کی بار یہ لوگ سب سے زیادہ پہلگام دیکھنے کے لئے ہی کشمیر آئے تھے۔ یہ ہوٹل پہلگام بازار سے تھوڑا آگے تھا۔ جگہ کا نام ان کو معلوم نہیں تھا۔ دیر سے یہاں پہنچے تھے اس لئے پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ کہاں پہ ٹھہرائے گئے تھے۔ لیکن ابھی جو انجلی ہوٹل کی بالکونی سے باہر کا نظارہ دیکھنے لگی تو اسے اس جگہ سے محبت سی ہونے لگی تھی۔۔۔ یہ بالکونی ہوٹل کے پچھلی طرف تھی۔ بالکونی کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ تھا، جس میں رنگا رنگ قسم کے پھول کھلے تھے۔۔۔ اردگرد پورا جنگل تھا۔ اونچے اونچے دیودار اور لیدر کے کنارے قسم قسم کے پیڑ پودے تھے جو پھولوں سے لدھے پھندے تھے۔۔۔ پھر لیدر کا اچھلتا پانی جو بڑی تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ لیدر میں پڑے بڑے بڑے

پتھروں سے ٹکراتا ہوا اچھل اچھل کر آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اچھلتا پانی سورج کی روشنی میں جگمگا رہا تھا اور پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ یہ پانی کے موتی ہوا میں تیرتے ہوئے پھر لیدر کے پانی سے ٹکراتے تھے لیکن پانی کی سطح سے ٹکراتے ایسا لگتا تھا جیسے موتی پانی کی سطح پر دور دور تک بکھرتے چلے جا رہے ہوں۔ انجلی کو یہ منظر بہت ہی خوبصورت اور پیارا لگ رہا تھا۔ وہ دوڑ کر پانی کی سطح سے قطروں کے موتی چن لینا چاہتی تھی اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھنے کے لئے بے قرار تھی۔ وہ ابھی اس منظر میں کھوئی ہی تھی کے لیدر کے کنارے کنارے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ جاتے دیکھ لیا۔ انجلی چھوٹے چھوٹے میمنے دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک چھوٹی سی خواہش نے جنم لیا۔ کاش یہ بھیڑ بکریاں تھوڑی دیر کے لئے یہاں رک جاتے۔ قدرت نے جیسے اس کی سن لی۔ بھیڑوں بکریوں کے پیچھے ایک خوبصورت لڑکا آ رہا تھا اور ایک چھوٹا سا پیارا سا میمنہ اس کی گود میں تھا۔ اس نے گود سے میمنے کو اتار دیا اور بھیڑوں کو یہاں کی گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ خود ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ انجلی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ کلرفل ڈھیلے ڈھالے کپڑے۔ شانوں تک لمبے گھنگریالے بال جو بل کھاتے اس کی لمبی گردن پر جھول رہے تھے۔۔۔ اس نے چہرے پر آتی بالوں کی ایک نٹ کھٹ لٹ کو بڑی ادا سے ایک طرف کر دیا اور شوق نظروں سے اپنے اردگرد کو دیکھنے لگا۔۔۔ اس کی نظریں پیڑ پودوں سے ہوتے ہوئے بالکونی کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہی تھیں اور انجلی کی سانس رک گئی تھی۔ لیکن لڑکے کی نگاہیں بالکونی میں اٹکنے سے پہلے ہی ایک میمنہ کود کر لڑکے کی گود میں چڑھ گیا۔ لڑکے نے پچکار کر میمنے کو نیچے اتار دیا اور اپنے تھیلے سے بانسری نکالی۔ بانسری کو بڑے پیار سے دیکھا۔ اپنی رنگین قمیض سے رگڑ رگڑ کر چمکایا اور پھونک مار کر ہونٹوں سے لگا دیا۔۔ بانسری سے نکلی دھن اور لیدر کے بہتے پانی کی چھن

چھن سے جوسنگیت ابھر کر آ رہا تھا، اسے فضا جیسے مست مست ہوگئی تھی ۔۔۔ پیڑوں کے پتے جیسے تال دینے لگے تھے یا وہ فضا کی مستی میں ڈوب کر جھوم جھوم رہے تھے۔ انجلی چاہتی تھی کہ وہ اڑ کر جائے اور اس لڑکے کے سامنے بیٹھ کر اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھتی جائے۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ جب تک وہ کمرے میں جائے۔ کپڑے بدل دے۔ پھر ہوٹل سے نکل کر پیچھے یہاں لیدر کے کنارے پہنچ جائے تب تک کہیں یہ لڑکا بھیڑ بکریاں لے کر آگے نہ چلا جائے اور وہ اتنا خوبصورت موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ دل کہہ رہا تھا کہ اس لڑکے سے ملنا ہے۔ وہ بڑی بے صبری سے کمرے کے اندر گئی۔ جلدی میں کپڑے بدل دیئے۔ بڑی عجلت میں ہوٹل سے باہر آئی اور لگ بھگ دوڑتے ہوئے ہوٹل کی پچھلی طرف پہنچ گئی۔ لیدر کی طرف نگاہ ڈالی۔ لڑکا ابھی اسی پتھر پر بیٹھا تھا اور اپنی دھن میں بانسری بجا رہا تھا۔ اب انجلی کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ وہ جلد سے جلد لڑکے تک پہنچ جانا چاہتی تھی اور آخر وہ وہاں پہنچ بھی گئی۔۔۔ جس پتھر پر بیٹھا لڑکا اپنی آنکھیں بند کئے بانسری بجا رہا تھا وہ سائز میں بہت بڑا اور لمبا چوڑا تھا۔ انجلی نے ایک طرف پتھر کے ساتھ اپنی کمر ٹکا دی اور اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ ہوا میں ابھی خنکی تھی شاید لیدر کے اچھلتے بہاؤ سے بھی ہوا میں کچھ نمی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن انجلی کے ہاتھوں میں پھر بھی پسینہ آ رہا تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ کب بانسری کی دھن رک گئی اور کب وہ لڑکا پتھر سے اتر کر سامنے کھڑا اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ انجلی نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور پیچھے مڑ کر پتھر کی طرف دیکھنے لگی جہاں کچھ دیر پہلے وہ لڑکا بانسری بجا رہا تھا۔ وہ جگہ اب خالی تھی اور انجلی حیران ہو رہی تھی کہ یہ لڑکا جو ابھی میرے سامنے بانسری بجا رہا تھا، کہاں گیا۔ انجلی حیران و پریشان اپنے آس پاس اور پھر دور دور تک دیکھنے لگی کہ اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

''میں یہاں ہوں۔'' انجلی جلدی سے پیچھے مڑی تو سامنے لڑکے کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی اور اسے ایک ٹک دیکھنے لگی۔ انجلی لڑکے کو دیکھ کے حیران ہو رہی تھی جیسے اس نے آج سے پہلے اتنا خوبصورت اور وجیہہ لڑکا دیکھا ہی نہ ہو۔۔۔ یا شاید اس نے آج تک شہروں میں صرف فیشن زدہ اور ہیلو ہائے کرنے والے لڑکے ہی دیکھے تھے اور اتنا وجیہہ لیکن معصوم چہرے والا، اس طرح کا بانکا گورا لڑکا نہیں دیکھا تھا۔ وہ ابھی اس بھولے بھالے پیکر میں کھوئی ہی تھی کہ لڑکے کی آواز پھر اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

''کون ہیں آپ ۔۔۔ آکاش کی اپسرا یا لیدر کی جل پری ۔۔۔ میں نے ماں سے کئی بار سنا ہے۔ اپنے گاؤں سے باہر مت جانا وہاں جگہ جگہ وَن پریاں ہوتی ہیں جو لڑکوں پر جادو کرتی ہیں۔ کبھی کبھی آسمان سے آکاش کی اپسرائیں بھی اتر آتی ہیں اور کبھی لیدر سے جل پریاں نکل آتی ہیں ۔۔۔ آپ کون سی والی پری ہو۔۔۔ انجلی کے چہرے پر پہلے ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ ٹھاہ ٹھاہ کرز ورز ور سے ہنسنے لگی۔ اور لڑکا حیران و پریشان اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔۔۔

''دیکھئے میں ۔۔۔ میں ادھر پاس میں ۔۔۔ پاس کے گاؤں میں رہتا ہوں ۔۔۔ دیکھئے میں نے کچھ نہیں کیا ۔۔۔ میں پہلی بار اس طرف آیا ہوں ۔۔۔ میں جاتا ہوں ۔۔۔ میں جاتا ہوں ۔۔۔ پھر کبھی نہیں آؤں گا۔'' انجلی مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ وہ پیچھے کی طرف مڑ گیا اور جانے لگا۔ انجلی نے جلدی لیکن تیز آواز میں کہا۔

''رک جاؤ۔۔۔'' لڑکے کے پیر جیسے دلدل میں دھنس گئے اور وہ بنا پیچھے دیکھے ایک ہی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ انجلی کو کچھ شرارت سوجھی اور وہ اس کے سامنے

آ کر بھولی۔۔۔

''ذرا میری آنکھوں میں دیکھو'' لڑکے نے زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''آنکھیں کیوں بند کر لیں''۔

''ماں نے کہا ہے کہ اگر کبھی سامنے کوئی وَن پری آ جائے تو اس کی آنکھوں میں مت دیکھنا۔سختی سے اپنی آنکھیں بند رکھنا''۔

''کیوں؟ ایسا کیوں بولی وہ''۔

''ماں نے کہا ہے کہ اگر تم وَن پری کی آنکھوں میں دیکھو گے تو وہ تمہارا دل نکال لے گی'' لڑکے نے آنکھیں بند رکھے ہوئے ہی کہا۔

''لیکن تم نے تو میری آنکھوں میں دیکھے بنا ہی میرا دل نکال لیا ہے۔یہ دیکھ میرا سینہ دل سے خالی ہو گیا ہے۔''لڑکے نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور حیرانگی کے ساتھ انجلی کے چہرے کو دیکھنے لگا جو اس کے بہت قریب کھڑی تھی اور دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔وہ انجلی کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔اسے کچھ نشہ سا ہو رہا تھا۔اس کی آنکھیں مسحور کن خوشبو سے بند ہونے لگیں اور اس کا شک یقین میں بدل رہا تھا کہ اس وَن پری کا جادو اس پر دھیرے دھیرے اثر کر رہا ہے۔اس نے سر کو جھٹک دیا اور دونوں ہاتھوں سے انجلی کو زور سے دھکا دے دیا جو پیچھے درخت سے ٹکرائی اور نیچے گرنے سے بال بال بچ گئی۔نیچے گرتی تو کسی پتھر سے ٹکرا جاتی اور اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال پائی تھی لیکن تب تک وہ لڑکا دوڑ کر کہیں غائب ہو چکا تھا۔۔۔

انجلی نے سنبھل کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔اس پر ابھی بھی وحشت طاری تھی لیکن اس کی نگاہیں پھر بھی لڑکے کو تلاش کر رہی تھی ۔۔۔اس وحشت میں بھی اس کے ہونٹوں پر پھر سے مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔۔۔بھیڑ بکریاں دور تک پھیل چکی تھیں اور

لڑکے کا کہیں دور دور تک سایہ بھی نہ تھا۔۔۔

'' دیکھو میں جانتی ہوں تم یہی کہیں کسی پتھر کے پاس یا کسی پیڑ کے پیچھے چھپے بیٹھے ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں ابھی پکڑ لوں لیکن مجھے اس وقت دیر ہو رہی ہے۔ میرے ممی ڈیڈی پریشان ہوں گے۔ اس لئے اس وقت جا رہی ہوں لیکن میں تم سے پھر ملنے آؤں گی۔ چاہئے تم کہیں بھی جاؤ۔۔۔'' پھر زور سے ہنستے ہوئے بولی۔۔۔

''اور سنو میں کوئی آکاش کی اپسرا یا جل پری نہیں ہوں۔ نہ کوئی وَن پری ہوں۔۔۔ ممبئی کی لڑکی ہوں اور یہاں گھومنے آئی ہوں۔۔۔ یہاں پاس والے ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔۔۔ اور ہاں میرا نام انجلی ہے۔۔۔ تیرا نام کیا ہے۔۔۔ بس اپنا نام بتاؤ اور میں چلی جاؤں گی۔۔۔ دیکھو جلدی سے نام بتاؤ۔ نہیں تو میں تمہیں ابھی پکڑ لوں گی۔۔۔''

''عرفان۔۔۔''

''آہاہاہا!!۔۔۔ کیا نام ہے۔۔۔ عرفان ۔۔۔ اس کا کیا مطلب ہے۔''

''وہ مجھے نہیں پتہ۔۔۔ بس میرا نام عرفان ہے۔۔۔''

''اچھا میرے عرفان۔۔۔ ہاہاہا!!'' انجلی پھر زور سے ہنسی۔

'' دیکھو میں نے اب بتا دیا ہے کہ میں کوئی پری وری نہیں ہوں۔۔۔ بس ایک لڑکی ہوں۔ اب ایک بار، صرف ایک بار میرے سامنے آجاؤ تو میں چلی جاؤں گی۔''

''پہلے سچ سچ بتاؤ۔ تم کوئی وَن پری نہیں ہو۔ تم میرا دل تو نہیں نکالو گی۔''

انجلی پھر زور سے ہنسی اور اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ سچ میں کسی بھولے بھالے معصوم لڑکے سے ٹکرائی ہے۔ اسے کئی شرارتیں سوجھی لیکن اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا ڈیڈی یا بھائی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں نہ پہنچ جائے۔۔۔

''اچھا ایک بار سامنے آجاؤ جلدی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔'' لیکن یہ کہتے ہی انجلی آہستہ آہستہ اس پتھر کی طرف بڑھنے لگی جس کے پیچھے سے عرفان کی آواز آرہی تھی اور انجلی کو پتہ چل چکا تھا کہ وہ اسی پتھر کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے۔ پتھر کے ساتھ چلتے چلتے وہ عرفان کے قریب پہنچ گئی۔ عرفان کا چہرہ دوسری طرف تھا جہاں کچھ دیر پہلے انجلی کھڑی تھی۔ شاید وہ فیصلہ کرنے کی سوچ میں تھا کہ انجلی کے سامنے جائے یا نہ جائے۔ انجلی اس کے برابر میں کھڑی ہوگئی اور اسے ایک بڑا مذاق سوجھا۔ مذاق کیا اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ عرفان کے کندھے پر رکھا۔ عرفان نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ انجلی کو اتنا قریب دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ اسے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا۔ انجلی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیا اور اپنے دونوں ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ عرفان تھوڑی دیر تڑپتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ پُرسکون ہوگیا۔ اب اس کا ایک ہاتھ انجلی کی کمر پر آ گیا اور دوسرا اس کے کندھے سے ہوتا ہوا شانوں پر آ گیا۔ اور بڑی مضبوطی کے ساتھ انجلی کو اپنے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ انجلی کے دونوں بازو ہار بن کر عرفان کے گلے میں آ گئے۔۔۔ پھر نہ جانے کتنے لمحے بیت گئے۔ یا ایک دن۔۔۔ یا کئی مہینے۔۔۔ سال کہ صدیاں بیت گئیں۔۔۔ اچانک انجلی کو لگا کہ کوئی آہنی شکنجہ اس کے بدن کو مضبوطی سے کسنے لگا ہے۔ میٹھا میٹھا سا نشہ اس میں سرائیت کرنے لگا اور اس کا سارا بدن چاہنے لگا کہ اسے اور زور سے کسا جائے۔ اتنا کسا جائے کہ یہ ٹوٹ ٹوٹ کے گرتا جائے اور بکھرتا جائے۔۔۔ کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک بجلی سی کوند گئی اور وہ چلائی۔۔۔

''نہیں کام دیو۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔'' اور وہ تیزی کے ساتھ عرفان کی بانہوں سے نکل گئی۔ پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ پھر جب تھوڑی بہت سنبھل گئی تو اپنی دائیں طرف دیکھا۔ عرفان بھی اسی کی طرح پتھر سے

کمر ٹکائے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔اس کا سر آسمان کی طرف اٹھا تھا۔لیکن آنکھیں بند تھی۔اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو چکا تھا۔انجلی کے ہونٹوں پر پھر سے مسکراہٹ لوٹ آئی۔وہ ایک بار پھر عرفان کے رسیلے ہونٹ چومنا چاہتی تھی۔۔۔لیکن اب کے اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور اس نے ایک مضبوط فیصلہ کر لیا۔وہ ہوٹل کی طرف بھاگنے لگی۔۔۔۔۔جاتے جاتے زور سے چلائی۔

''کل صبح پھر آنا میں یہیں انتظار کروں گی۔'' عرفان جلدی سے اس طرف مڑا اور زور زور سے چلایا

''پری۔۔۔وَن پری۔۔۔اووو جل پری'' لیکن انجلی نے شاید لیدر کے پانی کے شور میں کچھ بھی نہیں سنا۔صرف ہوٹل کے قریب پہنچ کر اس نے پیچھے دیکھا۔ عرفان اسے دیکھ رہا تھا۔انجلی نے اس کی طرف ایک اڑتا ہوا بوسہ اچھال دیا جس کو پکڑنے اور واپسی بوسہ اچھالنے کا علم عرفان کے پاس نہیں تھا۔وہ بس ہاتھ ہلاتا رہ گیا۔۔۔پھر جتنے دن انجلی پہلگام میں رہی وہ روز عرفان سے ملتی رہی اور اسے اپنی محبت سے اپنا بنانے میں کامیاب رہی۔اس نے وہ راستہ بھی دیکھ لیا جو پوش ون وادی کو جاتا تھا۔عرفان کو اب صبح جلدی آنے اور انجلی کا بوسہ لینے کا چسکا پڑ چکا تھا۔یہ نشہ اسے ساری ساری رات سونے نہیں دیتا تھا اور یہ آدھی رات کو ہی لوگوں کے گھروں سے بھیڑ بکریاں نکال کر مشکل ترین راستہ پار کرتے آٹھ ناڈین پہنچ جاتا تھا۔

وہ جو کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔تیسری صبح انجلی کی ماں دونوں کے بیچ آ گئی اور ایک زوردار تھپڑ عرفان کے گال پر مارا اور انجلی کو گھسیٹ کر ہوٹل لے آئی۔ہوٹل میں ہنگامہ کیا۔اس کا بھائی اور باپ باہر آ گئے۔ہوٹل مالکان کے لاکھ سمجھانے کے باوجود انہوں نے عرفان کو خوب مارا اور بعد میں اس کو پولیس کے حوالے کر دیا۔تھانے میں عرفان کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔پولیس نے

اس کو اسپتال شفٹ کیا اور بات عرفان کے گاؤں تک پہنچ گئی تو سارا گاؤں امنڈ آیا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے عرفان کو سرینگر اسپتال شفٹ کر دیا گیا۔ عرفان کی ماں اور اس کا دادا بانصیر بھی اس کے ساتھ سرینگر پہنچا کر حالات قابو میں لائے گئے۔

انجلی نے رو رو کر اپنا برا حال کر دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر عرفان کا خون سے تر چہرہ یاد آ رہا تھا۔ وہ بے قصور ناحق ہی اس کے بھائی اور باپ کے غصے کا شکار ہو گیا تھا۔ اب اسے یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ عرفان کس اسپتال میں ہے۔ دوسری طرف اس کے باپ نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ ان کی مداخلت سے وہ کشمیر سے نکل گئے اور ممبئی پہنچ گئے۔۔۔

ممبئی آتے ہی انجلی کی ماں نے اسے دھمکی دی کہ وہ کہیں بھی اور کسی سے بھی اس واقعے کا ذکر نہ کرے۔ وہ خاموش ہو گئی اور اپنے باپ کی طاقت کو بھی سمجھ گئی تھی۔ اگلے روز سے وہ معمول کے مطابق کالج جانے لگی۔ گھر کا ماحول پٹری پر واپس آ رہا تھا۔ بس بات معمولی سی ہو گئی تھی کہ انجلی کا چنچل پن کہیں کھو گیا تھا۔

☆☆☆

عرفان کافی دن سرینگر کے اسپتال میں رہا۔۔ پھر اسے گھر لایا گیا۔ یہاں سب اس کے منتظر تھے۔ گاؤں کے سبھی لوگ اسے صبح وشام دیکھنے آتے تھے جن میں لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکیوں کے ساتھ سارہ بھی ایک دو بار آ گئی تھی لیکن حنا بار بار آ رہی تھی۔ وہ کوئی بات نہیں کرتی تھی بس دو چار منٹ عرفان کو دیکھتی اور گھر چلی جاتی تھی۔ عرفان نے کئی بار محسوس کیا کہ حنا اسے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن گھر میں کوئی نہ کوئی رہنے کی وجہ سے وہ بس اسے دیکھ کے لوٹ جاتی تھی۔ عرفان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر حنا اسے کیا کہنا چاہتی ہے۔ کہاں حنا اسے دیکھتے ہی ناک بھنویں چڑھاتی تھی اور اس

کی ہر بات پر اسے ٹوکتی رہتی تھی اور کہاں اب وہ اسے دیکھنے کے لئے دن میں دس بار آجاتی تھی ۔۔۔کبھی کبھی عرفان کی ماں مہمانوں کے لئے قہوہ بناتی تو حنا اسے روٹی بنانے میں مدد کرتی یا مہمانوں کو خود چائے پلاتی ۔عرفان کو لگ رہا تھا کہ حنا میں کافی تبدیلی آئی ہے۔لیکن اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔اسے عرفان بے خبر تھا۔

اسپتال سے گھر آنے کے بعد بھی عرفان کو ٹھیک ہونے میں وقت لگا۔خون بہنے سے وہ بہت زیادہ کمزور ہو گیا تھا۔لیکن اس کے چہرے پر اب بھی شادابی موجود تھی۔وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ایک دن عرفان گھر سے باہر آ گیا تھا۔ اس کی ماں اور دادی اس کے ساتھ جا رہی تھیں۔دادی عرفان کا ہاتھ پکڑے چل رہی تھی کہ سامنے سے پھر حنا آ گئی۔

''اووو دادی۔چاچی۔کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ۔''

''ارے آؤ حنا بیٹی ۔ یہ عرفان صبح سے ضد کر رہا تھا کہ جھیل کے کنارے جائے۔اب ہم اس کو اکیلے کہاں جانے دیتے۔جب میں ساتھ جانے لگی تو اب کہہ رہا ہے جھیل پر نہیں اپنے دادا کے پاس پن چکی پر جائے گا۔اس کی ماں بھی گھر میں اکیلی تھی۔میں نے اسے کہا چل تو بھی چل، ساتھ میں چلیں گے۔یہ بھی کہاں تب سے باہر نکلی جب سے عرفان اسپتال سے آیا ہے۔۔۔تمہیں کوئی کام تو نہیں۔''

''ارے نہیں دادی۔مجھے کوئی کام وام نہیں ہے۔میں تو چاچی کے پاس ہی آرہی تھی کہ یہاں کوئی کام ہو تو کردوں گی۔'' حنا چور نظروں سے عرفان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''تو حنا بیٹی پھر تم بھی آؤ نا ہمارے ساتھ۔دادا جی کو دیکھنے سے عرفان کو بھی اچھا لگے گا'' عرفان کی ماں نے کہا۔

''ہاں ہاں چاچی میں بھی آرہی ہوں آپ کے ساتھ۔لائیے دادی میں

عرفان کا ہاتھ پکڑتی ہوں۔'' وہ عرفان کا ہاتھ پکڑنے آجاتی ہے۔

''نہیں دادی کا ہاتھ رہنے دو۔'' عرفان نے کہا تو حنا نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ لیکن اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا۔

''ارے تو آجا بیٹی۔ پکڑ اس کا ہاتھ۔ میں بوڑھی کب تک اس کا ہاتھ پکڑ کر چلاتی رہوں۔ اس پر یہ آبڑکھا بڑ راستہ۔''

''دادی میں ایسے بھی چل سکتا ہوں۔ چل کیا میں تو اپنے ان راستوں پر آنکھیں بند کر کے دوڑ سکتا ہوں''

''ہاں ہاں مجھے پتہ ہے۔ تم چندن واڑی کیا شیش ناگ تک دوڑ لگا سکتے ہو۔ تم تو میرے گبرو بیٹے ہو۔''

باتیں کرتے کرتے یہ سب پن چکی کے قریب پہنچے۔ بابا نصیر چکی کے باہر حقہ پی رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور بھی دو تین لوگ بیٹھے تھے۔

''آ میرا پُتر ۔۔۔ میرا پٹھان'' بابا نصیر جلدی سے اٹھا اور عرفان کو گلے لگایا۔ باقی لوگ جو اس کے ساتھ وہاں بیٹھے تھے انہوں نے بھی عرفان کو ٹھیک ہونے پر مبارک باد دے دی۔

''آ بیٹا، آ۔ اس پتھر پہ بیٹھ جا''۔

''نا دادا ۔۔۔ میں بیٹھوں گا نہیں۔ تھوڑا ادھر تک چلتا رہوں۔ جھیل تک جاؤں گا۔''

''نا پترا ابھی نا جا۔ ابھی ٹھیک ہو جا۔ پھر تو روز جانا ہے۔'' ماں نے مسکرا کر کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ تھوڑی سی تشویش بھی تھی۔

''تم تو کہہ رہے تھے بس دادا کی چکی تک ہی جائیں گے۔'' دادی نے کہا۔

''اب میں ٹھیک ہوں ماں۔ دادی بس وہاں تک''۔

''ہے جانے دے میرے پتر کو۔ اسے ان راستوں سے کیا ڈر۔ جا پتر جا۔ ہاں لیکن ماں کو ساتھ لے کر جا''۔

''اس کی ماں ہی تھوڑی اکیلی جائے گی۔ ہم سبھی ساتھ جا رہے ہیں۔''

''او ہو دادی۔ تم کہاں جاؤ گی''

''جائیں گے تو سبھی جائیں گے۔۔۔ نہیں تو تم بھی نہیں جاؤ گے۔''

''لے جا بیٹا۔ اپنی ضدی دادی کو بھی لے جا۔ اس نے آج تک میری نہیں سنی۔ تیری کیا سنے گی۔ لے جا'' سبھی ہنستے ہنستے نیچے پوش وَن وادی میں اترنے لگے۔۔ حنا بھی ساتھ جا رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی امرناتھ یاترا تک عرفان مکمل صحت مند ہو چکا تھا اور اس کا من کر رہا تھا کہ وہ بھی گاؤں کے دوسرے مزدوروں کے ساتھ امرناتھ گپھا تک جائے۔ آج اس نے پھر بابا نصیر سے کہا کہ وہ اب گاؤں والوں کی بھیڑ بکریاں نہیں چرائے گا۔ وہ بھی دوسرے مرد لوگوں کے ساتھ پہلگام یا چندن واڑی جائے گا۔ جہاں وہ اور لوگوں کی طرح مزدوری کرے گا اور اپنے گھر کے لئے پیسے کما کر لائے گا۔ لیکن بابا نصیر نے پھر سختی کے ساتھ منع کیا۔

''نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔ تم کو اوروں کی طرح مزدوری نہیں کرنی ہے۔''

''دادا مجھے جانا ہے۔ آخر کب تک گھر بیٹھا رہوں گا۔ میں بھی کچھ کما کر لاؤں۔''

''کیا تو گھر بیٹھے نہیں کما رہا ہے۔ کس چیز کی کمی ہے ہمارے پاس۔ سب کچھ تو ہے ہمارے پاس'' دادا نے آنکھیں دکھا کر کہا۔

''بیٹا عرفان، دادا سچ ہی تو کہہ رہا ہے۔ ابھی تم اتنے بڑے کہاں ہو گئے ہو

جو تمہیں گھر چلانا ہے۔ بابا دیکھ رہے ہیں ناسب اور ویسے بھی تم ابھی بہت کمزور ہو۔ یہ سال رک جا۔ اگلے سال سے جو مرضی وہ کر لینا''۔

ماں نے منت سماجت کی۔۔۔ دادی نے بھی بہت سمجھایا۔ دادا نے تو بالکل بھی نہیں مانا لیکن عرفان روٹھ گیا۔ اس نے دو دن کچھ بھی نہیں کھایا۔ ماں اور دادی کو کئی بار ہاتھ جوڑے لیکن جب وہ بھی نہ مانیں تو اگلی صبح کسی کو بنا کچھ بتائے گھر سے نکل گیا۔ بس اس کے پاس ایک تھیلا تھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے نہ لوگوں کے گھروں سے بھیڑ بکریاں نکالی اور نہ ہی وہ پوش وَن وادی کی طرف گیا۔ اس نے سیدھا وہ ٹیڑھا میڑھا راستہ چنا جو بڑا کٹھن تھا لیکن اس کا دیکھا بھالا تھا۔ اس نے اٹھ کھیلیاں کرتے کرتے یہ مشکل راستہ پار کیا اور آٹھ ناڈین کی سڑک پر پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش تھا اور مسکراتے ہوئے ایک نظر اس راستے کو دیکھا جس سے اتر کر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ پھر بڑی احتیاط کے ساتھ سڑک کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اسے کہاں پہنچنا ہے، وہ تو بس چلتا جا رہا تھا۔۔۔ جب وہ بے تاب ویلی کے قریب پہنچا تو اس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں لوگوں کی بھاری بھیڑ لگی تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس بچے، جوان، مرد، عورتیں ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ یہاں بازار سا لگا تھا۔ اسے یہ منظر بہت اچھا لگا اور وہ بھی اس بھیڑ کی طرف چلنے لگا۔ لیکن یہاں اسے اندر نہیں جانے دیا گیا۔ اسے اندر جانے کے لئے پیسے مانگے گئے جو اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ شدت سے بھوک اور پیاس محسوس کر رہا تھا۔ جب کوشش کے باوجود بھی اسے اندر نہیں جانے دیا گیا اور دھتکار کر گیٹ سے ہٹا دیا گیا تو وہ گیٹ سے دور پانی کی چھوٹی سی ندی کے کنارے آیا۔ ندی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ لیکن وہ بنا ڈرے پانی میں اتر گیا۔ صاف وشفاف پانی سے منہ ہاتھ دھو لئے اور خوب پانی پیا۔ اچانک بہت زور سے شور وغل مچا ۔اس نے دیکھا

بہت سارے مرد وزن بے تاب ویلی کے مین گیٹ کے طرف دوڑے آرہے تھے۔وہ بچاؤ بچاؤ چلا رہے تھے۔عرفان نے دیکھا کہ کوئی پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور وہ ڈوبتے ہوئے ندی کی گہرائی میں جارہا تھا۔عرفان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔اس نے ندی کی گہرائی میں چھلانگ لگا دی اور بڑے آرام کے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی کو پانی سے باہر نکال لایا۔لوگ لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہے تھے۔وہ ہوش میں آگئی تو لوگوں کی توجہ عرفان کی طرف گئی جس کے سارے کپڑے بھیگ چکے تھے۔سب ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔پھر کسی نے کچھ پیسے نکال کر اسے دینے کی کوشش کی تو اس نے انکار کیا۔

''اگر روٹی مل جاتی تو۔۔۔۔'' اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''ارے روٹی کیا۔ہم آپ کو پورا کھانا کھلائیں گے۔۔۔آؤ۔۔۔آپ آؤ ہمارے ساتھ''۔

''نہیں۔۔۔وہ مجھے اندر نہیں جانے دیں گے''

''ارے کون نہیں جانے گا۔آپ آؤ ہمارے ساتھ۔''

''ارے بیٹا آپ آؤنا۔ پہلے میں نے تم کو اس لئے روکا تھا کہ وہ میری ڈیوٹی تھی۔میں بنا ٹکٹ کے کسی کو اندر نہیں جانے دے سکتا لیکن اب جو تم نے کام کیا ہے اسکے بدلے میں اپنی جیب سے ٹکٹ کاٹ سکتا ہوں'' گیٹ کیپر نے عرفان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ایک عورت نے عرفان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''اس نے میری بیٹی کی جان بچالی۔۔۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ٹکٹ کیا میں اس کے لئے اپنا سب کچھ دے دوں ۔۔۔آجاؤ بیٹا آپ کو بھوک لگی ہے۔۔۔ پہلے میں آپ کو کھانا کھلاتی ہوں۔'' تب تک وہ بچی بھی حالات کو سمجھ چکی تھی جو پانی میں گر گئی

تھی ۔اس نے عرفان کی قمیض کا دامن پکڑ لیا اور بڑے پیار سے عرفان کی طرف دیکھا۔

''آجاؤ بھیا۔تھینک یوآپ نے میری جان بچائی۔''

''اچھا آپ سبھی لوگ جایئے۔اب کسی کی بھی ٹکٹ نہیں کٹے گی۔''

سبھی لوگ بے تاب ویلی میں آ گئے ۔انہوں نے عرفان کو پیٹ بھر کر وازوان کھلایا۔ پہننے کے لئے ایک جیکٹ بھی دے دی ۔ جب ان کو پتہ چلا کہ یہ پہلگام کی طرف جارہاہےتو وہ اسے پہلگام تک اپنی گاڑی میں لے کرآئے اور یہاں مجبور کر کے اسے کچھ پیسے بھی تھما دیئے اور خود سرینگر کی طرف چلے گئے ۔۔۔عرفان پہلی بار پہلگام آیا تھا۔ یہاں کی رونقیں اور بازار کی چکا چوند دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی بھیڑ جارہی تھی۔سامنے اونچی اونچی عمارتیں تھیں جن کے ماتھے پر بڑے بڑے ہوٹلوں کے سائن بورڈ چسپان تھے۔ان کے نیچے بڑی بڑی دکانیں تھیں جن میں زرق برق کرتی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔دکانیں کشمیری ہینڈی کرافٹ، کشمیری ڈرائی فروٹ، کشمیروڈورک اورنادرزیورات سے بھری پڑی تھیں۔عرفان اپنے کشمیر کا یہ رنگ دیکھ کر بہت زیادہ جذباتی ہورہا تھا۔اس نے سارابازار چھان مارالیکن اس کا دل پھر بھی نہ بھرا۔وہ تب ٹھٹھک گیا جب سورج ڈھل رہا تھااور سڑکوں کی روشنیاں جاگ اٹھی تھیں۔اب شام ہورہی تھی،اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔بس اسے ایک ہی فکر لگی تھی کہ وہ کسی طرح اپنے گاؤں کے لوگوں سے ملے ۔اس نے مزدور لوگوں سے پوچھنا شروع کیا۔ چند مزدوروں سے معلوم کر کے یہ اپنے گاؤں کے لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔سب بہت خوش ہوگئے ۔رات کو اسے اپنے ڈیرے پر لے کرآئے ۔اسے اپنے گھروں کا حال پوچھتے رہے۔لیکن جب ان کو یہ پتہ چلا کہ عرفان گھر سے بھاگ آیا

ہے تو وہ بہت پریشان ہوگئے۔ انہیں اس کی ماں زلیخا اور بابا نصیر کی فکر ہونے لگی۔ انہوں نے عرفان کو گھر جانے کے لئے زور دیا لیکن وہ نہیں مانا۔ ادھر امرناتھ یاترا بھی ایک دو دنوں میں شروع ہونے والی تھی۔ وہ گاؤں بھی نہیں جا سکتے تھے۔ آخر انہوں نے اپنے ایک ساتھی غلاما (غلام خان) کو تیار کیا کہ وہ صبح گاؤں جائے وہاں بابا نصیر کو مطلع کرے اور اسے یقین دلا دے کہ عرفان ان کے ساتھ ہے اور یہ سبھی امرناتھ یاترا کے بعد عرفان کو اپنے ساتھ ہی واپس گھر لائیں گے۔ دوسری صبح وہ آدمی گاؤں گیا اور ایک دن کے بعد جب یہ سب لوگ چندن واڑی پہنچے تو غلاما بھی یہاں آ کر ان سے مل گیا۔ اس نے عرفان کے دادا بابا نصیر، دادی جان دیدا اور اس کی ماں زلیخا کا حال سنایا جنہوں نے عرفان کے غم میں دو دن تک کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا اور رو رو کر ان کا برا حال تھا۔ حال تو گاؤں والوں کا بھی اچھا نہیں تھا۔ سبھی لوگ عرفان کے اس طرح گاؤں سے جانے کی وجہ سے پریشان تھے۔ گاؤں سے مطمئن ہونے کے بعد ان لوگوں نے یاتریوں کا سامان اٹھایا۔ عرفان جو پہلی بار جا رہا تھا، اس کو بھی کچھ ہلکا پھلکا سامان دے دیا اور یاتریوں کے ساتھ یہ بڑا کارواں امرناتھ گپھا کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

گریجویشن کا آخری سال انجلی نے اچھے نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔۔۔ اس کے ماں باپ خوش تھے۔ دوستوں رشتہ داروں کے لئے ایک میگا پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ یہ پروگرام انجلی کی کامیابی کی خوشی کے اظہار میں کم تھا۔ اس کی خوبصورتی کی نمائش کا پروگرام زیادہ تھا۔ اس کے ماں باپ چاہتے تھے کہ اس پارٹی میں لوگ ان کی بیٹی کو دیکھیں تاکہ انجلی کے لئے اچھا سا رشتہ مل جائے اور ایسا ہو بھی گیا تھا۔ کئی دوستوں اور رشتہ داروں کے گھروں سے انجلی کے لئے رشتے آنے لگے تھے۔ لیکن انجلی کا فیصلہ آیا تو سب ہکا بکا رہ گئے۔ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ اور پڑھنا

چاہتی تھی۔مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ ملک سے باہر جانا چاہتی تھی۔ماں نے تو ہنگامہ کھڑا کیا تھا لیکن باپ نے حوصلہ بڑھایا۔وہ بیٹی کی تعلیم سے بہت خوش تھا۔ اچھا خاصا پیسہ خرچ کر کے انجلی کا ایڈمیشن ملک سے باہر کرایا گیا۔آخر وہ دن بھی آ گیا جس دن انجلی کو باہر جانا تھا۔ائیر پورٹ تک سبھی گھر والے ساتھ تھے۔یہاں سے سبھی لوگ اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے لوٹ آئے۔ائیر پورٹ سے باہر آ کر بھی وہ اسے فون پر اپنا خیال رکھنے کی تلقین کر رہے تھے اور آخر بات کرتے کرتے اس کا فون بند ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ جہاز اوپر اٹھ کر اسے منزل کی طرف لے اڑا ہوگا۔اب انہیں پتہ تھا کہ اس کا فون پورے سولہ گھنٹے کے بعد ہی جاگ اٹھے گا۔وہ بڑی بے صبری کے ساتھ سولہ گھنٹے گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔لیکن جب سولہ گھنٹے کے بعد بھی انجلی کا فون نہیں جاگا تو انہیں تشویش ہوگئی۔۔۔پھر ایسے کتنے دن گزر گئے جن میں وہ انجلی کا نمبر چیک کرتے رہے۔انجلی کو تلاش کرتے رہے۔ویٹنگ روم سے بورڈنگ تک اور بورڈنگ سے جہاز کی طرف جانے والے چیکنگ تک کے بارے میں سارے معلومات دستیاب ہو رہے تھے۔لیکن پھر اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان کوئی بتا نہیں پا رہا تھا۔۔۔

انجلی کے گھر والے جب اسے سی آف کر کے واپس چلے گئے تو اس نے ملک سے باہر جانے کا ٹکٹ پھاڑ ڈالا اور اسے واش روم میں بہا دیا۔جہاز کے جانے کے وقت تک وہ گھر والوں کے ساتھ ہنس ہنس کر فون پر باتیں کرتی رہی۔جب جہاز کے جانے کا وقت آ گیا تو ایک دم موبائل کا سوچ آف کر دیا۔پھر بڑے سکون کے ساتھ دوسرا ٹکٹ نکالا اور آرام کے ساتھ ڈومیسٹک فلائٹ میں بیٹھ گئی۔

عرفان اپنے ساتھیوں کے ساتھ امرناتھ جانے والے راستے پر آگے بڑھ رہا تھا۔اس کے کندھے پر ایک سوٹ کیس تھا۔اس کے ساتھی مزدوروں کے کندھوں

پر بھی یاتریوں کا سامان تھا۔ پارٹی میں کچھ خواتین اور مرد گھوڑوں پر سوار تھے اور ہر گھوڑے کے ساتھ ایک ایک گھوڑا بان بھی تھا جو گھوڑے کو لگام سے پکڑ کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ یاتریوں کے ساتھ ایک بزرگ خاتون بھی تھی جو ایک پالکی میں بیٹھی تھی اور ڈولی کی طرح چار کہار پالکی کو کندھوں پر اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے تا کہ بزرگ خاتون کو کوئی تکلیف نہ ہو یا وہ پُر خطر راستے سے خوف نہ کھائے۔ ان کے ساتھ شری امرناتھ کی یاترا کرنے کے لئے جو پارٹی جارہی تھی، ان میں بنگال سے کوئی مسٹر راؤ آیا ہوا تھا جو کوئی بڑا آفیسر تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بڑی فیملی تھی۔ بزرگ خاتون اس کی ماں تھی۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ چار مرد تین عورتیں اور دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں چھوٹی لڑکی جس کا نام کیرتی تھا، وہ بہت پیاری اور چلبلی تھی۔ وہ سبھی مزدوروں کا نام تک جان گئی تھی۔ پارٹی بڑی تھی اس لئے ان کا ساز وسامان بھی بہت زیادہ تھا۔ یاترا اچھی طرح سے کرانے اور کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اس لئے مسٹر راؤ نے اپنے ساتھ مزدور بھی زیادہ لے رکھے تھے۔ مزدور بیچ بیچ میں جگہ بھی بدلتے رہتے تھے اور سامان بھی تا کہ کسی ایک ہی پر زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے۔ کسی پڑاؤ پر یاتری ستانے کے لئے بیٹھ جاتے تو مزدور بھی اپنے کاندھوں سے سامان اُتار کر ایک طرف رکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ جہاں پر بھی یاتری ناشتہ کرتے تھے یا کھانا کھاتے تھے، مزدور بھی اپنے ساتھ لایا کھانا کھانے بیٹھ جاتے تھے۔ عرفان کھانا کھانے کے بعد کسی الگ جگہ کسی پتھر پر بیٹھ جاتا تھا۔ اپنے جھولنے سے بانسری نکال کر کوئی میٹھی دھن چھیڑ دیتا تھا تو سارے یاتری اس کی میٹھی دھن سننے کے لئے اس کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے۔ کچھ بیٹھ جاتے تو کئی کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے۔ سبھی لوگ عرفان کے گرویدہ بنتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ شوق سے فوٹو کھچواتے تھے۔ یاترا میں شامل لوگ کوئی جلد بازی نہیں دکھا رہے تھے۔ سبھی لوگ آرام سے جا رہے تھے۔ راستے میں جو بھی

خوبصورت مقام آجاتے وہاں ڈھیرا ڈالتے۔قدرت کے نظاروں کا لطف اٹھاتے۔ فوٹوگرافی اور ویڈیوگرافی کر کے سارے نظاروں اور پھلواریوں کو اپنے کیمروں میں قید کرتے۔

آج ہلکی سی بوندا باندی کے بعد اچھی خاصی بارش شروع ہوگئی تھی اس لئے یاترا روک دی گئی تھی۔بارش سے ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔سارے لوگ خیموں میں چلے گئے اور گرم کمبل اوڑھ کر بیٹھ گئے۔مزدوروں نے کہیں سے لکڑی جمع کر کے لائی اور اپنے ٹینٹ کے سامنے آگ جلائی تھی اور اس کے گرد بیٹھ کر ہاتھ سینک رہے تھے۔عرفان کو یہ منظر اچھا لگا۔اس نے جلتے الاؤ کے سامنے بیٹھ کے بانسری نکالی اور ایک میٹھی دھن چھیڑ دی۔یاترا میں آئے لوگوں نے جب بانسری کی میٹھی دھن سنی تو ایک ایک کر کے اپنے خیموں سے باہر آتے گئے اور عرفان کے گرد جمع ہوتے گئے۔کچھ گرم جیکٹ پہنے تھے،کوئی چادر اوڑھے تھا اور کچھ لوگ کمبل سمیت باہر آگئے تھے اور عرفان کی چھیڑی دھنوں سے لطف اٹھانے لگے تھے۔آج سب یاتریوں اور مزدوروں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔عرفان یاتریوں میں بڑا مشہور ہو رہا تھا اور سبھی اس خوبصورت نوجوان کو پیار سے دیکھ رہے تھے۔زیادہ تر یاتری اس کے ساتھ فوٹو کھنچوا رہے تھے۔کوئی اسے گفٹ دے رہا تھا تو کوئی اس کا ایڈرس لے رہا تھا۔کیرتی عرفان کے ساتھ کافی گھل مل گئی تھی۔عرفان کی وجہ سے مزدوروں کی بھی عزت بڑھ گئی تھی اور وہ اسے بہت خوش تھے۔ان سب کے لئے بھی اس سال کی یاترا یادگار بن رہی تھی۔

کل شام ہلکی پھلکی بارش ہوگئی تھی اور سارے یاتری دیر رات تک عرفان کے پاس بیٹھے اس کی بانسری کے دھن کا مزا لیتے رہے۔صبح اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس لئے یہ صبح نکھری نکھری اور دھلی دھلی سی لگ رہی تھی۔سب نے پڑاؤ چھوڑ دیا۔ مزدوروں نے سامان اٹھایا اور یاترا میں شامل لوگ دوسرے پڑاؤ کی طرف بڑھنے

لگے۔ رات کی بارش کی وجہ سے راستے میں کئی جگہ پھسلن ہوگئی تھی۔ سبھی لوگ بڑی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھا رہے تھے، راستہ تنگ اور ٹیڑھا میڑھا تھا۔ عورتیں جو گھوڑوں پر بیٹھ کر سفر کر رہی تھیں، وہ بھی ڈر کے مارے گھوڑوں سے اتر گئیں اور پیدل چلنے لگیں۔ سبھی ڈرے ڈرے اور خوف زدہ تھے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ ایک غلط قدم کسی کو بھی نیچے گرا سکتا تھا اور نیچے گرنے والے کا بچنا ناممکن تھا۔ نیچے گہری کھائی تھی اور ساتھ میں ٹھاٹھیں مارتا دریا بھی بہہ رہا تھا۔ کہیں پر بڑے تو کہیں پر نوکیلے پتھر کیلوں کی طرح پہاڑی میں پیوست تھے۔ لیکن مٹی نرم اور گیلی ہونے کی وجہ سے پتھر اتنی مضبوطی سے جڑے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ اکثر معمولی بارش سے لیس دار مٹی اور پسیاں گر آتی تھیں جس میں مٹی کے تودے اپنے ساتھ بڑے بڑے پتھروں کو بھی ڈھو دیتے تھے۔ ایک جگہ جہاں پھسلن بہت زیادہ تھی، اچانک ان کی چھوٹی بیٹی کیرتی کا پاؤں پھسل گیا اور اس کی بھیانک چیخ نکل گئی۔ لیکن جب تک باقی لوگ سنبھل پاتے وہ پھسلتے پھسلتے نیچے پہنچ گئی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ اس کے کپڑے نوکیلے پتھر میں پھنس گئے اور وہ اس کے ساتھ لٹک گئی تھی۔ سبھوں کے ہوش اڑ گے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں۔ مردوں کو اسے بچانے کے لئے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ لیکن نیچے تک جانا محال تھا۔ سبھی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ گھوڑوں پر سوار لوگ بھی نیچے اتر آئے تھے۔ مزدوروں نے کندھوں سے سامان اتار دیا۔ پالکی نیچے رکھ دی گئی۔ سبھی بچی کو بچانے کی ترکیبیں بنانے لگے۔ مزدوروں نے اپنے سامان سے رسیاں نکال کر ان میں گانٹھیں لگائیں اور رسی کو لمبا کر دیا۔ اگرچہ رسی زیادہ مضبوط نہیں تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارا بھی نہیں تھا۔ کیرتی کے لئے رسی ڈال دی گئی لیکن اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ رسی کو پکڑ پاتی۔ سبھی پریشان تھے۔ کسی کو نیچے جا کر لڑکی کو بچانا تھا لیکن اس کے لئے نیچے کون جائے یہ بہت

ہی مشکل سوال تھا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔ اگر رسی کٹ جاتی تو پہلے بچانے والے ہی کی جان جاتی۔ عرفان نے ایک دم فیصلہ کرلیا اور وہ نیچے جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ سبھی مزدور اسے منع کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عرفان کو اس طرح کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ پہلی بار یاترا کے ساتھ آیا تھا اور اسے بڑی پریشانی والی بات یہ تھی کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو واپس جا کر وہ بابا نصیر کو کیا جواب دیں گے۔ لیکن عرفان بضد تھا اور اس کے سامنے ان کی ایک بھی نہ چلی۔ وہ نیچے جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ ایک بزرگ مزدور نے اسے اپنی چھڑی دے دی۔ پہاڑیاں چڑھنے کے لئے سبھی مزدوروں کے پاس چھڑیاں تو ہوتی ہی ہیں اور عرفان کے پاس بھی اپنی چھڑی تھی۔ لیکن اس سیانے مزدور کی جو چھڑی تھی وہ سرہانے پر مڑی ہوئی تھی اور اس کے نچلے حصے میں نوک دار پھل لگایا گیا تھا۔ ایسی چھڑی زمین میں پھنساتے وقت اندر تک جاتی ہے اور پہاڑ چڑھنے اور اترنے میں یہ کافی مددگار ہوتی ہے۔ مزدوروں نے رسی کا سرا ایک بڑے پتھر سے باندھا اور خود بھی رسی کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ عرفان نے دوسرا سرا اپنی کمر کے گرد لپیٹ دیا اور رسی کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا۔ چھڑی بہت کام کی تھی۔ وہ مٹی کے اندر تک جاتی تھی جس وجہ سے رسی پر دباؤ کم پڑ جاتا تھا۔ سبھی لوگ جیسے سانس روکے بیٹھے تھے۔ عرفان کیرتی کے قریب پہنچ گیا تو رسی کم پڑ گئی۔ اس کا ہاتھ بڑی مشکل سے کیرتی کو چھو رہا تھا اور ایسے میں لڑکی کو اٹھانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھی۔ ویسے بھی اس طرح سے رسی پر بوجھ ڈبل ہو جاتا اور اس کے کٹ جانے کا احتمال تھا۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے عرفان نے بہت ہی خطرناک فیصلہ کرلیا۔ اس نے چھڑی ترچھی کر کے ایک پتھر کے قریب مٹی میں گاڑ دی۔ اس پر ایک پیر ٹکا دیا۔ اب اس کی کمر میں جو رسی بندھی تھی۔ اس نے وہ کھولنی شروع کر دی تو سبھی کی جان حلق میں آ گئی۔ مزدور چلا رہے تھے۔ وہ عرفان کو ایسا کرنے سے روک رہے تھے لیکن عرفان کا

دھیان رسی کی طرف تھا۔اس نے رسی کھول کر اس کا سرا ہاتھ میں پکڑ کر کچھ حصہ کلائی پر باندھ دیا۔اب وہ رسی سے لٹک گیا تو آرام سے اس پتھر پر کھڑا ہو گیا تھا جس سے کیرتی لٹکی ہوئی تھی۔ چھڑی کو نکال کر دوسری جگہ پھنسا دیا۔اب وہ آرام کے ساتھ کیرتی کو اوپر اٹھانے لگا تھا۔پتھر پر پاؤں رکھتے ہی وہ عرفان سے لپٹ گئی اور زور زور سے روتی بھی جا رہی تھی۔عرفان نے اس کے آنسو پونچھے۔اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اسے حوصلہ دیا۔سبھی لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی لیکن اسی اثنا میں عرفان نے محسوس کیا کہ پتھر اپنی جگہ سے تھوڑا کھسک گیا تھا۔اس نے جلدی سے کیرتی کو اوپر جانے کے لئے کہہ دیا لیکن وہ اکیلی اوپر جانے سے ڈر رہی تھی۔عرفان نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا اور اسے اوپر جانے کا طریقہ بتا دیا۔اس نے اپنی کلائی سے رسی کھول دی اور اس کا سرا لڑکی کی کمر کے ساتھ باندھ دیا۔مزدور ایک بار پھر چلاتے رہے۔وہ سمجھ گئے تھے کہ عرفان نے اپنا آخری سہارا یعنی رسی کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔اب اس کی جان کو بہت زیادہ خطرہ تھا۔کیرتی آہستہ آہستہ لیکن ڈری ڈری اوپر چڑھتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ مزدور بھی رسی کو سمیٹتے جا رہے تھے۔جب وہ اوپر پہنچی تو سبھی لوگ اسے گلے مل رہے تھے۔مزدوروں نے بڑی مشکل سے انہیں راستے سے ہٹا دیا اور رسی عرفان کی طرف پھینک دی لیکن تب تک وہ پتھر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف کھسکنے لگا تھا جس پر عرفان کھڑا تھا۔عرفان رسی پکڑنے کی کوشش کرنے میں ہاتھ پیر ہلا رہا تھا لیکن اب رسی اس تک نہیں پہنچ پا رہی تھی اور پتھر اپنی جگہ چھوڑ بھی رہا تھا۔ کیرتی جو عرفان کی طرف دیکھ رہی تھی وہ جیسے ہذیانی کیفیت میں چلانے لگی۔مزدور اپنے سامان میں کچھ اور تلاش کر رہے تھے جو رسی کے ساتھ جوڑ دیا جاتا لیکن ان کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔سبھی لوگ ہاتھ مل رہے تھے۔اچانک مسٹر راؤ کو خیال آ گیا اس نے جلدی سے اٹیچی کو کھولی۔اس میں سے کئی ریشمی ساڑیاں نکالیں اور کہا ''ان کو

آپس میں باندھ دو، یہ ریشمی ساڑھیاں ہیں۔ کٹ نہیں جائیں گی۔'' مزدوروں نے جلدی جلدی ساڑھیوں کو گانٹھ لگا دی، ن کو ساتھ ساتھ جوڑ دیا اور عرفان کی طرف پھینک دیں۔ لیکن وہ ابھی یہ دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ عرفان نے ساڑھی پکڑ لی ہے کہ نہیں، اچانک وہ پتھر نیچے کی طرف کھسک گیا جس پر عرفان کھڑا تھا۔ پتھر بڑی گڑگڑاہٹ کے ساتھ نیچے گرا۔ اپنے ساتھ ڈھیر ساری پسیاں بھی گراتا چلا گیا۔ سب لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ عورتوں کی حالت زیادہ خراب تھی اور کیرتی وہ تو کود ہی گئی تھی اگر مسٹر راؤ اسے پکڑ نہ لیتے۔ کیرتی مسٹر راؤ کی بانہوں میں بے ہوش ہو کر جھول گئی تھی۔ ایک دم موت جیسی خاموشی چھا گئی۔ سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سب حیرت سے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے عرفان کھڑا تھا۔ اب نہ وہاں عرفان تھا نہ اس کے سہارے کی چھڑی اور نہ وہ پتھر جس پر ایک لمحہ پہلے وہ کھڑا تھا۔

بس ایک لمحے کے وقفے کے بعد ایک مزدور زور سے چلایا۔ ''عرفان۔۔۔ عرفان۔۔۔ زندہ ۔۔۔'' اس کے بعد اس کا گلا رندھ گیا۔ اب سب کے چہروں پر رونق لوٹ آئی تھی۔ عورتوں کی نم آنکھوں میں خوشی کے سائے لہرانے لگے تھے۔ سب لوگ آنکھیں پھاڑے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عرفان ساڑھی کو مضبوطی سے پکڑ کر اس گھڑے سے باہر آ رہا تھا جو پتھر گرنے کی وجہ سے وہاں بن گیا تھا۔ مزدوروں کی جان میں جان آ گئی۔ انہوں نے ساڑھی کے سپورٹ میں رسی کو بھی عرفان کی طرف پھینک دیا۔ عرفان نے وہ رسی پکڑ کر اپنی کمر کے گرد لپیٹ دی اور مزدور رسی اور ریشمی ساڑھی کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچتے جا رہے تھے۔۔۔ جب عرفان اوپر پہنچ گیا تو کیرتی اسے لپٹ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ لیکن سب جانتے تھے کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ غور سے دیکھا جاتا تو وہاں خوشی کی وجہ سے سبھی کی آنکھوں کے گوشے تر ہو رہے تھے۔

☆☆☆

بابا نصیر کی بیوی جان دید اچانک بیمار ہوگئی تھی۔ اسے تیز بخار ہوا تھا۔ بابا نصیر اور عرفان کی ماں زلیخا اسے لے کر پہلگام اسپتال آ گئے تھے۔ اسپتال میں دکھا کر اور دوائیاں لے کر وہ اسپتال کے باہر آ گئے تھے۔ زلیخا نے جان دید کا ایک بازو اپنے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور اپنے ہاتھ سے جان دید کی کمر کو سہارا دے کر اسے آہستہ آہستہ ایک طرف لے جا رہی تھی۔ سڑک کے کنارے چھاؤں دیکھ کر اسے وہاں بٹھا دیا اور خود ساتھ میں بیٹھ کر اپنے دوپٹے سے ساس کو ہوا دینے لگی۔ بابا نصیر دکاندار سے کچھ سامان خریدنے گیا تھا۔ زلیخا دیکھ رہی تھی کہ ایک لڑکی ان کے قریب رک گئی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی اس کا چہرہ دھوپ سے لال ہو رہا تھا اور وہ کچھ کچھ پریشان بھی لگ رہی تھی۔ زلیخا حیران ہوگئی جب اس نے سنا کہ لڑکی لوگوں سے پوش وَن وادی کے بارے میں پوچھ رہی ہے لیکن وہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ پوش وَن وادی کہاں ہے۔ زلیخا تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی۔ اس نے جب اسے کچھ کہنا چاہا تب تک وہ لڑکی آگے جا چکی تھی۔ زلیخا اپنی ساس کو چھوڑ کر اس کے پیچھے نہیں جا سکتی تھی۔ تب تک بابا نصیر بھی واپس آ گیا۔

''بابا وہ لڑکی پوش وَن وادی کے بارے میں لوگوں سے پوچھ رہی تھی۔''

''کون لڑکی۔'' بابا نصیر نے دور تک نظریں دوڑا دیں۔

''وہاں نہیں بابا۔۔ وہاں اس طرف۔ وہ لڑکی جو آسمانی رنگ کے کپڑے پہنی ہے۔۔۔ وہ بابا جوان لوگوں سے پوچھ رہی ہے''۔

''اچھا وہ۔۔۔ سنو لڑکی۔۔۔ اے لڑکی۔ نیلی والی لڑکی۔۔۔'' لڑکی نے پیچھے کی طرف دیکھا اور بابا نصیر کے قریب آ گئی۔

''کیا ڈھونڈتی ہو بیٹی۔'' بابا نصیر نے اپنی آستین سے ماتھے کا پسینہ صاف

کرتے پوچھا۔

''بابا میں پوش وَن وادی کے لئے پوچھ رہی ہوں۔لیکن یہاں کسی کو نہیں پتہ۔''

''کیا پوچھ رہی ہیں آپ۔''

''آپ بتادیں۔کیا آپ کو پتہ ہے پوش وَن وادی کہاں ہے۔''

''بیٹی میں وہیں رہتا ہوں۔لیکن آپ کو کیا کرنا ہے۔۔۔''

''بس بابا۔ مجھے وہاں تک لے چلیں۔آپ جتنا کہیں گے، میں دے دوں گی۔''لڑکی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''دینا تو کچھ نہیں ہے بیٹا۔ پر آپ وہاں کیوں جانا چاہتی ہیں۔وہاں تو کوئی بھی ٹورسٹ نہیں جاتا۔'' بابانصیر نے تشویش سے کہا۔

''بس بابا میں جانا چاہتی ہوں۔کوئی جائے یا نا جائے، میں ضرور جاؤں گی ۔۔۔آپ مجھے لے جائیں پلیز۔''لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''لیکن بیٹی وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔اور وہاں جانا بھی مشکل ہے۔وہاں تک بہت ہی کٹھن اور مشکل راستے سے جانا پڑتا ہے۔آپ اس راستے پہ نہیں چل سکتیں۔اور وہ بھی اس چپل کے ساتھ۔۔۔''

''وہ آپ فکر نا کریں۔میرے پاس جوتے بھی ہیں۔وہ پہن کر میں کچے راستے پر بھی دوڑ سکتی ہوں۔''

''لیکن آپ وہاں کیوں جانا چاہتی ہیں۔''

''بس بابا، میں وہ جگہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن ابھی ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ایک گھنٹہ کے بعد یہاں سے آٹھ ناڈین کو بس جائے گی۔''

''اس کی فکر آپ نا کریں بابا۔ہم وہاں تک ٹکسی میں جائیں گے۔''

''ٹیکسی بہت پیسہ لے گی بیٹی۔اور ویسے بھی میں اکیلا نہیں ہوں۔میرے ساتھ میری بیوی اور بہو بھی ہے۔''

''تب تو زیادہ ٹھیک رہے گا۔کہاں ہیں وہ لوگ۔۔۔اچھا یہ۔کیا بات ہے ۔کیا یہ بیمار ہے۔''

''ہاں ہم اسے اسپتال لائے تھے۔ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تو اب گھر ہی جارہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم یہاں سے ٹیکسی سے ہی جائیں گے۔میں ٹیکسی لاتی ہوں اور پھر مجھے دس منٹ لگیں گے ہوٹل سے سامان لینے میں۔''

''آپ رکو بیٹی میں ٹیکسی لاؤں گا۔آپ سے زیادہ پیسے لے لیں گے۔

یہ لڑکی ممبئی کی رہنے والی انجلی تھی جو عرفان کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئی تھی اور اب قسمت اس پر مہرباں ہو رہی تھی جو اسے پوش وَن گاؤں تک لے جانے والے لوگ بھی مل گئے تھے۔

بابا نصیر ٹیکسی لینے گیا۔تب تک انجلی نے اس کی بیوی کو اٹھانے میں زلیخا کی مدد کی۔پھر سبھی لوگ ٹیکسی میں بیٹھ کر انجلی کے ہوٹل گئے۔وہاں سے اس کا سامان لیا۔ آٹھ ناڈین پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اتر گئے۔انجلی نے پوش وَن وادی کی طرف چڑھتا راستہ دیکھا تو اسے اپنا سامان اٹھانے کا خیال آیا جو دو سوٹ کیس تھے۔

''وہ بابا۔یہاں سے ایک مزدور ملے گا جو وہاں تک سامان اٹھائے گا۔''

''کوئی نہیں بیٹا،ہم اٹھالیں گے۔''

''نہیں بابا،یہ سوٹ کیس بہت بھاری ہیں۔''

''کوئی نہیں،آپ فکر نا کریں۔۔سامان اتنا مشکل نہیں ہے۔جتنا آپ کو وہاں تک لے جانا مشکل ہو جائے گا۔''

''بابا ایسا کیوں۔۔۔وہاں کوئی خطرہ ہے کیا''۔

''وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔یہ راستہ پُر خطر ہے۔سامان تو ہم اٹھالیں گے۔ تم کو کیسے اٹھالیں گے۔''

''ارے ے ے وہ۔''انجلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں چلوں گی بابا۔آپ دیکھ لو۔۔۔''

''اچھا آجاؤ۔'' اس چھوٹے سے قافلے نے جب پہاڑی راستے پر چلنا شروع کیا تو بابا نصیر کو واقعی حیرانی ہو رہی تھی۔لڑکی ان کے ساتھ برابر چل رہی تھی بلکہ دادی کو سہارا بھی دے رہی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی جان دیدار بہو زلیخا بھی حیران تھیں کہ آخر یہ نازک سی لڑکی کسی بڑے سے شہر سے یہاں اکیلی کیوں چلی آئی تھی اور وہ ایسی کونسی چاہ تھی جو اسے اس دور افتادہ اور پچھڑے گاؤں میں لے کر جا رہی تھی۔

انجلی جب پوش وَن گاؤں پہنچ گئی تو شام کے سائے اپنا ڈھیرہ ڈال رہے تھے۔ سنہری دھوپ سست پڑ رہی تھی۔برف سے ڈھکی پہاڑی چوٹیوں پر نمی سی ابھر آئی تھی جو صبح کے شبنمی قطروں کے موافق سورج کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔سرسبز وادی میں چار سُو رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔تتلیاں مست مست پھولوں کے اوپر منڈلا رہی تھیں۔پہاڑی ڈھلوانوں سے چھن چھن کرتے جھرنے بہہ رہے تھے۔ پیڑوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔اوپر آسمان میں پرندوں کی ایک بڑی تعداد چکر کاٹ رہی تھی۔انجلی کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ قدرت کے بنائے سرگ میں آئی ہوئی ہو۔وہ تتلیوں کے سنگ ساری وادی کو جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔وہ اوپر آسمانوں میں پرندوں کے ساتھ اڑنا چاہتی تھی۔۔۔وہ بہت خوش تھی۔اسے اب یہ بھی غم نہیں تھا کہ عرفان اسے دیکھ کر کتنا غصہ ہو جائے گا۔وہ تو بس اپنی ساری زندگی ان تتلیوں کے سنگ ان

پھولوں کے ساتھ یہیں اسی پوش وَن وادی میں گزارنا چاہتی تھی۔

انجلی بابا نصیر کے گھر پہنچی تو بہت زیادہ تھک چکی تھی۔ آتے ہی سوگئی۔ شام کی ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔ زلیخا نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ کمبل پرانا تھا لیکن صاف ستھرا سا تھا۔ انجلی دیر تک سوتی رہی۔ جب تک وہ سوتی رہی بابا نصیر، جان دید اور زلیخا اسی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بابا نصیر کے لئے یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی اور وہ ان کو بتا رہا تھا۔

''بڑے شہروں اور بڑے گھروں کی لڑکیاں اس طرح کی حرکتیں کرتی رہتی ہیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد اس ماحول سے تنگ آ کر اپنے گھر کی راہ لیتی ہیں۔ اسے بڑے بڑے قصے میں نے پہلگام میں سنے ہیں اور یاترا کے دوران دیکھے ہیں۔''

زلیخا نے گھر آتے ہی چولہا جلا دیا تھا اور وہ کھانا پکا رہی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو انہوں نے گھر میں روشنی کے لئے چراغ جلا دیا۔ ویسے بھی یہاں شام کو گھروں میں چولہے دیر تک جلتے تھے اور اسی کی روشنی میں لوگ رات کا کھانا کھاتے تھے اور سو جاتے تھے۔ کچھ گھروں میں تو چولہے جلتے ہی رہتے تھے جو دن رات بجھتے ہی نہیں تھے۔

''بہو اس لڑکی کو جگا دو۔ پتہ نہیں بے چاری نے دن میں کچھ کھایا بھی ہوگا کہ نہیں۔ کھانا کھا کر پھر آرام سے سو جائے گی۔''

زلیخا نے لڑکی کو جگانے کے لئے آہستہ سے اس کو ہلانا شروع کر دیا۔ لڑکی جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ آخر جاگ گئی اور حیران نظروں سے سب لوگوں کو دیکھنے لگی۔ پھر چولہا دیکھا جو جل رہا تھا اور طاقچے پر رکھے چراغ کو دیکھا تو اسے رہا نہ گیا۔

''کیا یہاں بجلی نہیں ہے۔ یہاں دیپ کیوں جل رہا ہے۔ اور یہ آگ کیوں جل رہی ہے۔''

''بیٹی یہ چولہا ہے جس پر کھانا بن رہا ہے اور یہاں اس گاؤں میں بجلی نہیں ہے۔'' بابا نصیر نے اس کی حیرانگی دیکھ کر کہا۔

''اووووو مائی گاڈ۔۔۔ یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔ کیا یہاں سچ میں بجلی نہیں ہے۔ اور کھانا لکڑی کے چولہے پر بنتا ہے۔ یہ سب میں نے کلاسیکل فلموں میں دیکھا ہے۔ کیا میں ابھی نیند میں ہوں یا یہ سب میں سچ میں دیکھ رہی ہوں۔ اووووو مائی گاڈ، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔''

انجلی حیران ہو کر ان کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔

''بیٹی آپ دن بھر کی بھوکی ہوں گی اور تھکی بھی، یہاں آتے ہی سو گئیں۔ اب جلدی سے کھانا کھا لو اور سو جاؤ۔ صبح گاؤں کا سارا حال معلوم ہو جائے گا۔''

بابا نصیر نے مسکراتے ہوئے اسے کہا اور زلیخا نے اس کے سامنے کھانا رکھ دیا ۔۔۔اب اس نے بھی چپ چاپ کھانا کھا لیا۔ بابا نصیر کھانا کھانے کے بعد سونے کے لئے پن چکی پر چلا گیا۔ زلیخا نے انجلی کے لئے ایک صاف ستھری چادر نکالی۔ ساس کو دوا کھلا دی اور اس کے قریب بستر ڈال کر سو گئی۔ لیکن انجلی بہت دیر تک گزرے حالات پر غور کرتی رہی۔ اسے اب بس اتنی فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ کل صبح کس طرح سے عرفان کو تلاش کرے گی اور جب اس کے گھر والوں کو اس کے بارے میں پتہ چلے گا تو ان کا رِی ایکشن کیا ہوگا۔ بہت دیر تک سوچتے سوچتے آخر وہ بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

راتوں رات یہ بات سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ بابا نصیر کے گھر کوئی باہر کی مہمان لڑکی آئی ہوئی ہے تو صبح ابھی انجلی سوئی ہی تھی کہ سارا گاؤں باہر جمع ہو گیا تھا اور گاؤں کی لڑکیاں اندر آ کر انجلی کو قریب سے دیکھنے لگی تھیں۔ لیکن دادی اور زلیخا ان کو انجلی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں تا کہ اس کی نیند نہ ٹوٹے۔ کیونکہ وہ کل دن بھر

چلتے چلتے بہت تھک چکی تھی۔ گاؤں کی لڑکیوں میں عرفان کی ماما زاد بہن سارہ اور عرفان کی محبوبہ حنا بھی پہنچ چکی تھیں۔ سبھی لڑکیاں کھسر پھسر کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ہنستی بھی جا رہی تھیں۔ عرفان کی ماں زلیخا ان کو جھڑک دیتی تھی۔ لیکن لڑکیوں پر اس کا کوئی بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ انجلی جب جاگ گئی تو اپنے اردگرد بہت ساری لڑکیوں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ آنکھیں مل مل کر سب کو بڑی حیرانگی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

''اووو۔۔۔تم اٹھ گئی بیٹی۔ دیکھو نا سارا گاؤں تمہیں دیکھنے آیا ہے۔''

''ہائے ے ے۔'' انجلی نے ہاتھ اٹھا کر سبھی لڑکیوں کو وِش کیا۔ اور لڑکیاں حیران ہو کر اسے دیکھتی جا رہی تھیں۔ سبھی کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ انجلی بھی ان کی خاموشی سے پریشان ہو رہی تھی۔ وہ پھر سے مسکرا کر لڑکیوں سے اپنا تعارف کرانے لگتی ہے۔

''ہیلو گرلز۔۔۔میں انجلی ہوں۔ اور آپ کی مہمان ہوں۔''

''سارہ، حنا بیٹی۔ اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ باہر منہ ہاتھ دھولے گی۔ تھوڑا سا گاؤں دیکھے گی۔ تب تک میں آپ سب کے لئے نون چائے بناؤں گی۔''

'' نہیں پھوپھی۔۔۔۔میں آپ کی مدد کروں گی۔ روٹیاں بنا کے دوں گی۔'' سارہ کہتی ہے (سارہ جو زلیخا کے بھائی حفیظ خان کی بیٹی ہے اور اس کی شادی عرفان سے طے ہو چکی ہے)۔

''ارے نہیں بیٹی۔ آپ اس کے ساتھ جاؤ۔ روٹیاں تو میں کب کی بنا چکی ہوں۔ بس انہیں گھی ملانا باقی ہے۔ آپ جاؤ۔ یہ ہماری مہمان ہے۔ یہ کیا سمجھے گی۔''

سبھی لڑکیاں انجلی کے ساتھ باہر چلی گئی اور زلیخا روٹیاں گھی میں تلنے لگی۔

بابا نصیر پن چکی سے گھر واپس آ گیا۔

''ارے بہو یہ لڑکی کہاں جا رہی ہے۔'' بابا نصیر نے آتے ہی پوچھ لیا۔

''لڑکیوں کے ساتھ باہر جا رہی ہے۔ منہ ہاتھ دھو کے آئے گی۔ تھوڑا گاؤں دیکھے گی۔'' دادی نے جواب دیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ بس اس لڑکی کی فکر کھائے جا رہی ہے مجھے۔''

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اتنی نازک سی لڑکی اس دور دراز گاؤں میں کیوں آئی ہے۔'' بابا نصیر کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں تھیں۔

''کل تو آپ ہی کہہ رہے تھے کہ یہ بڑے شہروں اور بڑے گھروں کی لڑکیاں ایسی حرکتیں کرتی رہتی ہیں اور آج آپ ہی کو تشویش ہو رہی۔'' دادی حیرانگی کے ساتھ بابا نصیر کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں، جانے کیوں مجھے یہ معاملہ کچھ تشویش ناک سا لگ رہا ہے۔ مجھے یہ سیدھا سادہ معاملہ تو بالکل بھی نہیں لگ رہا ہے۔ کہیں کچھ گڑبڑ ہے جو مجھے سوچنے پر اُکسا رہی ہے۔''

''کہیں ایسی ویسی بات نہ ہو جائے تو ہم خوامخواہ اس مسئلے میں پھنس جائیں گے۔'' زلیخا بھی کچھ کچھ پریشان نظر آنے لگی تھی۔

''ارے نہیں بہو۔ ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ ہم لوگ ڈر جائیں۔ ہم اسے زبردستی اٹھا کر تو نہیں لائے ہیں گاؤں میں۔ یہ خود ہی آئی ہے۔ میری الجھن تو کچھ اور ہے۔ خیر جانے دیں۔''

''اور وہ الجھن کیا ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے۔'' دادی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ارے کہا نا، جانے دیں۔ کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ دیکھتے ہیں۔ وقت آنے پر سب کھل جائے گا۔ میں بس عرفان کے لئے پریشان ہوں۔ اپنی مجھے کوئی فکر

نہیں ہے۔'' دادا نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''عرفان کا کیا۔۔۔اس مسئلے کے ساتھ عرفان کا کیا واسطہ۔کہیں یہ وہ لڑکی تو نہیں بابا'' زلیخا کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔۔۔

''اوہ بہو۔تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔'' بابا نصیر خود بھی پریشان ہو گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو بہو۔۔۔تمہارا مطلب۔۔۔۔۔اوو میرے خدا۔کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں۔آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں۔کہیں عرفان۔۔۔'' دادی اس سے آگے کچھ بتا ہی نہیں پائی اور اس کے آنسو نکل آئے۔زلیخا بھی رونے لگی۔

''اوہ ہو۔تم لوگ ابھی ایسا کیوں سوچ رہے ہو۔بس ایسے ہی میرے دل میں خیال آ گیا تھا۔ضروری نہیں یہ وہی ممبئی والی لڑکی ہی ہو۔شاید کوئی ٹورسٹ ہو۔کوئی کشمیر کے گاؤں دیکھنے والی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' دادی نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو پورا یقین ہو رہا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے۔اب عرفان پھر سے مصیبت میں پھنس جائے گا۔اب میں کیا کروں۔عرفان کو کہاں چھپاؤں''۔

''بہو۔۔۔تم کیوں فکر کر رہی ہے۔آج ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔آج تو ہم سب اپنے گاؤں میں ہیں۔یہاں عرفان کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔'' دادا نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

''ابھی عرفان واپس کہاں آیا۔اگر خدانخواستہ راستے میں۔۔۔''

''بس بہو۔خدا کے لئے ایسی بات منہ سے مت نکالو۔اگر ایسی ویسی بات ہوگئی میں تو اپنی جان دے دوں گی۔لیکن عرفان پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔'' دادی غصے سے کانپ رہی تھی۔

''اب تم لوگ بس بھی کرو۔کیا پتہ ایسا کچھ بھی نہ ہو اور تم لوگ خوامخواہ بات کو بڑھا

رہے ہو۔۔۔اب اس لڑکی کو آنے دو۔میں اسے پوچھ لوں گا کہ وہ کون ہے۔۔۔اب تو چائے ناشتہ دے دو مجھے یا ہم اسی لڑکی کی ادھیڑ بن میں الجھتے رہیں گے۔''

'' جی جی۔۔۔چائے تو تیار ہے۔۔۔''

''اب میں کچھ کھا پی نہیں پاؤں گی بہو'' دادی نے روتے ہوئے کہا۔

'' بھوک تو میری بھی کل رات سے ہی اڑی تھی۔ مجھے کل ہی اس لڑکی پر شک ہونے لگا تھا۔''

''اب تو یہ بات سارے گاؤں میں پھیل جائے گی۔۔۔ابھی۔''

''ارے بات پھیل جائے گی تو پھیلنے دو۔کیا کر لے گی یہ لڑکی۔بس اب تم لوگ دیکھو میں ہی کیا کرتا ہوں۔ایسے نکال دوں گا گاؤں سے کہ کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔''

جب تک زلیخا نے دادا دادی کے سامنے نون چائے رکھ دی اور ساتھ ہی مکئی کی روٹیاں جو گھی میں تلی ہوئی تھیں۔۔۔لیکن تینوں میں سے کسی نے روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔بس بابا نصیر نے خالی آدھی پیالی چائے پی لی۔ باقی وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

''جو کچھ کرو گے تو سوچ سمجھ کر کر لینا۔ایسا بھی کچھ نہ کرنا۔آخر لڑکی ہی تو ہے۔'' دادی نے کہا لیکن بابا نصیر نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔وہ باہر جا چکا تھا۔

☆☆☆

انجلی لڑکیوں کے ساتھ باہر چلی گئی اور ایک جھرنے پر منہ ہاتھ دھو لئے۔ وہ یہاں کی خوبصورت صبح میں کھو گئی تھی۔اس وقت پوری پوش وَن وادی سورج کی روشنی میں نہا چکی تھی لیکن پھر بھی ہوا میں خنکی ابھی باقی تھی۔چاروں طرف رنگ برنگے پھول کھلے تھے اور وادی ان کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی۔انجلی جی بھر کر

وادی کی خوبصورتی کو محسوس کر رہی تھی اور لمبی لمبی سانسیں لے کر جیسے ساری خوشبو اپنے جسم و جان میں بھر دینا چاہتی تھی۔لڑکیاں اس کی دیوانگی پر بڑی شوخی کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اب چلیں میم صاحب۔'' حنا نے انجلی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔انجلی اپنے آگے پیچھے دیکھنے لگی پھر حنا سے مخاطب ہوئی۔

''میم صاحب؟ کون ہے میم صاحب؟؟؟''لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

'' آپ۔۔۔آپ ہیں میم صاحب۔'' سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں؟ میں میم صاحب۔کس نے بولا۔'' انجلی ابھی کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''میم صاحب، یہ ہم یہاں روز سنتے ہیں۔جو ہمارے گاؤں کے لوگ امرناتھ یاترا کو مزدوری کرنے جاتے ہیں تو وہ واپس آ کر میم صاحبوں کی مزے دار کہانیاں سناتے ہیں۔یاتریوں کے ساتھ جو بھی عورتیں ہوتی ہیں۔وہ ان سب کو میم صاحب کہتے ہیں۔'' حنا نے انجلی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھاا۔۔۔تو یہ بات ہے۔اسی لئے کسی نے میرا نام نہیں پوچھا۔لیکن میں تو میم صاحب نہیں ہوں۔''انجلی نے مسکراتے کہا۔

''اچھا۔۔۔پھر آپ کون ہیں۔کیا آپ امرناتھ یاترا کو نہیں گئی تھیں۔''

''نہیں تو۔۔۔میں تو بس اسی گاؤں تک آئی ہوں۔''

''ہم تو پہلگام تک بھی نہیں گئی ہیں لیکن سنا ہے خوبصورت جگہ ہے۔اور دور دور سے لوگ وہاں گھومنے آجاتے ہیں۔'' سارہ نے کہا۔

''پر آپ کیوں نہیں گئیں۔آپ کے تو پڑوس میں ہے پہلگام۔'' انجلی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہم لڑکیاں اس گاؤں سے باہر نہیں جاتی۔ یہاں کی عورتیں بھی تبھی جاتی ہیں جب کوئی مجبوری ہو یا بیمار ہو تو کوئی ہسپتال لے جائے۔'' انجلی ان کی باتیں بھی سن رہی تھیں اور ساتھ ساتھ دل میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اچھا موقع ہے ان لڑکیوں سے عرفان کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی جب حنا بولی۔

''لیکن آپ بتاؤ۔ پھر آپ یہاں کیوں آئی ہو۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں آتا۔ امرناتھ یاتری بھی نہیں۔ بس کبھی کبھار کسی پٹواری کا آدمی آجاتا ہے یا کبھی آٹھ ناڈین کا چوکی دار۔''

''اگر میں بتادوں میں یہاں کیوں آئی ہوں، کیا آپ لوگ میری مدد کریں گی۔'' انجلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور اس کا دماغ اسے بار بار منع کر رہا تھا۔

''مدد ۔۔۔؟؟؟ کیسی مدد۔'' حنا نے کہا۔ باقی سب لڑکیاں عجیب نظروں سے اسے گھور رہی تھیں اور انجلی بھی شش پنج میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ اگر وہ بابا نصیر کو بتادے گی تو پتہ نہیں وہ بوڑھا آدمی کیا سمجھ لے گا۔ اچھا موقع ہے۔ لڑکیوں سے عرفان کے گھر کا پتہ پوچھا جائے۔ پھر خود اسے ملنے جاؤں گی۔

''کیا آپ مجھے بتا سکتی ہو کہ عرفان کا گھر کہاں ہے۔''

''عرفان ن ن ۔۔۔'' سبھی لڑکیوں کے منہ سے ایک ساتھ نکل گیا۔

''کیا آپ لوگ اس کو جانتی ہو۔'' انجلی نے تھوڑا سا خوش ہو کر کہا۔

''کون عرفان؟؟؟'' سارہ نے انجلی کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''عرفان ۔۔۔ عرفان وہ جو بھیڑیں ۔۔۔۔۔

''اچھا اوہ عرفان ۔۔۔۔'' سارہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ باقی لڑکیاں بھی حیرت سے انجلی کو دیکھ رہی تھیں۔

''کیوں ۔۔۔کیوں پوچھتی ہواس کے بارے میں ۔۔۔کون ہوتم ۔'' حنا نے ترش روئی سے کہا۔سارہ ہونٹ چبا رہی تھی اور ساتھ میں دماغ پر بھی زور دے رہی تھی۔

''اووو ۔۔۔کہیں تم وہ لڑکی تو نہیں ہوجس نے پچھلے سال عرفان کو گرفتار کروایا تھا۔تمہارے بھائی اور باپ نے عرفان کولہولہان کر دیا تھا۔اسے مہینوں تک ہسپتال میں رہنا پڑا'' سارہ کی باتوں میں سانپ کی پھنکار آئی تھی۔

''سنو اصل میں بات یہ تھی کہ ۔۔۔'' انجلی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سارہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''بس بس ۔۔۔اپنی بکواس بند کرو۔ہم تمہاری چال سمجھ گئے ہیں۔تم نے سنا ہوگا کہ عرفان بچ گیا ہےاوراب تم یہاں آ کر اس کونقصان پہچانا چاہتی ہو''۔

''ارے ے ے ،نہیں نہیں ۔ایسا کچھ بھی نہیں ۔ میں تو صرف اسی سے یہاں ملنے کے لئے آئی ہوں۔اتنی دور۔''

''میں تو تمہیں یہاں ہی زندہ گاڑ دوں گی ۔تم عرفان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی ۔اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں یہیں دفن کر دوں گی ۔'' سارہ بہت غصے میں تھی۔

''ارے ۔۔۔رُکو رُکو سارہ۔کیا کر رہی ہو۔پہلے سننے تو دو۔کیا وہی لڑکی ہے یا کوئی اور۔'' حنا نے سارہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔پھر انجلی سے بولی۔

''تم یہاں کیسے پہنچ گئی ہو۔''

''تم اسے کیا پوچھتی ہو حنا۔تم کو نہیں پتہ یہ عرفان ۔۔۔۔'' سارہ نے حنا کی بات کاٹ کر کہا۔

''اوہو۔۔رُکو سارہ ۔۔۔میں سب سمجھ گئی ۔مجھے اس کے ساتھ بات کرنے

دو۔ہاں آپ بولئے آپ یہاں کس کے ساتھ آ گئیں۔''

''ان ہی کے ساتھ جن کے گھر میں میں سوئی تھی۔ جہاں ہم سبھی ملیں۔''

انجلی نے جواب دیا۔

''آپ ان کو جانتی ہو۔۔۔''

''نہیں تو ۔۔۔؟ بس اس بوڑھے آدمی کا نام سنا ہے۔ بابا نصیر۔۔۔ پر کیوں۔''

''پھر تم ان کے ساتھ کیسے آ گئی۔'' حنا نے یقین نہ کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ سارہ دانت کھٹکھٹا رہی تھی۔

''وہ مجھے پہلگام میں مل گئے۔ جب میں نے سنا وہ پوش وَن گاؤں میں رہتے ہیں تو میں ان کے ساتھ آ گئی۔ مجھے کسی بھی حال میں عرفان سے ملنا تھا۔''

''تم عرفان سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔''

''کیونکہ میں اسے پیار کرتی ہوں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو تم۔'' سارہ بہت غصے میں آ گئی اور وہ انجلی کو مارنے کے لئے آگے بڑھ گئی تھی لیکن حنا نے اسے روکا۔

''کیا کر رہی ہو سارہ۔ یہ ہماری مہمان ہے۔''

''مہمان گئی بھاڑ میں۔تم سنتی نہیں۔ یہ کیا بکواس کر رہی ہے۔'' سارہ اپنے آپ کو روک نہیں پا رہی تھی۔لیکن حنا صبر سے کام لے رہی تھی۔

''میں عرفان کے لئے سب کچھ چھوڑ آئی ہوں۔اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔اپنی تعلیم چھوڑ دی۔سب عرفان کے لئے قربان کر دیا۔''

''اووووقربانی کی بچی۔۔۔تم سیدھی طرح یہاں سے دفع ہو جاتی ہے یا میں تجھے یہیں لٹکا دوں۔'' سارہ پھر آگے آئی اور اب سبھی لڑکیوں نے اسے روکا۔

''لٹکا دو یا گاڑ دو۔لیکن میں بھی عرفان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

تب تک ان کے گرد اور بھی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بات جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ سارا گاؤں امڈ آیا تھا۔ ہر طرف چہ میگویاں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ عرفان کو الزام دے رہے تھے، کچھ بابا نصیر کو مورد الزام گردانتے تھے۔

''یہ بابا نصیر کو کیا پڑی تھی جو اس بدیسی بلا کو اپنے ساتھ یہاں لایا ہے۔ وہیں پوچھ لیتا۔ سارے گاؤں کا سکون درہم برہم کر دیا بوڑھے نے۔ اب خود بھگتے گا۔ بے چارہ عرفان تو گیا'' کوئی غصے میں کہہ رہا تھا۔

جو لوگ یہ جانتے تھے کہ عرفان کی شادی سارہ سے طے ہے وہ حفیظ خان اور سارہ کے ساتھ ہمدردی جتا رہے تھے اور جو سہیلیاں یہ جانتی تھی کہ حنا اور عرفان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں وہ حنا سے ہمدردی جتا رہی تھیں۔ کچھ منچلے لوگ جو اس طرح کی باتوں کا لطف اٹھاتے ہیں وہ مسخری اور مخول بازیاں کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مزہ کئی دن تک ایسے ہی چلتا رہے۔ جو لوگ تازہ تازہ امرناتھ یاترا سے لوٹ آئے تھے اور وہ دو تین دن ابھی سونا چاہتے تھے ان کے آرام میں یہ معاملہ خوامخواہ رخنہ ڈال رہا تھا۔ عورتیں انجلی کی بے باکی پر دانتوں تلے انگلیاں دبا رہی تھیں۔ غرض جتنے لوگ اتنی باتیں۔۔۔

جب یہ بات بابا نصیر، دادی اور عرفان کی ماں کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ دنگ رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جس بلا کو وہ اپنے ساتھ گاؤں لے کر آئے وہ انہی کے گھر کی دشمن تھی۔ بابا نصیر اور زلیخا کے خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ غلطی خود ان ہی سے سرزد ہو گئی تھی جو وہ لوگ اس بلا کو اپنے ساتھ گاؤں تک لے آئے تھے۔ انہیں یہ غم نہیں تھا کہ گاؤں کے لوگ کیا کہیں

گے۔انہیں تو بس عرفان کی فکر کھائے جارہی تھی۔وہ جانتے تھے کہ امرناتھ یاترا ختم ہوگئی ہے۔گاؤں کے آدمی واپس لوٹ رہے تھے اور عرفان بھی ایک دو دن میں واپس آرہا ہوگا۔عرفان کے گاؤں آتے ہی یہاں کیا ہوجائے گا، بابا نصیر سوچتے ہی کانپ اٹھا تھا۔اسے یقین ہوتا جارہا تھا کہ یہ لڑکی اس کے گھر کے لئے کسی بڑے اور خوفناک طوفان کا پیش خیمہ بن کے آئی ہے۔اسے عرفان محفوظ نہیں لگ رہا تھا۔بابا نصیر سچ میں بہت پریشان تھا۔لیکن یہ فیصلہ اسے خود ہی کرنا تھا کہ وہ اس مسئلے کو کس طرح سے حل کرے۔۔۔آخر اس نے ایک فیصلہ کر ہی لیا اور اسے لگ رہا تھا کہ اب اس کا گھر محفوظ رہے گا اور عرفان پر بھی آنچ نہیں آپائے گی۔۔۔

☆☆☆

پوش وَن وادی میں آج عید جیسا سماں تھا۔عید کہیں تو یہاں عید کے روز بھی اتنے سارے لوگ ایک جگہ جمع نہیں ہوتے تھے۔بس یہ سب تماشہ دیکھنے آرہے تھے۔یہاں کے منچلے نوجوان اس کا مزہ لے رہے تھے۔ایک طرف بچوں کی کلکاریاں تھیں تو دوسری طرف عورتوں کے چہروں پر تشویش تھی۔جب کہ لڑکیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھل رہی تھیں۔مرد لوگ ہونٹ سکوڑے دور دور تک بیٹھے تھے۔لیکن سارہ اور حنا کے ساتھ ساتھ گاؤں کی چند ایک لڑکیوں کے چہروں پر کچھ حقارت اور کچھ نفرت کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔زیادہ تر لوگ بابا نصیر کی پن چکی کے سامنے آبڑ کھابڑ زمین پر کھڑے تھے۔کچھ بوڑھے پن چکی کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے ایک ایک کرکے حقے کے کش لگا رہے تھے۔دو چار عورتوں کے سروں پر ٹوکریاں رکھی تھیں جو کھیتوں کی طرف جانے کے لئے گھروں سے نکلی تھیں۔گاؤں کے سبھی لوگوں کی نظروں کی مرکز انجلی تھی۔کچھ تیکھی، کچھ تند اور کچھ مسکراتی آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔۔۔اور انجلی۔۔۔ایک پتھر پر بیٹھی، ہاتھوں کے پیالے میں اپنی تھوڑی

ٹکائے، بے خوف نظروں سے ایک ٹک عرفان کے گھر کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے اس کے دو سوٹ کیس پڑے تھے۔

بابا نصیر گھر کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی دروازہ کے ساتھ کھڑی تھی لیکن وہ بہت غصے میں تھی۔ عرفان کی ماں زلیخا خاموش تھی اور چولہے پہ چڑھی دیگ میں لکڑی کی کڑچھی ہلا رہی تھی۔

''غلط بات۔۔۔ عرفان کے دادا یہ غلط بات ہے۔ آپ نے جو کچھ کر لیا۔ یہ اچھا نہیں کیا۔'' دادی نے بابا نصیر سے آنکھیں ملائے بغیر کہا لیکن اس کی بات میں غصہ صاف جھلک رہا تھا۔

''میں نے جو کیا اچھا کیا۔ یہ ہم سب کے لئے اچھا ہے اور عرفان کے لئے، سب سے بہتر۔''

''بات عرفان کی نہیں ہے عرفان کے دادا۔۔۔ بات اس لڑکی کی ہے جس کو آپ نے ذلیل کر کے گھر سے باہر نکال دیا۔ جو باہر لوگوں کے بیچ میں ایسے سکڑی بیٹھی ہے جیسے چوزا چیلوں کو دیکھ کر اپنے پروں میں سر چھپا لیتا ہے۔۔۔''

''تو میں کیا کروں اس کا۔ دفع ہو جائے یہاں سے۔''

''کہاں جائے گی بے چاری۔۔۔ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے پاس چلی آئی ہے۔ یہاں سے کہاں جائے گی۔ کون ہے یہاں اس کا۔ ایک اکیلی جان وہ بھی معصوم لڑکی۔۔۔ کہاں جائے گی۔''

''اسے معصوم نا کہو عرفان کی دادی۔ تمہیں یاد نہیں کیا۔ کیسے ان لوگوں نے عرفان کو لہولہان کر دیا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی جو بچ گیا۔ انہوں نے تو اسے مار ہی ڈالا تھا۔''

''مانتی ہوں۔ لیکن اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔'' عرفان کی ماں

زلیخا نے بہت آہستہ سے سر جھکائے کہا اور دیگ میں کڑچھی زور زور سے ہلانے لگی۔

''کیا بولی۔۔۔بہو ذرا پھر سے بول۔عرفان تیرا ہی بیٹا ہے۔کیسی ماں ہے تو۔۔۔تیرا بیٹا جیل گیا۔اسپتال پہنچا۔چھ ماہ بستر پر رہا۔اب بھی وہ پورا ٹھیک نہیں ہے ۔ اسی لئے میں اسے امرناتھ یاتریوں کے ساتھ مزدوری کرنے نہیں جانے دے رہا تھا۔وہ وہاں ہے، یہاں میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور تو ماں ہو کر بھی اس لڑکی کے ساتھ ہمدردی جتا رہی ہے جس کی وجہ سے تیرا بیٹا جان سے بھی جا سکتا تھا۔کیسی ماں ہے تو۔۔۔کیسی ماں۔'' غصے سے بابا نصیر کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

''بس عرفان کے دادا اتنا غصہ نہ کر۔یہ اس بے چاری لڑکی کا قصور نہیں تھا ۔۔۔ماں باپ سبھی کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔۔'' دادی نے نرم لہجے میں کہا۔

''اری پاگل ۔۔۔عرفان گپھا سے واپس آئے گا تو اس کے ساتھ ساتھ تم لوگوں کو بھی گھر سے نکال دے گا۔۔۔ بڑا غصے والا ہے وہ لڑکا۔'' دادا کچھ نرم پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔

''ہم عرفان کے آنے تک تھوڑی اس لڑکی کو یہاں رکھیں گے۔۔۔۔''۔

''تو۔۔۔۔۔۔'' بابا نصیر حیرانگی سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔حیرانگی سے عرفان کی ماں زلیخا بھی اپنی ساس کو دیکھ رہی تھی۔

''ارے وہ تو اس لڑکی کو اس طرح ذلیل کر کے گھر سے نکالنے پر اعتراض ہے مجھے۔سارے گاؤں میں تماشہ بنی بے چاری۔۔۔اور ساتھ میں ہم بھی۔''

''اب صاف صاف بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔'' بابا نصیر نے زچ ہو کر کہا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔اس لڑکی کو گھر کے اندر لے آؤ۔جب تک عرفان گھر آئے گا۔ہم اس کو سمجھا دیں گے۔دنیا داری، اونچ نیچ، ذات پات، اچھا برا۔۔ اور اسے تیار کریں گے کہ اپنے گھر جائے۔اپنے ماں باپ کی عزت کے ساتھ اس

طرح نہ کھیلے۔ سیانی لڑکی ہے۔ بات سمجھ جائے گی اور عزت کے ساتھ اپنے گھر چلی جائے گی۔۔۔اس طرح کا سلوک کسی لڑکی کے ساتھ کرنا اچھا نہیں ہے عرفان کے دادا۔''

دادی نے تفصیل سے بات سمجھا دی تو بابا نصیر بھی بہت دیر تک سر ہلاتا رہا ۔۔۔!!

''ارے واقعی تم نے اچھی بات کہی ہے۔ یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اس طرح بے چاری لڑکی تماشہ نہ بنتی۔'' بابا نصیر اب پچھتا رہا تھا۔

''میری بھی عقل گھاس چرنے گئی تھی۔ تب تو اس لڑکی کی اصلیت جان کر مجھے بھی بہت غصہ آ رہا تھا۔ مجھے عرفان یاد آیا۔ اس کی وہ حالت یاد آئی جو اس کی وجہ سے اس کے باپ اور بھائی نے کی تھی۔۔۔''

''وہی۔۔۔وہی تو۔۔۔اب آئی نا بات سمجھ۔۔۔یہی میں تم لوگوں کو کب سے سمجھا رہا تھا۔۔۔ اس۔۔۔اس لڑکی کی وجہ سے اس کے باپ اور بھائی نے عرفان کو جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ ہمیں تو چاہئے تھا راستے میں ہی اس کو اٹھا کر آٹھ ناڈین کی کھائی میں پھینک دیں۔ کچھ تو ہمارے دل کو سکون آ جاتا۔۔۔'' بابا نصیر پھر غصہ ہوا۔۔۔

''ارے ارے ے ے۔۔۔۔عرفان کے دادا، وہ میں نے اس لئے نہیں کہا۔ میرا مطلب ہے مجھے آپ کو اسی وقت روکنا چاہئے تھا۔ جب آپ اس لڑکی کو گھر سے نکال رہے تھے۔ بس اسی وقت میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا اور میں آپ کو سمجھا نہ سکی تھی۔۔۔ جب تک اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ اب باہر جاؤ اور اس لڑکی کو واپس لے آؤ ۔۔۔''

''اری پاگل۔ میں کیسے جاؤں اسے واپس لانے۔۔۔ میں نے ہی اسے نکال دیا۔ اب گاؤں والوں کے سامنے میں اسے معافی مانگ لوں کیا۔ میں ہی اسے

منانے جاؤں اور گھر میں واپس لے آؤں۔۔۔گاؤں والے کیا کہیں گے۔''

''گاؤں والے کہیں جو اُن کو کہنا ہے۔ہم گاؤں والوں کے کہنے کے ڈر سے لڑکی کو باہر تو نہیں رکھیں گے نا۔'' دادی نے غصے سے کہا۔

''دادی۔بابا ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔بابا کی گاؤں میں اتنی عزت ہے۔یہ باہر جائیں گے تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا۔گاؤں والے دس باتیں کریں گے۔بابا کی کیا عزت رہے گی۔'' عرفان کی ماں زلیخا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''ارے بہو۔کیسی باتیں کر رہی ہو تم'' دادی نے حیرانگی سے بہو کی طرف دیکھا۔

''یہ دیکھو بہو کی عقل۔۔۔۔اور تمہاری عقل'' بابا نصیر نے فخر سے بہو کی طرف دیکھا۔

''بابا گھر میں رہیں گے۔۔۔ہم جائیں گے دادی،آپ اور میں۔ہم لائیں گے اس لڑکی کو۔۔۔'' عرفان کی ماں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔۔ہاں یہ ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ ،اور لے آؤ اس لڑکی کو اور گاؤں والوں سے بھی کہہ دو کہ یہاں یہ تماشہ نہ لگائیں۔یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔ہم جانیں کس طرح سے اس کو نپٹائیں۔۔۔'' بابا نصیر نے رعب دار آواز میں کہا۔

''اب آپ رہنے ہی دو۔ہم خود سنبھالیں گے۔'' دادی نے بابا نصیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ بہو۔۔۔'' اور دونوں بڑی تیزی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئیں۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں بابا نصیر جلدی میں اپنا فیصلہ بدل نہ دے۔یہ لڑکی کو گھر لائیں گے تو پھر گھر کے اندر سب کچھ سنبھالنا ان کو آجائے گا۔۔۔۔

☆☆☆

دادی اور عرفان کی ماں نے انجلی کو واپس گھر میں لایا، اسے بہت سمجھایا۔ پھر سے عرفان کو کسی مصیبت میں نہ ڈالنے کے لئے ہاتھ جوڑے۔ لیکن انجلی نے ان کی ایک نہ مانی۔ وہ بضد تھی کہ عرفان کے آنے تک اسے یہاں رہنے دیا جائے اور اگر عرفان خود اسے یہاں سے جانے کے لئے کہہ دے گا تو وہ بنا کچھ کرے، بنا کچھ کہے یہاں سے چلی جائے گی لیکن اس طرح عرفان سے ملے بنا وہ بالکل بھی نہیں جائے گی۔

انجلی کا سامان اندر رکھنے کے بعد اسے آرام کرنے کے لئے دونوں ساس بہو اس کے کمرے سے نکل آئیں لیکن وہ اب زیادہ پریشان ہوگئیں تھیں کہ جب کل پرسوں عرفان واپس آجائے گا تو وہ اس کو کیا جواب دیں گی یا جب انجلی اور عرفان کا آمنا سامنا ہو جائے گا تو حالات کیسے رہیں گے۔۔۔ دونوں ساس بہو دیر تک اس مسئلے پر سوچتی رہی لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ رہی تھیں کہ سارہ اور حنا اندر آگئیں۔ سارہ ہنگامہ کرنے کی کوشش میں تھی جبکہ حنا مسئلے کو آرام سے سلجھانے کے حق میں تھی۔ عرفان کی ماں اپنے بھائی کی بیٹی سارہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں لگی تھی اور دادی حنا کو معاملے کی نزاکت سمجھا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے حالات کچھ قابو میں آرہے تھے اور اب انجلی کو عرفان سے دور رکھنے کا معاملہ تھا۔ جب تک انجلی خود سے واپس جانے کا فیصلہ نہ کرے یا عرفان کی رائے نہ دیکھی جائے۔

''دادی آپ لوگ پریشان نہ ہوں جب تک عرفان آئے گا اور وہ حالات دیکھے گا، تب تک انجلی میرے ساتھ، میرے گھر میں رہے گی۔'' حنا نے کہا تو سارہ چلّانے لگی۔

''کیا بکواس کر رہی ہو حنا۔ اس چڑیل کو دفع کرو یہاں سے۔''

''سارہ بیٹی تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ جب تک عرفان نہیں آئے گا ہم انجلی کو اس طرح سے واپس نہیں چھوڑ سکتے۔ پتہ نہیں لڑکی کیا کر بیٹھے گی۔'' عرفان کی ماں نے

اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھاڑ میں جائے۔ہمیں کیا۔بس یہاں سے دفع ہوجائے۔'' سارہ پھر چیخ پڑی تھی۔

''سمجھا کرو سارہ۔ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھتی ہو۔اس لڑکی کا واسطہ سیدھا عرفان کی زندگی سے ہے۔ یاد نہیں تمہیں پورا سال لگا عرفان کو ٹھیک ہونے میں۔'' دادی نے اسے سمجھاتے کہا۔

''اسی لئے تو کہہ رہی ہوں دادی یہ لڑکی پھر کوئی فتنہ کھڑا کرے گی۔ یہ اچھا ہوا عرفان ابھی واپس نہیں آیا ہے۔اگر یہ لڑکی یہیں رہی تو دیکھ لینا جب وہ واپس آئے گا تو یہاں گاؤں میں پھر نیا ہنگامہ ہوگا۔ یہ لڑکی منحوس ہے۔عرفان کے لئے اس کا سایہ اچھا نہیں ہے۔ بھگا دو اس کو یہاں سے۔۔۔نہیں تو ہم سب پچھتائیں گے۔'' سارہ کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''حنا ہم تم پر بھروسہ کرتے ہیں کہ تم اس لڑکی کو اپنے ساتھ رکھو۔عرفان کل پرسوں واپس آجائے گا۔ جب تک ہم اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے تب تک تم کوشش کرنا اس لڑکی اور عرفان کا آمنا سامنا نہ ہو۔''

''دادی، آپ بےفکر رہیں۔ یہ لڑکی میرے بس میں رہے گی۔ جب عرفان خود چاہے گا۔تب ہی یہ لڑکی اسے مل پائے گی۔''

''اچھا ہم اسے سمجھاتے ہیں کہ جب تک عرفان واپس آجائے گا تب تک تم حنا کے ساتھ رہو۔لیکن حنا بیٹی اس لڑکی کا خیال رکھنا۔آخر یہ عرفان کا معاملہ ہے۔کہیں وہ پھر سے کسی مشکل میں نہ پھنس جائے۔''

''پھنسے گا۔وہ پھر کسی بڑی مصیبت میں پھنسے گا۔میں تو کہتی ہوں اس لڑکی کو یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو نکال دو۔نہیں تو عرفان کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی پھنس

جائیں گے'' سارہ اپنی بات کو زور دے کر کہہ رہی تھی۔

''دادی، آپ سارہ کی باتوں میں مت آ جائیں۔ یہ اس وقت دل سے سوچ رہی ہے اور دل کچھ بھی کرواتا ہے۔ ہمیں اس لڑکی کو ابھی پناہ دینی ہے اور اس کا خیال بھی رکھنا ہے۔''

پھر کافی بحث وتکرار کے بعد سبھی اس بات پر متفق ہو گئے کہ جب تک عرفان واپس نہیں آئے گا اور اسے اس معاملے سے متعلق بات نہیں کریں گے تب تک انجلی حنا کے ساتھ اس کے گھر میں رہے گی۔

☆☆☆

دادی پن چکی سے پھر تھوڑا سا ستو نکال کر لائی اور اس میں مکھن ملانے لگی۔ ساتھ ہی سماوار میں پھونک بھی مارتی جا رہی تھی۔ نون چائے ابلنے لگی تو گرما گرم ابلتی چائے پیالوں میں انڈیل دی، پیالے عرفان اور بابا نصیر کے سامنے رکھ دیئے۔

''لے عرفان۔ میں نے تازہ ستو کے ساتھ مکھن ملا دی اور گرما گرم ابلی چائے بھی ڈال دی ہے۔''

''اوہو دادی، کتنی چائے پیوں گا۔ ماں کے ساتھ ایک پیالہ دو پیالے دادا اور آپ کے ساتھ۔ بس بہت ہو گیا۔

''ایک پیالہ اور پی لے میرے پتر۔ دیکھنا کتنے دنوں کی چائے تم نے ہمارے ساتھ پینی ہے''۔

''اور کیا پتر پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد تم گھر لوٹ آئے ہو۔ آج کتنا اچھا لگ رہا ہے کہ تم پھر سے ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے ہو۔ ہم تو تیری صورت کو ترستے رہے۔''

''دادد، یاد تو مجھے بھی بہت آ رہی تھی آپ لوگوں کی۔ لیکن جانا تو ضروری

تھا''۔

''ناپتر بالکل بھی ضروری نہیں تھا اور جس طرح سے تم گئے اس سے بھی ہمیں کتنی تکلیف ہوئی، تم کیا جانو۔ کتنے دن تو تیری دادی اور ماں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس روتی رہتی تھیں۔''

''ایسے کہہ رہا ہے جیسے تمہارا دادا دن میں تین تین بار کھانا کھاتے تھے۔ ارے دو دن تو ہم نے چولہا بھی نہیں جلایا۔ پھر جب پہلگام سے غلاما آیا اور اس نے بتایا کہ تم ان کے ساتھ ہو اور امرناتھ یاترا کے ساتھ جا رہے ہو تب ہم نے چولہا جلایا''۔

''بس دادا معاف کر دو۔ دادی میں جانتا ہوں میں نے بہت دکھ دیئے آپ لوگوں کو لیکن دادی مجھے خود بھی کچھ کرنا ہے۔ آخر دادا کب تک کام کرتا رہے گا۔''

''دیکھا میرا بیٹا کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اسے میری کتنی فکر ہو رہی ہے''۔

''فکر کیوں نہیں ہوگی۔ آخر خون ہے ہمارا۔''

''اچھا پتر اب تو سنا۔ یہ یاترا کیسی رہی ۔''

''اووو دادا بہت مزے دار۔ میں تو چاہتا ہوں یہ یاترا سال بھر رہے اور میں ہر مہینے جاتا رہوں۔ کیا لوگ ہیں، کیا مزے ہیں۔''

عرفان اپنے دادا دادی کو اپنی پہلی یاترا کے مزے دار قصے سنانے لگا۔ دادا دادی سن تو رہے تھے اور اس کی باتوں پر کھل کر ہنس بھی رہے تھے لیکن اندر سے وہ بہت پریشان تھے کہ وہ اسے انجلی کی بات کس طرح سے بتائیں۔۔۔

حنا انجلی کو گھر تو لے آئی تھی۔ لیکن وہ خود بھی پریشان تھی۔ ابھی تک گاؤں میں صرف ایک سارہ تھی جو عرفان اور اس کے درمیان کھڑی تھی اور وہ یہ تک نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ سارہ کو عرفان کی زندگی سے کیسے نکالے۔ اب یہ دوسری بلا آن پہنچی تھی۔

اب حال یہ تھا کہ ایک انار اور تین تین بیمار۔ حنا نے انجلی سے بات کر کے بھی دیکھ لیا تھا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ لڑکی بہت ضدی ہے اور عرفان کو چھین لینے کی اس میں چاہت اور لگن بھی بہت زیادہ ہے۔ انجلی ان کی طرح گاؤں کی شرمیلی لڑکی نہیں تھی بلکہ وہ ہر ایک کے سامنے دوٹوک بات کرتی تھی۔ وہ کسی بھی طرح عرفان سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھی۔

''میم صاحب، آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ عرفان کی شادی اس کے بچپن میں ہی سارہ سے طے ہو چکی ہے اور ویسے بھی سارہ اس کے ماما کی لڑکی ہے۔''

''شادی کی بات ہوئی ہے۔ ابھی شادی تو نہیں ہوئی نا۔''

''اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم یہاں زبان کو ہی سب کچھ مانتے ہیں۔''

''آپ مانتے ہیں نا۔ میں تو نہیں مانتی۔'' انجلی نے دوٹوک جواب دیا۔

''لیکن عرفان کا دادا نہیں مانے گا''۔

''وہ مانے یا نہ مانے، اسے کیا۔ مجھے عرفان کے دادا سے تھوڑی شادی کرنی ہے۔''

''ھاھاھاا۔۔۔'' حنا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ انجلی بھی مسکرائی۔

''دادا کو پٹانا پھر بھی آسان ہے لیکن دادی بہت تیز ہے۔ اس کے سامنے دادا کی بولتی بند ہو جاتی ہے'' حنا نے آنکھ مارتے کہا۔ پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگیں۔

عرفان گھر آ کے خوش تھا۔ لیکن اس کا دادا بابا نصیر، دادی جان دید اور ماں زلیخا بہت پریشان تھے۔ انہیں موقع بھی نہیں مل رہا تھا کہ وہ عرفان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیں۔ وہ سب اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے کو چپ رہنے کا مشورہ دیتے تھے اور کسی خاص موقعے کے انتظار میں تھے۔ یہ عرفان کے آنے کا پہلا ہی دن تھا اور وہ آج دن بھر سوتا رہا۔ شام تک دادا دادی کے ساتھ پن چکی پر بیٹھا رہا۔

ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔اس لئے بھی اسے لوگوں سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ ابھی اپنے ہم عمر دوستوں سے مل پایا تھا۔ بابا نصیر بھی جانتا تھا کہ اگر وہ اسے اکیلا چھوڑ دیں گے تو یہ اپنے دوستوں سے ملنے جائے گا اور ان سے جب اس کو یہ پتہ چلے گا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں گاؤں میں کوئی اور آ پہنچا ہے تو اس کی ساری خوشیاں ختم ہو جائیں گی ۔ کچھ لوگ بابا نصیر کی پن چکی پر آ بھی گئے ۔ کچھ تمبا کو پینے کے بہانے اور کچھ ستو، آٹا لینے کی غرض سے لیکن بابا نصیر کی موجودگی میں کسی نے بھی انجلی کے بارے میں بات نہیں کی بلکہ سبھی عرفان کی خیر وخیریت پوچھنے کے بعد چلے جاتے تھے۔ بابا نصیر نے فیصلہ کیا کہ کم از کم آج کی رات عرفان سکون سے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہے۔کھائے پیئے اور آرام کرے۔ بابا نصیر اور دادی نے اس کو ایک لمحے کے لئے بھی الگ نہیں چھوڑا۔ شام تک اسے اپنے پاس بٹھائے رکھا اور اندھیرا ہونے کے بعد اسے اپنے ساتھ سیدھا گھر لے آئے۔

صبح بنا کچھ کھائے پیئے اور کسی کو کچھ بتائے بغیر ہی عرفان گھر سے نکل گیا تھا۔ آج وہ پار والے جھرنے تک جانا چاہتا تھا۔ جہاں وہ ہر روز بھیڑ بکریاں لے کر جاتا تھا۔ جھرنے کے اس پار وہ بڑا پتھر اس کا دوست تھا جس پر بیٹھ کر وہ روز بانسری بجاتا تھا۔ بانسری والا جھولنا اس کے ساتھ تھا۔اس کا من کر رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے دوست پتھر کے ساتھ بیٹھ جائے اور کوئی میٹھی سی دھن چھیڑ دے جس سے اس کے باقی دوست بھی محظوظ ہو جائیں۔ جھرنے کے ساتھ ساتھ اور بڑے پتھر کے علاوہ اس کے کئی اور دوست بھی وہاں تھے جن کے لئے یہ بانسری بجاتا تھا۔ جیسے جھرنے کے کنارے پہ کھلے پھول، اونچے اونچے دیودار، پوش وَن وادی کی ہریالی اور اس کے وہ سارے دوست پرندے جو صبح سے شام تک پیڑوں پر چہچہاتے رہتے تھے۔ وہ آج بہت خوش تھا۔کوئی پہاڑی نغمہ گنگناتا اوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں سے اچھلتا کودتا جا رہا تھا۔

اچانک اس کی نظر جھرنے کے پاس دولڑکیوں پر پڑی۔ایک تو اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لی تھی، وہ حنا تھی۔لیکن دوسری لڑکی کون تھی؟ وہ پہچان میں نہیں آ رہی تھی کیونکہ دونوں لڑکیوں کا رخ دوسری طرف تھا اور دونوں حنا کے گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ جانے کیوں عرفان کو لگ رہا تھا کہ وہ دوسری لڑکی کو بھی جانتا ہے۔اس کے چلنے کا انداز اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔لیکن دماغ پر زور ڈالنے کے باوجود بھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔تب تک دونوں لڑکیاں حنا کے گھر کے اندر جا چکی تھیں۔عرفان نے کئی بار ذہن کو جھٹک دیا لیکن وہ لڑکی برابر اس کے ذہن و دل میں تلاطم برپا کئے ہوئے تھی۔عرفان یوں تو جھرنے کے پار جا رہا تھا لیکن اس کے قدم خود بخود حنا کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جیسے وہ کسی ڈور سے بندھا ہو۔وہ حنا کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ابھی وہ یہ فیصلہ بھی نہیں کر پا رہا تھا کہ گھر کے اندر جائے یا حنا کو باہر بلائے کہ ایک تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی ۔

''عرفاااان ۔۔۔۔۔''

اچانک اندر سے تیر کی طرح انجلی نکل آئی اور عرفان کے گلے لگ گئی۔وہ زور زور سے روئے جا رہی تھی اور عرفان کے سینے میں اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔انجلی کے پیچھے ہی حنا بھی نکل آئی تھی لیکن اس نے جب باہر کا منظر دیکھا تو وہ ساکت کھڑی ہوگئی۔جیسے اس کے پاؤں زمین کے ساتھ چپک گئے ہوں۔

''انجلی۔۔۔انجلی تم۔۔۔تم یہاں کیسے آ گئی۔'' عرفان بھی انجلی کو اپنے سینے کے ساتھ لگائے اس کی پیٹھ کو سہلا رہا تھا اور انجلی برابر اُسے چومتی جا رہی تھی۔ یہ منظر ابھی جاری تھا کہ گھروں کے دروازے کھلتے گئے اور لوگ باہر آتے گئے۔ایک طرف بابا نصیر، دادی جان دید اور اس کی ماں زلیخا بھی دوڑے دوڑے آ رہے تھے لیکن سب لوگ ہکا بکا تھے۔ساری بھیڑ کو جیسے سانپ سونگ گیا تھا۔اچانک بھیڑ کو چیرتے سارہ

آگے بڑھی۔انجلی کا بازو پکڑا، زور سے جھٹک دیا۔انجلی اس کی طرف مڑی تو سارہ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر جھڑ دیا۔

''سارررہ۔۔۔'' عرفان زور سے چلایا ۔اور اوپر تک ہاتھ بھی اٹھایا۔

''نہیں عرفان ۔۔۔'' انجلی نے سارہ کو ایک طرف کرلیا اور عرفان کے سامنے خود آ گئی ۔عرفان کا اٹھایا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا لیکن اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں اور وہ سارہ کو گھور رہا تھا۔سارہ نے جب عرفان کا یہ رخ دیکھا تو اس نے منہ چھپایا اور روتے روتے گھر کی طرف بھاگ گئی ۔سبھی لوگ ہکا بکا ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔اسی وقت گھر سے عرفان کا ماما حفیظ خان نکل آیا اور عرفان پر چلّایا۔

''عرفان خان ۔میری بیٹی پر ہاتھ اٹھایا۔ٹھہر میں تمہیں یہیں زمین میں گاڑ دوں گا۔''اس کا ماما حفیظ خان غصے میں آگے بڑھ رہا تھا۔

''رک جاؤ حفیظ خان ۔کیا تم نہیں جانتے کس کو مارنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہو۔ان بوڑھی ہڈیوں میں ابھی دم ہے۔تجھ جیسے دو چار کو ڈھیر کر دوں گا یہیں پر۔''

بابا نصیر بھی آگے بڑھ آیا اور عرفان کو اپنے پیچھے کر کے سینہ تانے حفیظ خان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''آپ ہٹ جاؤ دادو۔دیکھتا ہوں یہ کیا کر لے گا۔''

''نہیں ،نہیں عرفان ان سب کو روک لو۔میں نہیں چاہتی میری وجہ سے یہاں خون خرابہ ہو۔سب کو روک لو۔۔۔روک لو سب کو عرفان ۔۔۔روک لو''۔

انجلی زار و قطار رو رہی تھی۔

''میں یہاں صرف آپ کو دیکھنے آئی ہوں ۔آپ لوگوں کو آپس میں لڑانے کے لئے نہیں آئی ہوں ۔بس یہ لڑائی بند کر دو۔میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

بھیڑ سے حنا نکل کے آئی اور اس نے انجلی کو گلے لگایا جو پھوٹ پھوٹ کر رو

رہی تھی۔ حنا حیران تھی آج صبح تک جولڑکی اسے بڑی بہادر لگ رہی تھی لیکن اندر سے وہ اتنی کمزور، معصوم اور بے دست پا ہوگی، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اس لڑکی کی ضرور مدد کرے گی جو غیروں میں پھنس چکی تھی۔

''بابا نصیر۔۔۔سن لو۔۔۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں سارے گاؤں کے سامنے عرفان خان اور اپنی بیٹی کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت سے میرا تیرے گھر کے ساتھ کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں ہے۔''

حفیظ خان رک چکا تھا اور نفرت سے بابا نصیر کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''حفیظ۔۔۔ میرے بھائی۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بہن بھائی کا رشتہ کیسے ختم ہوسکتا ہے۔'' زلیخا روتے روتے بھائی کی طرف جانے لگی۔

''رک جا زلیخا۔۔۔ میرے گھر کی طرف مت آنا۔ آج سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ تم اور تیرا بیٹا میرے لئے مر چکے ہو۔''

''حفیظ خان۔۔۔ خاموش ۔۔۔ بس خاموش رہو۔۔۔ تمہیں میرے بارے میں جتنا کہنا ہے کہو۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ لیکن میں اپنے بیٹے کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سنوں گی۔ تمیں رشتہ توڑنا ہے تو سن لے مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے، بس میرا بیٹا ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔'' زلیخا کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

''اور سن ۔۔۔ تم نے اچھا کیا جو خود ہی اپنی بیٹی کا رشتہ توڑ دیا۔ جب سے یہ لڑکی یہاں آئی ہے میں واقعی بہت پریشان ہوگئی تھی اور وہ پریشانی مجھے تیری بیٹی کے لئے ہی تھی۔ آج تم نے مجھے اس بڑی پریشانی سے آزاد کر دیا۔۔۔ اور ہاں میں اس رشتے سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ رشتہ میرے باپ سے بڑھ کر میرے سسر نے طے کیا تھا۔ ایک طرف عرفان جیسے میرے دس بیٹے بھی ہوتے نا، تو بابا کی زبان

کے سامنے میں ان دس کو بھی قربان کرتی لیکن آج تم نے مجھے آزاد کر دیا ہے''۔

بابا نصیر کا سر اور اونچا ہو گیا اور وہ فخر سے اپنی بہو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دادی کے چہرے پر بھی بشاشت نظر آ رہی تھی۔ زلیخا پھر بولی

'' حفیظ خان ۔۔۔تم نے یہ رشتہ توڑ کر مجھ پر اور میرے بیٹے پر احسان کیا ہے۔ جا آج تم نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماردی ہے۔'' زلیخا کا سارا غصہ، ساری پریشانیاں ختم ہو گئی تھیں اور اس کے چہرے پر اب سکون ہی سکون تھا۔

'' آجا بیٹی ۔۔۔چل۔ گھر چلتے ہیں۔'' زلیخا نے انجلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر بڑے جوش کے ساتھ اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔ جان دید بھی دوسری طرف آ گئی اور انجلی کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ انجلی دونوں کے گلے لگ گئی اور اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بابا نصیر نے اپنے بازو عرفان کے گلے میں ڈال دیئے اور دونوں گھر کی جانب جانے لگے۔ آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی اور صرف حنا کھڑی رہ گئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ آج ساری دنیا میں وہ اکیلی ہو گئی تھی۔ وہ دوڑ کے گھر کے اندر گئی اور زور زور سے رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھی لیکن اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

عرفان اور انجلی کی یہ خوشیاں بہت ہی مختصر رہی۔ بڑی مشکل سے انہیں تنہا ملنے کا وقت ملا تھا۔ اس میں بھی عرفان انجلی کو جھرنے کے اس پار لے گیا جہاں اس کے دوست پرندے رہتے تھے۔ وہ ابھی گھر سے نکلے ہی تھے کہ آٹھ ناڈین کا چوکیدار آنگن میں پہنچ گیا۔ یہاں کے لوگوں کے لئے اس کی غراتی آواز سو ظالم حاکموں کے برابر مانی جاتی تھی۔ بابا نصیر اس کی آواز دور سے ہی پہچانتا تھا لیکن آج اس کی آواز بہت زیادہ قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ چوکیدار اپنے ساتھ بہت

بڑا طوفان لے کے آیا ہوگا۔ اسے اب عرفان کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ چوکیدار کی دوسری آواز سے پہلے ہی بابا نصیر آنگن میں نکل چکا تھا۔

''کیوں بے بابا نصیر۔ میری آواز تیرے کانوں تک دیر سے پہنچی کیا۔

''نہیں حضور پہلی ہی آواز پہ باہر آ گیا ہوں۔ حکم سرکار'' بابا نصیر ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور اس کی نظریں جھکی تھی۔ اس کی طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ چوکیدار سے آنکھیں ملا پاتا۔ ابھی اس نے چوکیدار کے ساتھ آئے دو تین پولیس والوں کو دیکھا نہیں تھا۔

''پولیس آئی ہے میرے ساتھ۔ سنا ہے تیرے پوتے نے بڑا ہاتھ مارا ہے۔''

''حضور وہ تو امرناتھ یاترا میں گیا تھا۔ آج ہی لوٹ کر آیا ہے۔''

''اے بوڑھے کہاں ہے تیرا لونڈا۔ اس نے ممبئی کی لڑکی کا اغوا کر لیا ہے۔ ہمیں تیرے گھر کی تلاشی لینی ہے اور تیرے پوتے ۔۔۔ ہاں کیا نام ہے تیرے پوتے کا۔'' ایک پولیس والے نے رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

''عرفان ۔۔۔ سرکار''

''ہاں عرفان۔ کہاں ہے وہ۔ اس نے لڑکی کا اغوا کیا ہے۔''

''لیکن حضور عرفان تو یہاں تھا ہی نہیں۔''

''تو لڑکی ابھی تک یہاں نہیں پہنچی ہے کیا؟۔''

تب تک اندر سے جان دیدا اور زلیخا بھی باہر آ گئی تھیں اور وہ پریشان ہو کے پولیس اور چوکیدار کو دیکھ رہی تھیں۔

''پہنچی ہے حضور ۔۔۔ لیکن خود آئی ہے۔ اس میں عرفان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔''

''اووو ۔۔۔ سر مل گئی ۔۔۔ لڑکی مل گئی ۔۔۔'' پولیس والے نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا جن میں ایک حوالدار اور دوسرا اے۔ ایس۔ آئی تھا۔ ان

میں ایک کے کندھے پر سٹار اور دوسرے کے بازو پر فیتیاں لگی تھیں۔''

''بوڑھے لڑکی کو جلدی لے آؤ۔''

''حضور وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے بوڑھے۔کہاں چھپا رکھا ہے لڑکی کو۔''

''حضور چھپا کر نہیں رکھا ہے۔وہ عرفان کے ساتھ جھرنے کے اس پار گئی ہے۔''

''ارے ے ے۔۔۔یہاں تک پہنچتے پہنچتے برا حال ہو گیا ہے۔پورے دو گھنٹے لگے ہیں۔اب یہ جھرنے کے اس پار کونسی جگہ ہے۔'' پولیس والا پریشان ہو کر بولا۔

''حضور زیادہ دور نہیں ہے۔یہاں آئیں۔'' وہ پولیس والوں کو آنگن سے باہر لے کر آیا۔تب تک پورا گاؤں جمع ہو چکا تھا۔ہر ایک کے چہرے پر تشویش تھی۔

''حضور وووہ جھرنا ہے۔بس اس کے پار گئے ہیں۔''

''ارے توبہ۔اتنا دور۔ہم یہاں سے نہیں ملنے والے۔ان دونوں کو یہاں لے آؤ۔۔۔اے سنو۔'' لوگوں کی طرف اشارہ کر کے۔

''تم میں سے جلدی کوئی ۔۔۔ ہے سنو ۔۔۔'' ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

''تم کسی کو بھی ساتھ لے لو۔ان دونوں کو یہاں پکڑ کر لے آؤ اور سنو اگر وہ بھاگ گئے تو ہم پورے گاؤں کو نہیں چھوڑیں گے۔۔۔جاؤ جلدی جاؤ۔''

دونو جوان جانے لگے تو چوکیدار چلایا۔

''ٹھہرو۔۔۔میں بھی آتا ہوں تم لوگوں کے ساتھ۔۔۔''

''تم کہاں جا رہے ہو چوکیدار۔انہیں جانے دو۔تم ہمارے ساتھ رہو۔''

''ان پر بھروسہ نہیں ہے مجھے۔ یہ خود بھی بھاگ جائیں گے اور ان کو بھی بھگائیں گے۔''

''نہیں حضور۔ یہاں کوئی بے ایمان نہیں ہے۔ یہ ان دونوں کو لے کر آئیں گے۔'' بابا نصیر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''ان کو جانے دے چوکیدار۔ ویسے بھی صبح سے بھوکے ہیں۔ اس پر اتنا لمبا سفر۔'' پولیس والے نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے کہا۔

''حضور اگر اجازت دیں تو میں کچھ چائے روٹی کا انتظام کروں۔'' بابا نصیر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''اے تو چپ ہی رہ بوڑھے۔ تم ملزم ہو۔ ملزموں کی طرح ہی رہو۔'' چوکیدار نے رعب جمایا۔

''چوکیدار۔ کیوں بے چارے کو ڈرا رہے ہو۔ رعب یہ رعب جھاڑ رہے ہو۔ بے چارہ چائے روٹی کے لئے پوچھ رہا ہے اور تم اسے ذلیل کر رہے ہو۔ بزرگ انسان ہے۔ بزرگوں کی عزت کرنی چاہئے'' حوالدار نے چوکیدار کو آنکھیں دکھائیں تو وہ بغلیں بجانے لگے۔

''حضور آپ ان بے ایمانوں کو نہیں جانتے۔ یہ۔۔۔۔۔''

''چپ۔۔۔ کرو چپ۔'' اے۔ ایس۔ آئی نے چوکیدار کی بات کاٹ کر اسے جھڑک دیا۔

''چاچا۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم بھی تو انسان ہیں۔ ہاں اگر آپ کا دل کر رہا ہے تو چائے پلاؤ لیکن کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہم اپنی ڈیوٹی کر رہے ہیں۔''

حوالدار ابھی بول ہی رہا تھا کہ اندر سے زلیخا اور دادی چائے کا سماوار اور روٹیاں لے کر آ گئیں۔

''اووو چاچی ۔۔۔آپ خود چائے لے کر آ گئی۔شکریہ شکریہ۔۔۔'' دیکھا چوکیدار۔ ہمارے کہنے سے پہلے ہی یہ چاچی چائے لے کر آ گئی ہے۔اورتم ان کو بات بات پر ڈرا رہے ہو۔''

''حضور والا۔ یہ چوکیدار تو مالک ہے۔ حاکم ہے ہمارا۔ہم سب اس کے غلام۔ یہ کچھ بھی کہے،ہم برا نہیں مانتے۔''

''یہ۔۔۔ یہ چوکیدار حاکم ہے یہاں کا؟؟؟'' پولیس والے نے حیران ہوکر پوچھ لیا۔

''اور کیا، یہ گاؤں والے چوکیدار کو ہی اپنا حاکم سمجھتے ہیں۔اس دور دراز علاقے میں آتا کون ہے۔بس یہی چوکیدار آتے ہیں۔ یہاں کے سارے فیصلے یہی کرتے ہیں'' اے۔ایس۔آئی نے اپنے پولیس والوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

جب تک پولیس والوں نے پیٹ بھر کر روٹیاں کھائیں، کئی کئی پیالیاں چائے بھی پی۔تب تک عرفان اور انجلی آنگن میں پہنچ چکے تھے۔

''لیجئے صاحب ملزم آ گیا۔اور مال بھی برآمد ہوگیا۔'' چوکیدار نے عرفان اور لڑکی کو دیکھ کر کہا۔تو پولیس والے نے اس کو پھر سے آنکھیں دکھائیں۔

''کیا بات ہے آفیسر۔آپ یہاں کیسے۔'' انجلی نے آتے ہی اے ۔ایس۔آئی سے پوچھا۔

''کیا آپ ہی ممبئی والی لڑکی انجلی ہو۔''پولیس والے نے کاغذ دیکھ کر کہا۔

''جی ہاں۔میں ہی انجلی ہوں۔''انجلی نے جواب دیا۔

''بات یہ ہے کہ ہم آپ کی تلاش میں ہی یہاں تک آئے ہیں۔ ہمارے پاس رپورٹ ہے کہ یہاں اس گاؤں کے عرفان نامی شخص نے آپ کو کڈنیپ کر کے یہاں بند رکھا ہے۔''

''ھاھاھا۔کیسا مذاق ہے یہ۔سنئے آفیسر مجھے کسی نے اغوانہیں کیااور میں خودچل کر یہاں آئی ہوں۔''انجلی نے دوٹوک جواب دیا۔

''کچھ بھی ہو۔کیس کے مطابق ہم نے آپ کو یہاں اس آدمی یعنی عرفان کے ساتھ دیکھا ہے۔اس لئے اس کے خلاف کیس تو بنتا ہے''اے۔ایس۔آئی نے کہا ''تھانیدار صاحب۔تھوڑا تھوڑا قانون میں بھی جانتی ہوں۔آپ میری تلاش میں یہاں آئے ہیں تو میں آپ کومل گئی۔آپ مجھے لے کر چلئے،باقی سب وہیں دیکھ لیتے ہیں۔''

''لیکن ہمیں عرفان کوبھی گرفتار کر کے لے جانا ہے۔''تھانے دار نے کہا۔

''لیکن میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے کسی نے اغوانہیں کیا۔میں یہاں تک خود پہنچی ہوں۔ان لوگوں نے مجھے گھر میں جگہ دی،مجھے کھانا دیااورسب سے بڑی بات ایک لڑکی کوعزت دی۔اس کا صلہ میں ان کو یہ دوں کیا کہ ان کو ہی پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروالوں؟۔یہ توانیائے ہوگا آفیسر۔

''کچھ بھی ہوانجلی صاحبہ۔ہمیں عرفان کوبھی اپنے ساتھ لے جانا پڑے گا'' اے۔ایس۔آئی نے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا۔

''دیکھئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''بس انجلی۔آپ نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی۔میں ساتھ چل رہا ہوں۔ویسے بھی میں آپ کو یہاں سے اکیلےنہیں جانے دیتا۔''عرفان نے انجلی کی بات کاٹ کرکہا۔

''ایک بات حضور۔آپ یہاں سےصرف عرفان اوراس لڑکی کوہی گرفتار نہیں کر رہے ہیں۔ہم سارے گاؤں والے آپ کے پیچھے پیچھے تھانے پہنچ رہے ہیں۔کیوں بھائیو'' بابانصیر نے گاؤں والوں کی طرف دیکھ کرکہا۔

''ہاں ہاں۔ہم سب ساتھ جارہے ہیں۔''لوگوں نے ایک آواز میں کہا۔

''رکیئے تھانے دار صاحب۔''حفیظ خان بڑے طیش میں گھر سے نکل آیا۔

''اتنا خیال رکھیئے گا کہ پچھلے سال کی طرح عرفان کو نہ مارا پیٹا جائے۔آج ہم سارا گاؤں تھانے کے باہر بیٹھے رہیں گے۔اگر عرفان کی ایک آہ بھی ہم نے سنی تو ہم سارا پہلگام بند کردیں گے۔ہمارا دھرنا تب تک جاری رہے گا جب تک ہم عرفان کو اپنے ساتھ گاؤں واپس نہیں لائیں گے۔''حفیظ خان عرفان کے گلے لگ کر بات کررہا تھا۔پھر وہ بابا نصیر کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے بولا۔

''بابا نصیر پوش وَن گاؤں ہمیشہ آپ کے ساتھ تھا اور آج بھی ہم سب لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔آپ کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے رہیں گے۔۔۔

''کیوں دوستو۔''

''ضرورررر۔''اس کے بعد عرفان اور انجلی پولیس کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے اور پوش وَن گاؤں کے سارے مرد لوگ ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

☆☆☆

پہلگام پولیس سٹیشن میں انجلی کا باپ اور اس کی ماں پہنچ چکے تھے ۔ وہ ایس۔ایچ۔او کے آفس میں بیٹھے تھے اور سٹیشن آفیسر وہاں نہیں تھا۔ جب پولیس والے عرفان اور انجلی کو پولیس سٹیشن لے کر پہنچ گئے تو وہ سیدھے ایس۔ایچ۔او کے آفس میں آگئے۔ان کو دیکھتے ہی انجلی کے ماں باپ ایک دم کھڑے ہوگئے۔اس کی ماں نے عرفان کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا اور اس کا باپ عرفان کو مارنے کے لئے آگے بڑھ آیا تھا۔عرفان کے ساتھ جو اے۔ایس۔آئی آیا تھا وہ بیچ میں آگیا۔

''پاپا۔۔۔آپ ایسا نہیں کرسکتے ہیں۔اور ہاں ماں عرفان کا کوئی قصور نہیں ہے''۔

''مسٹر اپنا ہاتھ روکئے۔ یہ پولیس اسٹیشن ہے یہاں آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔''

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میری عزت مٹی میں ملا دی''۔

''میں نے کہا نا آپ ایسی کوئی بھی حرکت نہیں کریں گے جس سے یہاں کا امن وامان خراب ہو جائے۔ یہاں لا اینڈ آڈر کا مسئلہ بن سکتا ہے۔ اس لئے آپ شانت رہیں گے۔'' اسی وقت ایس۔ ایچ۔ او کمرے میں آ جاتا ہے۔

''کیسا رہا عارف۔ ملزم کو لے آئے کیا۔'' ایس۔ ایچ۔ او نے اپنے تھانے دار (اے۔ ایس۔ آئی) سے کہا۔

یس سر۔۔۔ سر آپ سے ایک منٹ بات کرنی ہے۔ ان کو باہر نکالئے یا ہم آپ کے روم میں چلتے ہیں''۔ اے۔ ایس۔ آئی نے سٹیشن آفیسر سے کہا۔

''اوہ۔۔۔ کوئی نہیں، چلو ہم دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔''

''عرفان۔۔۔ آپ اور لڑکی باہر آ جاؤ'' حوالدار نے عرفان سے کہا۔

''انجلی اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ یہ ہمارے پاس رہے گی۔'' انجلی کی ماں نے کہا۔

''ابھی نہیں۔۔۔۔۔ ابھی یہ دونوں ہماری کسٹیڈی میں ہیں۔'' پولیس آفیسر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ عرفان اور انجلی بھی باہر چلے گئے۔

دوسرے کمرے میں اے۔ ایس۔ آئی عارف نے ایس۔ ایچ۔ او کو سارے حالات بتا دیئے۔ عرفان کی بے گناہی بھی بتا دی اور کھڑکی سے باہر کا منظر بھی دکھایا، جہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہو رہی تھی اور وہ سب تھانے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ایس۔ ایچ۔ او کو بہت غصہ آیا۔

''حوالدار یہ لوگ یہاں کیسے آئے۔ کیا پولیس کو ڈرانے آ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو لوگوں کو اندر بلاؤ۔ پہلے میں ان کو ہی دیکھ لیتا ہوں۔''

''بہتر سر۔۔۔'' حوالدار باہر چلا جاتا ہے۔ باہر آ کر ان لوگوں کو کچھ سمجھاتا ہے۔ واپس آتے بابا نصیر اور حفیظ خان اس کے ساتھ اندر آ جاتے ہیں۔

''یہ کیا تماشہ لگایا ہے آپ لوگوں نے۔ کیا پولیس اسٹیشن پر حملہ کرنے آئے ہو۔'' حفیظ خان کچھ کہنے کے لئے جوں ہی منہ کھولتا ہے، بابا نصیر بات کرنے سے اسے روکتا ہے اور خود بات کرتا ہے۔

''نہیں حضور۔ ہم ایسی کوئی گستاخی نہیں کریں گے۔ بس حضور کو یہ بتانے آئے ہیں کہ یہ بچے بے قصور ہیں۔ آپ سرکار ہماری بھی عرض داشت سنیں۔''

''ہم سب کی سنیں گے لیکن اس طرح سے لوگوں کو جمع کر کے پولیس سٹیشن لانا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ سب لوگ اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اگر تمہارا بیٹا بے گناہ ہوگا تو اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ ''

''میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں سرکار'' حفیظ خان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''یہ بچہ پچھلے سال بھی بے گناہ ہی پھنسایا گیا تھا۔ اس کو اتنا زدکوب کیا گیا تھا کہ بے چارہ چھ ماہ بستر پر پڑا رہا۔ ہم جانتے ہیں ہم غریب لوگوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر آج بھی اس بچے کو بے گناہی کی سزا دی گئی تو ہم یہیں پہلگام میں جان دے دیں گے۔''

'' اے ے ے دھمکی دے رہا ہے۔ کون ہے یہ ایرا غیرا نتھو خیرا۔ حوالدار بند کر دو اس کو۔'' پولیس آفیسر کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

'' سر بے چاروں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ دیہاتی ہیں، مزدور لوگ ہیں۔ واقعی میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی ہے۔ یہ امیدیں لے کر ہمارے پاس آتے ہیں۔'' اے۔ ایس۔ آئی نے ان کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ پولیس آفیسر ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتا ہے۔

''ٹھیک ہے،ٹھیک ہے۔ان کو یہاں سے باہر نکال دو اور چلو لڑکی کا سٹیٹمنٹ لیتے ہیں۔ان کے بیٹے کی خیر اب اسی لڑکی کے ہاتھوں میں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے پولیس آفیسر کمرے سے نکل گیا۔

''چاچا۔۔۔آپ لوگ اطمینان رکھو۔میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کا بیٹا بری ہو جائے۔آپ لوگ تھانے سے باہر جاؤ اور سنو،کوئی ہنگامہ نہ کرنا۔چلو آپ لوگ اور باقی لوگوں کو بھی پولیس سٹیشن سے باہر لے جاؤ۔''

بابا نصیر اور حفیظ خان کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔پولیس پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔انہوں نے عرفان کو لاک اَپ میں بند کر دیا۔انجلی کو اپنے ماں باپ کے حوالے کرنا چاہا تو اس نے ہنگامہ کر دیا۔وہ کسی بھی قیمت پر عرفان کو لاک اَپ سے باہر لانا چاہتی تھی۔جب باہر کھڑے پوش وَن گاؤں والوں کو پتہ چلا کہ پولیس نے بے گناہ عرفان کو لاک اَپ میں بند کر دیا گیا تو انہوں نے پولیس سٹیشن کے باہر ہنگامہ کیا۔آس پاس کے لوگ جو پہلگام میں کام کے لئے آتے رہتے ہیں،وہ بھی ان کے ساتھ مل گئے۔دیکھتے ہی دیکھتے کئی نیوز کارسپانڈنٹ بھی پہنچ گئے۔پولیس کو بہت زیادہ تشویش ہوگئی۔انہوں نے ہائیر اتھارٹیز سے بات کی تو انہیں ہدایت مل گئی کہ عرفان کو وہاں سے شفٹ کر دیا جائے۔عرفان کو شفٹ کرنے کے لئے نکالا گیا تو نیوز والوں کو کوریج کرنے میں آسانی ہوئی۔انہوں نے عرفان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے اس کی اجازت نہیں دی۔پولیس نے بھی اپنا گول مول سٹیٹمنٹ دے دیا لیکن انجلی نے تفصیل کے ساتھ کئی نیوز کارسپانڈنٹس سے بات کی۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی پرس کانفرنس میں بول رہی ہو۔

☆☆☆

اِدھر مسٹر راؤ کی فیملی کو کشمیر کے ساتھ عشق ہو گیا تھا اور یہاں کے لوگوں سے

وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ لوگ جب سے امرناتھ یاترا کر کے واپس گھر پہنچے تھے تب سے وہ لگاتار کشمیر کے حالات کے بارے میں جان کاری رکھنے لگے تھے۔ وہ روز کشمیر نیوز دیکھتے تھے۔ آج بھی جب شام کو یہ لوگ گھر میں بیٹھے نیوز دیکھ رہے تھے تو پہلگام کی خاص رپورٹ نے ان کی توجہ ٹی۔ وی کی طرف مبذول کرادی۔ پھر جب انہوں نے عرفان اور اس کے ساتھ ہو رہی زیادتی دیکھی تو وہ سب بے قرار ہو گئے۔ گھر کی عورتوں نے تو رو رو کر اپنا برا حال کر دیا تھا۔ خاص کر ان کی پوتی کیرتی جس کو عرفان نے یاترا کے دوران بچالیا تھا، وہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مسٹر راؤ بھی کچھ کم پریشان نہیں ہوئے تھے۔ اس کا بڑا بیٹا جوائی۔ پی۔ ایس آفیسر تھا اور اس کے کئی دوست کشمیر میں تعینات تھے، اس نے سب سے پہلے بیٹے کو فون لگایا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ بیٹے سے کہا کہ کشمیر میں اپنے دوستوں کا اثر رسوخ لڑائے اور عرفان کے متعلق پوری جان کاری حاصل کرے۔ پھر مسٹر راؤ کو یاد آیا کہ اس کا بیچ میٹ آئی۔ اے۔ ایس کرم جیت تو آج کل کشمیر انتظامیہ میں بڑے عہدہ پر تعینات ہے، اس کو فون کر کے عرفان کے بارے میں بتادیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ میں خود بھی کل صبح تک سرینگر پہنچ رہا ہوں۔ یہ ساری فیملی پوری رات وہ سارے ٹی وی چینل دیکھ رہے تھے جن سے ان کو عرفان کی خبر آنے کی امید تھی۔ وہ لگاتار فون بھی کر رہے تھے۔ گھر والوں کو تب تک چین نہیں آیا جب تک مسٹر راؤ کو کشمیر سے یہ اطلاع نہیں ملی کہ عرفان محفوظ ہے اور اب اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس دوران یہ سب لوگ رات کا کھانا بھی بھول گئے تھے۔

دوسری صبح مسٹر راؤ اور اس کی پوتی کیرتی سرینگر آئرپورٹ پہنچ گئے تھے۔ یہاں اس کے آئی۔ اے۔ ایس دوست مسٹر کرم جیت نے اس کے لئے سارے انتظامات کر رکھے تھے۔ اس کے لئے سرکاری گاڑی بھیج دی تھی۔ عرفان کے معاملے

کی تحقیقات پر جو آفیسر رات کو ہی تعینات کر دیا گیا تھا، اس کو مسٹر راؤ کے ساتھ ہی اٹیچ رکھا گیا تھا اور اسے ہدایت دی گئی تھی کہ وہ مسٹر راؤ کے ساتھ پورا تعاون کرے۔ اس کے رکنے اور کھانے پینے تک کا سارا انتظام اپنی نگرانی میں کرائے۔ انچارج آفیسر نے بڑے عزت واحترام کے ساتھ مسٹر راؤ کو سرکاری رہایش گاہ تک پہنچا دیا۔

''ویلکم۔۔۔ویلکم۔۔۔یار ایسی بھی کیا پڑی تھی کہ آپ نے بنگال سے کشمیر تک سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ دہلی سے بھی لگا تار یار دوستوں کے فون آ رہے ہیں''

''کرم جیت آپ کو پتہ نہیں یہ لڑکا ہمارے لئے کیا ہے۔ اب دیکھو نا کیرتی بھی میرے ساتھ آ گئی ہے۔ اس نے کل شام سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ اپنا بُرا حال بنا رکھا ہے۔ وہ باہر ہی کھڑی رہی اور جلد سے جلد پہلگام جا کر عرفان سے ملنا چاہتی ہے۔ میرے سارے گھر والے بھی دو دو منٹ کے بعد فون کر رہے ہیں۔ یہ دیکھئے پھر سے فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔۔۔۔ہاں ہیلو۔۔۔ارے میں کرم جیت کے پاس ہی بیٹھا ہوں۔ ہاں سب ٹھیک ہے۔ بس ہم یہاں سے پہلگام ہی جا رہے ہیں۔۔۔نہیں نہیں اب کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

''راؤ ڈیئر تم نے خوامخواہ ہی اتنی لمبی دوڑ لگا دی ہے۔ یہ سارا معاملہ میں سن چکا ہوں۔ یہ کوئی ممبئی کا بزنس مین ہے اور کافی سیاسی اثر رسوخ رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے پچھلے سال یہ لڑکا جیل بھی جا چکا ہے۔ لیکن پولیس تحقیق کے مطابق لڑکا بے قصور ہے اور وہ لڑکی خود یہاں آئی ہے اور خود جا کر اس کے گھر میں بیٹھ گئی ہے''۔

''عرفان تو گھر میں تھا ہی نہیں۔ بے چارہ غریب گھر کا بچہ ہے۔ امرناتھ جانے والوں کا سامان اٹھاتا ہے۔ مزدوری کرتا ہے اور یہ ممبئی کا آدمی اسے دہشت گرد بتا رہا ہے''

''ارے بابا میں سب جانتا ہوں۔ پہلگام کا علاقہ پُر امن ہے۔ جہاں ایسا

کوئی معاملہ نہیں ہے۔ان لوگوں کی وجہ سے امرناتھ یاترا ہوتی ہے جواُن کے سپورٹ کے بغیر ناممکن ہے۔''

''وہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ لوگ تو امرناتھ یاترا کو جانے والے لوگوں کی کتنی خدمت کرتے ہیں۔ان کے لئے اپنی جان تک داؤ پر لگاتے ہیں۔کیرتی کی زندگی اسی عرفان کی خیرات ہے۔۔۔اچھا،اب میرے لئے کیا حکم ہے''۔

''ارے راؤ کیسی باتیں کررہے ہو۔میں حکم دوں گا تم کو۔۔۔؟؟؟عرفان کو تو کل رات کو ہی چھوڑ دیا ہوتا۔وہ تو تم نے بتایا کہ یہاں آرہے ہو۔اس لئے میں نے اس کا ریلیز رُکوا دیا۔میں جانتا ہوں کہ تم کتنے ضدی ہو۔تم اس لڑکے سے ملے بنا مانو گے نہیں۔لیکن اگر اس کو کل ہی چھوڑ دیتا تو وہ اپنے گاؤں واپس چلا گیا ہوتا اور تمہارا وہاں تک جانا بہت مشکل تھا۔وہ لاک اَپ میں بند نہیں ہے۔پہلگام کے ایس۔ڈی۔ایم کی ریذیڈنس پر ہے۔۔۔لیکن پہلے تم سب لوگ ناشتہ کرو پھر تم کو پہلگام بھجوا دوں گا۔''

''نہیں کرم جیت۔بس تھینکس۔اب ہم عرفان کو دیکھ کر ہی ناشتہ کریں گے۔میں چلتا ہوں۔''

''پہلگام میں تمہارے لئے پورا انتظام کیا ہوا ہے۔ یہ مسٹر سجاد احمد کے۔اے۔ایس آفیسر ہے۔ہمارا قابل آفیسر ہے۔آپ کے ساتھ جائے گا۔عرفان کا سارا معاملہ یہی دیکھ رہا ہے۔''

''شکریہ سر۔'' آفیسر نے کھڑا ہو کر مسٹر کرم جیت کا شکریہ ادا کیا۔

''تھینکس آفیسر'' مسٹر راؤ نے آفیسر سجاد احمد کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

''مائی پلیجر سر۔''

''تھینکس ڈئیر۔آپ کی بھرپور مدد کے لئے۔'' مسٹر راؤ سے ہاتھ ملاتا ہے۔

''جانے دے یار۔اتنا تو کر ہی سکتا ہوں نا۔بس وہ لڑکی کا تھوڑا سا معاملہ ہے۔ وہ اپنا سجاد احمد اور پہلگام کا ایس۔ڈی۔ایم دیکھ لیں گے۔لڑکی کو ماں باپ کے حوالے کیا تھا لیکن وہ ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہو رہی۔پہلگام میں ہی کسی ہوٹل میں ٹھہری ہے۔''

''پھر تو مسئلہ ابھی بھی حل کہاں ہوا'' مسٹر راؤ کے چہرے پر پھر سے تشویش کی لہریں اٹھنے لگیں۔

ارے ے ے۔۔۔ یہ لڑکی بالغ ہے۔اگر ماں باپ کے ساتھ نہیں جاتی ہے تو ہم کیا زبردستی کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ ایسا کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔آدھی دنیا کی لڑکیاں یہاں کشمیر گھومنے آتی ہیں اور یہیں کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔اگر آپ کے پاس ٹائم ہے تو پہلگام میں لمبی گھڑ سواری کے لئے کسی بوڑھے مرکبان کو ہائر کولو۔وہ آپ کو پہلگام کے کئی گل وبلبلوں کی لوسٹوریاں سنائے گا۔''

''ھاھاھا'' مسٹر راؤ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''یس ٹرائی کرلو ۔۔۔۔۔۔۔ اچھا،تم بے فکر ہو کر جاؤ۔یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔تمہارا مسئلہ وہ لڑکا ہے۔وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

''او۔کے بائی۔''

مسٹر راؤ اور کے۔اے۔ایس آفیسر سجاد احمد آفس سے باہر آ جاتے ہیں۔

☆☆☆

کل رات پہلگام میں رات گئے بڑا ہنگامہ ہو سکتا تھا۔معاملے کی چانچ کے لئے ایس۔ڈی۔ایم کو اوپر سے ہدایات مل گئی تھیں۔اس نے بابا نصیر اور گاؤں والوں

سے بات کی۔صبح تک امن سے رہنے کی اپیل کی۔ان کے یقین کے لئے ایس۔ ایچ۔او سے عرفان کو واپس بلوایا۔عرفان کو اپنے گاؤں کے لوگوں سے ملوا دیا۔انجلی بھی عرفان کو دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔عرفان کو لاک اَپ میں نہیں بلکہ ایس۔ڈی۔ایم کی سرکاری رہائش گاہ پر رکھا گیا تھا۔ ایس۔ڈی۔ایم نے انجلی کو بتایا کہ عرفان کے بارے میں اوپر سے ہدایات ملی ہیں۔اب اسے لاک اَپ میں نہیں رکھا جائے گا بلکہ وہ صبح تک ان کی سرکاری رہائش گاہ پر رہے گا۔انجلی کے ساتھ ساتھ گاؤں والے بھی حیران ہورہے تھے۔۔۔عرفان کی پہلگام واپسی پر انجلی کے ماں باپ بھی حیران و پریشان ہوگئے۔

گاؤں کے لوگ صبح سے ہی ایس۔ڈی۔ایم کی سرکاری رہائش گاہ کے باہر جمع ہورہے تھے۔انجلی بھی پہنچ چکی تھی اوراس کے ماں باپ بھی آئے ہوئے تھے۔ہرایک کے چہرے پر تناؤ تھا۔تھوڑی دیر میں وہاں پولیس ایس۔ایچ۔او کے ساتھ کچھ آفیسرس بھی پہنچ گئے تھے۔سارے آفیسرس اندر چلے گئے تھے۔لوگ باہر بیٹھے انتظار کررہے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔اس دوران انجلی کوشش کررہی تھی کہ اس کا اپنے ماں باپ سے سامنا نہ ہوجائے۔اس لئے وہ ان سے دور دور ہی رہ رہی تھی۔ سب لوگوں کی نظریں پہلگام کے ایس۔ڈی۔ایم کی ریذیڈنسی کے مین گیٹ پر لگی ہوئی تھیں کہ آگے پیچھے دو تین گاڑیاں ایس۔ڈی۔ایم ریذیڈنس کے لان میں رک گئیں۔اندر سے سارے پولیس آفیسرس اور ایس۔ڈی۔ایم باہر آگئے۔گاڑیوں کے دروازے کھل گئے۔کچھ سرکاری آفیسر نیچے اتر گئے۔پولیس نے سیلوٹ دیا۔ ایس۔ڈی۔ایم نے مصافحہ کیا۔آخری گاڑی سے مسٹر راؤ اور اس کی پوتی کیرتی اترے۔جب پوش وَن کے ان مزدوروں نے مسٹر راؤ اوراس کی پوتی کو دیکھا جن کے ساتھ یہ لوگ امرناتھ یاترا میں گئے تھے تو ان کے چہروں پر خوشیاں لوٹ آئی۔۔۔

''سلام صاحب۔۔۔سلام کیرتی بیٹی۔''

''سلام۔۔۔سلام۔کیسے ہو آپ لوگ'' مسٹر راؤ نے مزدوروں کو پہچان لیا۔

''ہائے غلاما چاچا۔عرفان کہاں ہے'' کیرتی نے ایک مزدور کو پہچان کر نام سے بلایا۔

''بیٹی ہم نے کل سے اس کو نہیں دیکھا۔افسر لوگ کہتے ہیں اندر ہے۔''

''آپ لوگ آرام سے بیٹھو۔میں آ گیا نا'' سبھی لوگ مشکور نگاہوں سے مسٹر راؤ کو دیکھ رہے تھے اور وہ اندر کی طرف چلا گیا۔انجلی کے ماں باپ اسے دیکھ کر ناک بھویں چڑا رہے تھے۔انجلی اور بابا نصیر غلاما کو اشارے سے بلا رہے تھے۔سبھی گاؤں والے ایک طرف گئے اور غلاما ان کو بتا رہا تھا کہ کس طرح سے یاترا میں اپنی جان پر کھیل کر عرفان نے اس لڑکی کو بچا لیا تھا اور ساتھ ہی جب یہ بتا دیا کہ یہ کوئی بڑا آفیسر ہے عرفان کے لئے ہی بنگال سے یہاں آیا ہے تو سبھی کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا اور انجلی کو عرفان پر ڈھیر سارا پیار آ رہا تھا۔

سارے آفیسرس مسٹر راؤ کے انتظار میں کھڑے تھے۔

''سر۔آپ آئیں پلیز۔۔۔آفیسرس یہ مسٹر راؤ آئی۔اے۔ایس ہیں۔بنگال سے اس لڑکے عرفان کے لئے یہاں آئے ہیں۔پہلے آپ ان کو اس لڑکے سے ملائے۔'' سجاد احمد نے مسٹر راؤ کا تعارف یہاں کے آفیسرس کے ساتھ کرایا۔

''ویلکم سر۔آپ آئیں پلیز۔عرفان کل سے یہیں میری ریڈنس پر ہی ہے۔آئیں سر'' ایس۔ڈی۔ایم نے کہا تو سارے آفیسرس مسٹر راؤ اور اس کی چھوٹی پوتی کیرتی کو ساتھ لے کر اندر کی طرف گئے۔اندر پہنچتے ہی انہوں نے دیکھا کہ عرفان کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا ہے۔کیرتی نے عرفان کو

دیکھتے ہی چیخ ماری۔

''عرفان بھیا۔'' وہ دوڑ کے گئی اور عرفان کے گلے لگ گئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سارے آفیسرس یہ منظر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر مسٹر راؤ بھی آگے بڑھے۔ پوتی کے سر پر ہاتھ رکھا اور عرفان کو گلے لگایا۔

''عرفان۔ اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں آ گیا ہوں۔''

سر آپ تشریف رکھئے۔ عرفان آپ بھی بیٹھ جاؤ۔'' آفیسر نے مسٹر راؤ سے کہا۔ سبھی لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب کے لئے چائے آ گئی تھی۔ عرفان کو بھی چائے دے دی گئی۔

''ہاں یہ میری پوتی ہے کیرتی۔ آج سے کچھ ہی دن پہلے ہم یہاں امرناتھ جی یاترا کرنے کے لئے آئے تھے اور میرے ساتھ میری پوری فیملی تھی۔ ماں اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں کے لوگوں نے اسے پالکی میں بٹھایا۔ اپنے کاندھوں پر لے کر اسے امرناتھ جی کی یاترا کرائی۔ یہ کیرتی ہے میری پوتی، ایک جگہ کیرتی کا پیر پھسل گیا اور یہ نیچے گر گئی جہاں سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس لڑکے عرفان نے اپنی جان پر کھیلا اور میری پوتی کو بچالیا۔ میرے ایک بیٹے نے اس مومنٹ کا ویڈیو بنایا ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں تو رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ جو اپنی جان پر کھیل کر لاکھوں لوگوں کو امرناتھ جیسے متبرک استھاپن کی یاترا کراتے ہیں اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ یاترا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اتنے اچھے انسان ہیں کہ اپنی ساری انسانیت لاکھوں یاتریوں پر نچھاور کرتے ہیں اور میڈیا پر ان کی چرچا ایک منفی انداز میں کی جاتی ہے۔ مجھے کل کی خبریں سن کر بہت دکھ ہوا اور افسوس بھی۔ میں اور میرے سارے گھر والے ان لوگوں کے برتاؤ سے اتنے خوش ہوئے ہیں کہ میں کیا کہوں۔ ہم جب سے واپس گھر گئے ہیں تب سے ہر شام کشمیر سے

متعلق خبریں سنتے ہیں۔کل شام بھی اتفاق سے ہم کشمیر نیوز دیکھ رہے تھے کہ عرفان کو دیکھا۔کل شام سے ابھی تک ہم سب لوگوں نے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔''

''ہمیں افسوس ہے سر۔آپ عرفان کو لے جاسکتے ہیں۔لیکن سر ہم نے آپ کے لئے ہلکے سے ناشتے کا انتظام کر رکھا ہے۔ناشتہ تو کیا سر،اب تو کھانا کھانے کا ٹائم ہے، لنچ ٹائم بھی ہوگیا ہے سر۔پہلے ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔پھر جائیں گے آپ۔

''نہیں آفیسر بہت شکریہ۔کھانا تو ہم اب عرفان کے ساتھ ہی کھائیں گے۔''

''ہم نے تو سب کے لئے کھانا رکھا ہے سر۔۔۔اور ویسے بھی آپ کے رہنے اور کھانے پینے کے لئے ہم کو اوپر سے ہی ہدایت ملی ہیں۔''

''ارے ے ے۔۔۔بڑا عجیب ہے یہ کرم جیت بھی۔'' مسٹر راؤ مسکرا کر کہہ دیتا ہے۔

''تو چلیں سر کھانا کھاتے ہیں۔'' لیکن اسی وقت انجلی کے ماں باپ اندر آجاتے ہیں اور اس کا باپ غصے میں چلّا تا ہے۔

''یہ ہے یہاں کی ایڈمنسٹریشن، یہ ہے یہاں کی پولیس، کمال ہے۔ایک مجرم کو کرسی پر بٹھایا جاتا ہے اور اسے چائے بھی پلائی جارہی ہے۔واہ۔یہ ہے کشمیر اور یہاں کی ایڈمنسٹریشن۔''

'' یہ آدمی کون ہے'' سجاد احمد نے اسے گھور کر دیکھا اور ایس۔ڈی۔ایم سے پوچھا۔

''یہ اس ممبئی والی لڑکی کے ماں باپ ہیں، سر''

''اچھا۔۔۔مسٹر آپ اپنی بیٹی کو گھر لے جاسکتے ہیں'' سجاد احمد کا لہجہ تیکھا تھا۔

''اور یہ مجرم، جس کو آپ نے کرسی پر بٹھا رکھا ہے۔'' عرفان ایک دم کھڑا ہوجاتا ہے۔

''مسٹر ہوش سے بات کرو۔ہم نے آپ کی بیٹی کا بیان لکھا ہے۔اس کا کسی نے اغوا نہیں کیا ہے اور اگر کیا بھی ہے تو اس میں عرفان قطعی ملوث نہیں ہے۔ویسے بھی لڑکی کا بیان ہے کہ وہ یہاں خود آئی ہے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

''میں اپنی بیٹی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔اس مجرم کا آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے''۔

'' اے مسٹر۔۔۔خاموش رہئے۔آپ بار بار ایک شریف لڑکے کو مجرم کہہ رہے ہیں۔آپ کیا سمجھتے ہیں ہم یہاں اتنے گئے گزرے بیٹھے ہیں کہ آپ کے کہنے پر کسی کو بھی مجرم مان لیں۔آپ جائیں اور اپنی بیٹی کو ساتھ لے جائیں۔''

''وہ تو میرے لئے مر چکی ہے۔میں اسے ہرگز بھی ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔''اسی وقت انجلی اندر آجاتی ہے۔

''میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہی ہوں۔میں نے یہیں عرفان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔''انجلی نے دوٹوک جواب دیا۔

''مر جاؤ یہیں۔ہم واپس جا رہے ہیں اور آفیسر،آپ لوگوں کو بھی دیکھ لوں گا میں۔''

سجاد احمد کو غصہ آجاتا ہے اور وہ کچھ کہنا چاہتا ہے کہ مسٹر راؤ اسے روکتا ہے۔ وہ انجلی کے باپ کے قریب جا کر کہتے ہیں۔

''مسٹر۔۔۔سوری مجھے آپ کا نام نہیں پتہ۔۔۔''انجلی کا باپ خاموش لیکن غصے میں مسٹر راؤ کو دیکھتا ہے۔

''ہاں میں کہہ رہا تھا۔جب بچے خوش ہیں تو ماں باپ کو بھی بچوں کی خوشیوں میں اپنی خوشی تلاش کرنی چاہئیے۔''

''مجھے کوئی خوشی وشی نہیں ہے اور آپ مجھے نصیحت کرنے یا سمجھانے کی

کوشش نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔''

''میں آپ کو نصیحت نہیں کر رہا ہوں بلکہ آپ کو بتا رہا ہوں۔آپ دونوں اس لڑکی کے ماتا پتا ہو۔اب یہاں کشمیر آ ہی چکے ہو تو خوشی خوشی سے اپنی بیٹی کا کنیا دان کر لو اور دونوں کو اپنا آشیر واد دے دو۔'' سب لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل جاتی ہے اور انجلی کا باپ زیادہ غصہ ہو جاتا ہے۔

''اپنی بکواس بند کریئے۔آشرواد۔۔۔ہنہ''۔اپنی بیوی کی طرف۔

''چلو یہاں سے۔میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا۔''

''آپ واپس جا کر کیسے دیکھ لیں گے۔۔۔یہاں رک جائے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔۔۔ویسے آپ فکر نا کریں۔یہ میری بھی بیٹی ہے۔ میں اس کا کنیا دان خود کر دوں گا۔'' مسٹر راؤ مصافحے کے لئے ہاتھ نکالتے ہیں مگر انجلی کے ماں باپ پیر پٹک کر کمرے سے نکل جاتے ہیں۔سب لوگ ہنستے ہیں۔

''اچھا آفیسرس۔میں بچوں کو لے کر جا رہا ہوں۔''

''نہیں سر۔۔۔کھانا لگ چکا ہے۔ویسے بھی اب خوشی کا موقع ہے۔اس کے لئے کشمیری واز وان کی دعوت تو بنتی ہے اور ہم نے سبھی لوگوں کے لئے انتظام کر دیا ہے۔عرفان کے سارے براتیوں کے سمیت۔۔۔مطلب اس کے گاؤں والوں کے لئے بھی۔'' سجاد احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''باراتی۔۔۔ھاھاھا!!!۔۔۔اچھی بات کہی ہے آفیسر۔ہاں اب کشمیری واز وان کی دعوت تو بنتی ہے۔چلو انجلی بیٹی۔آؤ عرفان چلیں۔''

''تو آئیں سر۔۔۔'' ایس۔ڈی۔ایم اور باقی آفیسرس بھی چلنے لگتے ہیں۔ کیرتی ایک ہاتھ میں عرفان کا ہاتھ اور دوسرے ہاتھ میں انجلی کا ہاتھ لے لیتی ہے

اور دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھتی ہے۔ انجلی اور عرفان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھل اٹھتی ہے اور دونوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے ہیں۔۔!!

●●●

''شیرازہ اردو''

کی بعض اہم خصوصی اشاعتیں

- سمپوزیم نمبر
- پنڈت جواہر لال نہرو نمبر
- مورخ حسن نمبر
- منشی پریم چند نمبر
- غالب نمبر
- شیخ العالم نمبر
- شاہ ہمدان نمبر
- صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر
- غلام محمد صادق نمبر
- نوجوان نمبر
- فخر کشمیر نمبر
- عبدالاحد آزاد نمبر
- غلام رسول نازکی نمبر
- میکش نمبر
- عمر مجید نمبر
- ثقافت نمبر
- محی الدین قادری زورؔ نمبر
- محمد الدین فوق نمبر
- ڈاکٹر سر محمد اقبال نمبر
- عجائبات نمبر
- لل دید نمبر
- سمینار نمبر
- شیر کشمیر نمبر
- افسانہ نمبر
- شاعر کشمیر مہجور نمبر
- مغل اور کشمیر نمبر
- حامدی کاشمیری نمبر
- غلام رسول سنتوش نمبر
- عرش صہبائی نمبر
- بخشی غلام محمد نمبر

- شمیم احمد شمیم نمبر
- پشکر ناتھ نمبر
- محمد یاسین بیگ نمبر
- جموں وکشمیر، لداخ نمبر (۱۱ جلدیں
- حکیم منظور نمبر
- تاجران کتب نمبر
- ظہور الدین نمبر
- رفیق راز نمبر
- غلام نبی خیال نمبر
- محمد یوسف ٹینگ نمبر
- فرید پربتی نمبر
- عبدالرحمان مخلص نمبر
- پی۔این۔کے بامزئی نمبر
- ترنم ریاض نمبر
- نور شاہ نمبر
- سفرنامہ نمبر (۲ جلدیں)
- عبدالغنی شیخ نمبر
- رحمان راہی نمبر

●●●

سالنامہ ''ہمارا ادب''

کی بعض خصوصی اشاعتیں

☆.....لوک ادب نمبر

☆.....مشاہیر کشمیر نمبر (۲ جلدیں)

☆.....شیرازہ انتخاب نمبر

☆.....جموں وکشمیر، لداخ نمبر (۱۱ جلدیں)

☆.....شخصیات نمبر (۵ جلدیں)

☆.....اولیاء نمبر (۵ جلدیں)

☆.....ڈوڈہ نمبر

☆.....مولانا رومی نمبر

☆.....ہمعصر تھیٹر نمبر

☆.....فیض احمد فیض نمبر

☆.....سعادت حسن منٹو نمبر

☆.....کرشن چندر نمبر

☆.....تنقید نمبر

☆.....فن افسانہ نگاری نمبر (۲ جلدیں)

☆.....فن ترجمہ نگاری نمبر

☆.....فن نظم نگاری نمبر (۲ جلدیں)

●●●

کلچرل اکادمی کی بعض اہم اردو مطبوعات

☆..... انوار ابوالکام.....مرتب:علی جواد زیدی

☆.....کشمیری زبان اور شاعری (۳ جلدیں) مرتب:عبدالاحد آزاد

☆..... دیوان میر .....مرتبہ:پروفیسر اکبر حیدری

☆.....چنار رنگ .....مرتبین:غلام نبی خیال، بشیر اختر

☆..... لل دید .....مرتبین:پروفیسر جیالال کول، نند لال طالب

☆.....خیابانِ کشمیر..... مرتبہ:غلام نبی خیالؔ

☆.....تفسیر غالبؔ ..... پروفیسر گیان چند جین

☆..... تذکرۂ شاعرات اردو ..... پروفیسر اکبر حیدری

☆..... اکادمی مخطوطات .....مرتبہ:مولوی محمد ابرہیم

☆..... ڈوگری لوک ادب اور پہاڑی آرٹ..... مترجم:لکشمی نارائن

☆.....برج نور.....ادارہ

☆.....انتخاب اردو ادب.....مرتبہ:نور شاہ

☆.....جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء.....ٹھاکر پونچھی

☆.....کشمیر میں عربی ادب کی تاریخ.....فاروق بخاری

☆.....کشمیر میں اردو (۳ جلدیں) .....پروفیسر عبدالقادر سروری

☆.....نئی حسیت اور عصری شاعری .....پروفیسر حامدی کاشمیری

☆.....نکات رقعات غالب .....اکبر علی خان

☆.....پربت اور پنگھٹ (۲ جلدیں).....مرتبہ: محمد یوسف ٹینگ

☆.....ریشات.....مرتبہ: پروفیسر اسداللہ وانی

☆.....سازکی لے تیز کرو (۲ جلدیں) .....ادارہ

☆.....اردو کشمیری فرہنگ (۱۲ جلدیں) .....ادارہ

☆.....جموں وکشمیر کے اردو مصنفین .....جان محمد آزاد

☆.....کلام اقبال: نادر رسالوں کے تناظر میں .....پروفیسر اکبر حیدری

☆.....نیل مت پران .....مترجم: ارجن دیو مجبور

☆.....کلام مہجور (اردو ترجمہ) .....سلطان الحق شہیدی

☆.....اقبال: احباب و آثار .....پروفیسر اکبر حیدری

☆.....عشرت کشتواڑی (مونوگراف)..... فدا کشتوڑی

☆.....جموں کی تمدن تاریخ .....کے۔ڈی مینی

☆.....کشمیر: فوک لور کے آئینے میں .....غلام نبی آتش

☆.....کشمیر کی قدیم ذاتیں .....ڈاکٹر آفاق عزیز

☆.....غلام نبی گورگارنی (مونوگراف) .....منشور بانہالی

☆.....کلام انتخاب سید رضا .....مرتب: ڈاکٹر سید شبیب رضوی

☆.....مشاہیر کے نام خطوط، حامدی کاشمیری کے نام .....ادارہ

●●●